معاشی

تاریخ ہند

جلد دوم

سلسلۂ نصابیات علمیہ جامعۂ عثمانیہ

معاشی تاریخ ہند

جلد دوم

عہد ملکۂ وکٹوریہ

ملکۂ وکٹوریہ کی تخت نشینی (۱۸۳۷ء عیسوی) سے بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک

تالیف

رامیش دت، سی۔ آئی۔ ای

ترجمہ

محمد نصیر الدین خاں، ایم۔ اے (ایڈنبرا)

۱۳۵۵ھ ۱۳۴۵ف ۱۹۳۶ع

در مطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن طبع شد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

آج سے ، سال پہلے لندن میں ایک جشن منایا گیا تھا جس میں برطانوی شاہنشاہی کے اتحاد کی گویا جیتی جاگتی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھرتی تھیں۔ ملکہ کے عہد کی شصت سالہ جوبلی میں شرکت کی غرض سے برطانوی نوآبادیات اور عملداریوں کے لوگ آ آکر ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ ہندوستان کے والیان ریاست وفاکیش اہل کناڈا اور جفاکش اہل آسٹریلیا کے شانہ بشانہ استادہ تھے۔ اظہار مسرت کے اس موقع پر سب لوگوں میں ایسا جوش و خروش پھیلا ہوا تھا کہ ان جزائر کے باشندوں نے اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا نہ سنا۔ اس عالم گیر شاہنشاہی کا اتحاد جن زمانہ دراز کے جرأت آزما مہمات، سنگین معرکوں اور دانشمندانہ مصالحت کی بناء پر مستحکم ہوا تھا ان تاریخی واقعات کی یاد اصحاب غور و فکر کے دلوں میں اس جشن سے تازہ ہوتی تھی مختلف ارض و بلاد میں بسی ہوئی قومیں باہم ملکر موقع کے شایان جشن منانے میں شریک تھیں۔

لیکن ایک دردناک خیال لوگوں کے دماغوں کو پریشان کر رہا تھا۔ شاہنشاہی کے تمام اقطاع میں جہاں ترقی اور خوش حالی کے آثار نمایاں تھے ہندوستان اکیلا تھا جہاں افلاس و مصائب کا منظر پیش نظر تھا۔ ۱۸۹۶ء عیسوی میں ایک ایسے شدید

عالم گیر قحط سے جیسا اس سے پہلے کبھی نہیں پڑا تھا ملک تباہ و تاراج ہو گیا تھا۔ اس طرح شاہنشاہی کا آباد ترین حصہ ہی شاہنشاہی کی خوش حالی میں شریک نہ تھا۔ انگلستان کی اس سب سے بڑی عملداری ہی میں انگلستان کے پرچم کے نیچے دولت کی فراوانی، صنعت و حرفت کی ترقی اور زراعت کا نشو و نما کہیں نہیں ہوا تھا۔

۱۸۹۷ء عیسوی تک یہ قحط باقی رہا۔ ۱۸۹۹ء عیسوی میں کچھ سکون ہوا نہ تھا کہ سنہ ۱۹۰۰ء عیسوی میں پھر قحط رونما ہوا جس سے پہلے سے بھی زیادہ رقبہ متاثر ہوا اور جس کا اثر بھی پہلے سے زیادہ مدت تک باقی رہا۔ یہ بلائے مہیب تین سال تک نہ ٹلی اور لاکھوں آدمی اس سے ہلاک ہوئے۔ ہزارہا لوگ ابھی امدادی قیام گاہوں ہی میں پناہ گزیں تھے اور اپنے اپنے گھروں کو واپس نہ ہوئے تھے کہ جنوری سنہ ۱۹۰۳ء عیسوی میں دہلی دربار منعقد کیا گیا۔

ہندوستان اور شاہنشاہی کے دیگر اقطاع کے درمیان جو معاشی خلیج حائل ہے وہ چند سال سے اور زیادہ عریض ہو گئی ہے۔ کینیڈا اور دیگر نوآبادیات میں وہاں کی آبادی کے لحاظ سے سالانہ آمدنی فی کس (۴۰) پونڈ اور برطانیہ عظمیٰ میں فی کس (۴۲) پونڈ ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں خود سرکار نے اس کا تخمینہ فی کس (۲) پونڈ کیا ہے۔ "برطانوی انجمن" کے گزشتہ جلسے میں ایک بہت بڑے مستند برطانوی ماہر فن معاشیات مسمی سر رابرٹ گفن نے بیان کیا تھا کہ یہ صورت حال برطانوی شاہنشاہی میں ایک نہایت ہی سخت اور دائمی مشکل ہے جس پر رہنمایان قوم کو ابھی قدر زیادہ توجہ مبذول کرنا چاہئے جس قدر زیادہ شاہنشاہی اتحاد کا خیال عملی قوت پیدا کر رہا ہے۔" شاہنشاہی کی ۵/۶ آبادی کے روز افزوں افلاس و انحطاط کی بنیاد پر شاہنشاہی اتحاد کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

اگرچہ قحط بلحاظ اموات بجائے خود ہولناک ہے لیکن یہ اس سے بھی شدید تر خرابی کا پتا دیتا ہے یعنی ہندوستان کی آبادی کا دائمی افلاس جو ہر سال بے قحط سالی کے بھی موجود ہے۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان میں اجناس کی مقدار کبھی کم نہیں ہوئی چنانچہ ۱۸۹۷ء عیسوی اور سنہ ۱۹۰۰ء عیسوی میں بھی اجناس کی مقدار ہندوستان کی جملہ آبادی کی قوت بسری کے لئے کافی تھی۔ لیکن لوگ ایسے نادار اور بے وسیلہ ہیں اور ان کے

پاس اس قدر بھی پس انداز نہیں کہ جب ایک خاص رقبے میں فصل خراب ہو تو وہ قریب کے صوبجات سے جہاں اناج کثیر مقدار میں پیدا ہوئی ہو اپنے لئے اشیائے خوردنی خرید سکیں۔ امساک باراں سے اگرچہ بعض مقامات میں فصلیں برباد ہو جاتی ہیں لیکن شدید قحط تو لوگوں کے افلاس ہی کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔

ہندوستان کے منتظمین مملکت کو ایسے متعدد واقعات معلوم ہیں جو مثال کے طور پر اس مذکور الصدر دعوے کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ میں یہاں صرف ایک واقعے کے اظہار پر قناعت کرتا ہوں۔ تناعیش سال قبل مشرقی بنگال میں ایک شدید قحط پڑا تھا۔ ۱۸۷۶ء عیسوی میں ایک ایسی آندھی اور طوفان آیا کہ اس ملک کا ایک بہت بڑا خطہ غرقاب ہو گیا، کاشتکاروں کے مکان گر گئے اور فصلیں تلف ہو گئیں۔ مقامی نظم ونسق کی از سر نو تنظیم اور ان خطوں میں جو قحط سے زیادہ متاثر تھے لوگوں کی امداد کی غرض سے مناسب انتظام کرنے کے لئے میں ایک نوجوان عہدہ دار کی حیثیت سے وہاں بھیجا گیا تھا۔ ان اقطاع میں کسان بہت معمولی لگان ادا کرتے تھے اور اسی بنا پر مامون زمانے میں وہ خوش حال رہتے تھے۔ ان کسانوں نے دور اندیشی اور کفایت شعاری سے جو ہندوستان کے کاشتکاروں کا خاصہ ہے سالہائے ماسبق میں کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیا تھا۔ اب ان لوگوں نے اس مصیبت کے زمانے میں بھی اپنے ہی پس انداز سے چاول سے لدے ہوئے جہاز کے جہاز خرید لئے وہاں قحط کا اثر نہ عام طور پر پھیلا اور نہ وسیع پیمانہ پر امدادی کاموں کے آغاز کی ضرورت ہوئی۔ ان کسانوں کو خوش حال و ذی مقدرت اور خود امداد دیکھکر مجھ کو بڑی خوشی ہوئی۔ اگر عام طور پر ہندوستان کے تمام کاشتکار ایسے خوش حال ہوتے جیسے مشرقی بنگال کے کسان تھے تو پھر ہندوستان میں خرابی فصل کے باوجود قحط نادر الوقوع ہو جاتا۔ لیکن بمقابل مشرقی بنگال کے مغربی بنگال میں پیداوار کے تناسب کے لحاظ سے لگان زیادہ ہے اور بنگالے کے مقابل مدراس اور بمبئی میں نیز ملک کے دیگر اقطاع میں محصول اراضی بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے وہاں کے باشندے بھی مقابلتہً کم مقدور ہیں، وہاں قحط بھی زیادہ پڑتے ہیں اور نسبتہً زیادہ مہلک ثابت ہوتے رہیں۔ اس کے علاوہ رعایا کا افلاس قحط کی شدت میں اور

اضافہ کر دیتا ہے۔

قومی تموّل کے ذرائع زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور صحیح مالیاتی نظم و نسق ہی ہے۔ برطانوی حکمرانی نے ہندوستان میں امن تو قائم کیا لیکن قومی تموّل کے ان ذرائع کو نہ ترقی دی اور نہ اُن میں وسعت ہی پیدا کی۔

تجارت اور صنعت کے متعلق مجھ کو یہاں کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے۔ میں نے اپنی دوسری کتابت میں جس کا نام "ابتدائی برطانوی حکومت ہند" ہے ہندوستان کے متعلق برطانیۂ عظمیٰ کی تجارتی حکمت عملی کا جو اٹھارہویں صدی عیسوی اور انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں رہی ہے خاکہ کھینچا ہے۔ یہ حکمت عملی وہی تھی جس کو برطانیہ عظمیٰ نے اسی زمانہ میں آئرلینڈ اور اپنی نوآبادیات کے متعلق بھی اختیار کیا تھا۔ ہندوستانی مصنوعات کو موقوف کرنے اور برطانوی مصنوعات کو فروغ دینے کی جو انتھک کوششیں کی گئیں وہ ہندوستان کی حد تک مہلک طور پر کامیاب ہوئیں۔ امتناعی محصولات سے ہندوستانی مال کی یورپ میں درآمد موقوف کردی گئی اور برطانوی مال پر برائے نام محصول لگا کر ہندوستان میں اُس کی برآمد میں اضافہ کرنے کی ہر تدبیر اختیار کی گئی۔ انگلستان کی اس ابتدائی تجارتی حکمت عملی کے دو مقصد تھے: ایک برطانوی حرفت کے لئے ہندوستان میں خام اشیاء کی پیداوار میں اضافہ کرنا۔ دوسرے، ہندوستان میں برطانوی مصنوعات کو رواج دینا۔ مؤرخ ہارسین ہیمین ولسن کے الفاظ میں، "برطانوی صناعوں نے ایسے حریف تجارت کو جس سے وہ مساوی شرائط پر جیت ہی نہیں سکتے تھے مغلوب کرنے اور آخر کار اُس کا گلا گھونٹ دینے میں سیاسی ناانصافی کے زور بازو سے کام لیا۔"

۱۸۳۷ء عیسوی میں جب ملکہ وکٹوریہ تخت نشین ہوئیں اس وقت بڑی حد تک تخریب ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود اس حکمت عملی میں جس پر پہلے سے عمل کیا جارہا تھا کبھی سستی نہیں کی گئی۔ چونکہ اس زمانے میں بھی ہندوستانی ریشمی رومال یورپ میں برابر فروخت ہوتے تھے اس لئے ہندوستانی ریشمینوں پر سنگین محصول علی حالہٖ قائم تھا۔ پارلیمنٹ نے یہ تو دریافت کیا کہ برطانوی کارگاہوں کے لئے ہندوستان میں روئی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے لیکن یہ دریافت نہ کیا کہ ہندوستانی

کارگاہوں کی ترقی واصلاح کس طرح ممکن ہے۔ متعدد مجالس منتخبہ نے یہ معلوم کرنے کی پے درپے کوشش کی کہ برطانوی مصنوعات کو ہندوستان میں کس طرح رواج دیا جاسکتا ہے لیکن یہ معلوم کرنے کی زحمت نہ کی کہ ہندوستانی مصنوعات میں کیونکر پھر سے جان ڈالی جاسکتی ہے۔ ۱۸۵۸ء عیسوی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی ختم ہونے سے بہت پہلے ہی ہندوستان کوئی بڑا صنعت گر ملک نہ رہا تھا اس وقت قوم کے لئے بسراوقات کا ذریعہ ایک زراعت ہی رہ گئی تھی۔

۱۸۵۸ء کے بعد بھی ہندوستان کا نزخنامۂ محصول برطانوی تاجروں ہی کی زیرنگرانی واثر تھا۔ محصول درآمد میں تخفیف کردی گئی تھی جس سے ہندوستان میں برطانوی مال درآمد کرنے میں بڑی سہولت پیدا ہوگئی تھی۔ بمبئی کی کارگاہوں اور کارخانوں کی ترقی پر حاسدانہ نظریں پڑ رہی تھیں۔ ۱۸۷۹ء میں جس وقت کہ ہندوستان کے سر پر قحط، جنگ وجدل اور کمیٔ محاصل کے باعث آفتیں نازل ہورہی تھیں پارلیمنٹ نے محصولات درآمد کی قربانی کا مطالبہ کیا اور ۱۸۸۲ء میں بہ استثناء محصول نمک وشراب جملہ محصولات درآمد کو یک لخت موقوف کردیا گیا۔

ان قربانیوں کا مضر اثر ہندوستان کے محاصل پر بھی پڑا۔ کاشتکاروں پر جدید محصول لگانے اور زراعت پر اس طرح ایک سنگین بار ڈالنے کے باوجود ہندوستان اپنا خرچ آپ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں سابقہ محصولات درآمد خفیف ترمیم کے بعد پھر عائد کردیئے گئے۔ سوتی مال نیز سوت اور سوتی دھاگے کی ہندوستان میں درآمد پر (۵) فی صدی محصول لگا دیا گیا اور اس کے ساتھ توازن قایم کرنے کے لئے ایسے ہندوستانی سوتی کپڑوں پر جن کا مال درآمد کے ساتھ تجارتی مقابلہ تھا (۵) فی صدی محصول عائد کردیا گیا۔ ۱۸۹۶ء میں سوت اور سوتی دھاگے کو محصول سے مستثنیٰ کردیا گیا لیکن ہندوستان میں سوتی مال کی درآمد پر ۳½ فی صدی محصول اور ہندوستانی گرنیوں کے بنے ہوئے سب قسم کے مال پر ۳½ فی صدی محصول چنگی لگا دیا گیا۔ موٹے کپڑوں پر جن کا لینکیشر کے مال کے ساتھ کچھ مقابلہ نہ تھا اور مہین پارچوں پر بھی محصول عائد کردیا گیا۔ شکستہ حال ہندوستانی مزدور کے معمولی لباس پر بھی (جس کی روزانہ آمدنی ڈھائی پنس سے بھی کم نہ ہے)، بدگمان حکومت نے

محصول لگا دیا۔ بمبئی کی نوخاستہ گرنیوں کی حرفت کو امداد و تقویت دینے کے عوض اُس پر بھی محصول چنگی لگایا گیا جیسا دنیا کے کسی اور متمدن حصے میں کہیں نہیں پایا جاتا ہے اور اس طرح محصول لگا کر اس حرفت کو سرے سے میٹ دیا گیا۔ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں کی تجارتی حکمت عملی کی تشکیل ہندوستانی صناعوں کے مفاد پر نہیں بلکہ برطانوی صناعوں کے اغراض پر مبنی رہی ہے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں جو پرتگالی، ڈچ، عرب اور برطانوی تجار ہندوستانی مصنوعات کثیر مقدار میں برآمد کرتے تھے اب وہ بات کہاں رہی تھی آج کل ہندوستان کی برآمد صرف خام پیداوار رہ گئی ہے اور وہ بھی زیادہ تر لوگوں کے اشیائے خوردنی پر مشتمل ہے۔ قومی آمدنی کے ذرائع کی حیثیت سے صنعت وحرفت کا میدان تنگ ہوگیا ہے۔

اب ایک رہی سہی زراعت ہی ہے۔ برطانوی حکمرانی کے تحت ملک میں امن قائم ہوا اور جان و مال کی حفاظت بھی ہوتی ہے جس سے کاشت میں بہت کچھ توسیع ہوگئی ہے۔ لیکن جو شخص کاشتکاروں کی اندرونی زندگی سے واقف ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ توسیع کاشت سے رعایا بھی زیادہ خوش حال، بڑی ذی مقدرت اور قحط کے اثرات سے زیادہ محفوظ ہوگئی ہے۔

ہندوستان کے نظم ونسق کی تاریخ گہری دلچسپی رکھتی ہے کیونکہ اس کا ایک زرعی قوم کی مادّی فلاح وبہبود سے بڑا قریب کا تعلق ہے۔ برطانوی حکمرانی کے ابتدائی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کو ایک بڑی جاگیر یا نخلستان تصور کرتی تھی اور مامون زمانے میں بھی کاشتکاروں اور مالکان اراضی کے لئے بقدر قوتِ لایموت کے کچھ چھوڑ کر اراضی کی تمام باقی پیداوار کا اپنے آپ ہی کو مستحق سمجھتی تھی۔ جب یہ حکمت عملی محاصل کے نقطۂ نظر سے کمپنی کے حق میں مضر ثابت ہوئی تو اُس وقت اس میں اصلاح ضروری خیال کی گئی۔ پھر کمپنی نے بھی یہ تسلیم کرلیا کہ زمینداروں کے طبقے کو یہ یقین دلانا کہ آیندہ زراعت کا متوقعہ منافع اُنھیں کو ملے گا بڑی دانشمندی کی بات ہے۔ اسی بناء پر ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے بنگال میں مالگزاری کا دوامی بندوبست کردیا جس میں اگرچہ زمینداروں سے اُن کی آمدنی

مالگزاری کے (۹۰) فی صدی کا مطالبہ کیا گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کو اُس کا بھی یقین دلایا گیا کہ آیندہ اس مطالبے میں کوئی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کا مطالبہ مذکورالصدر تناسب کے لحاظ سے بے حد سنگین تھا لیکن ۱۷۹۳ء سے کاشت اور آمدنی مالگزاری میں بہت کچھ اضافہ ہوا تھا جس سے کسان اور زمیندار دونوں مستفید ہوئے تھے۔ حالیہ زمانے میں بنگال کے زراعت پیشہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے کاشتکاروں کی بہ نسبت قحط وغیرہ کے بدترین اثرات سے زیادہ محفوظ ہیں۔

اسی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمت عملی میں تغیّر ہوا۔ کمپنی کو اب دوسرے صوبوں میں دوامی بندوبست کرنا منظور نہ تھا۔ اس نے آمدنی مالگزاری کا ایک معقول حصہ اپنے لئے مقرر کر لینے کی کوشش کی جس سے یہ مطلب تھا کہ اگر آیندہ آمدنی مالگزاری میں اضافہ ہو تو ساتھ ہی ساتھ اُس کے محاصل میں بھی اضافہ ہو جائے۔ کمپنی نے شمالی ہند میں اپنا مطالبہ پہلے تو آمدنی مالگزاری کا (۸۳) فی صدی مقرر کیا بعد کو (۷۵)، فی صدی اور پھر (۶۶) فی صدی مقرر کر دیا۔ لیکن اس تخفیف کے بعد بھی اتنی زیادہ رقم ناقابل وصول ثابت ہوئی اس لئے آخر کار ۱۸۵۵ء عیسوی میں مطالبۂ سرکار آمدنی مالگزاری کے (۵۰) فی صدی تک محدود کر دیا گیا (اور یہی قاعدہ مقرر کیا گیا جس کو ۱۸۶۴ء میں جنوبی ہند میں بھی نافذ کیا گیا) کاشت منافع پر (۵۰) فی صدی محصول آمدنی کا لگا دینا ایک ایسا بار سنگین ہے کہ کسی ملک میں بھی ایک متمدن و شائستہ حکومت کے تحت ایسا نہیں کیا جاتا۔ لیکن اس کے باوصف اگر اس حد سے بڑھے ہوئے مطالبے سے آیندہ تجاوز نہ کیا جائے تو ہندوستان کا اس میں بھی فائدہ ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی ۱۸۵۸ء میں ختم ہوی۔ تاج برطانیہ کے تحت پہلے پہل جو وائسرائے مقرر ہوے تھے اُن کی سچی خواہش یہی تھی کہ ہندوستان میں زرعی خوش حالی کو عروج دیا جائے اور زرعی تموّل کے ذرائع وسیع کئے جائیں۔ سر چارلس وڈ اور سر اسٹیفرڈ نارتھ کوٹ کے سے مدبّروں اور لارڈ کیننگ اور لارڈ لارنس کے سے حکمرانوں نے اس مقصد کے حصول میں بڑی عرق ریزی کی تھی

ان کی خواہش یہی تھی کہ اراضی پر مطالبۂ سرکار کی مقدار معین کردی جائے۔ قوم خوش حال ہو جائے۔ اور ایک ایسا طاقتور اور وفادار متوسط طبقہ پیدا کیا جائے جو اپنے اغراض و مفاد کی خاطر ہندوستان میں برطانوی حکومت سے وابستہ رہے۔ اگر ان مشاہیر کی اس صحیح حکمت عملی کو اختیار کیا جاتا تو اس سے قومی تموّل کے ایک ذریعے میں وسعت پیدا ہو جاتی۔ آج قوم بھی زیادہ ذی مقدرت اور خود اعتماد بن جاتی اور قحط بھی نادر الوقوع ہو جاتے۔ لیکن ان ملازمین تاج برطانیہ کی پہلی پشت گزر جانے کے بعد قوم کو خوش حال بنانے کی کوششیں کمزور ہو گئیں۔ شاہنشاہی کے آغاز کے ساتھ ساتھ محاصل و مصارف میں توفیر کرنے والے امور میں انہماک شروع ہو گیا۔ کیننگ اور لارنس کے تجاویز ۱۸۸۳ء میں بالکل نظر انداز ہو گئے۔

دو مختلف الخیال منتظمین مملکت کے فرقوں کے دو ممیز اصول تو قارئین صاف طور پر بیشک سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ لارڈ کیننگ، لارڈ لارنس، لارڈ ہیلیفکس اور لارڈ اوڈزلی اُس فرقے کے پیرو تھے جو مالگزاری کا دوامی بند و بست کرنے کا حامی تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ (۱) ہندوستان میں تمام زمین قوم ہی کی ملک تھی نہ کہ زمینداروں یا مالکان اراضی کی (۲) ہر کاشتکار اپنی مقبوضہ اراضی کا موروثی حقدار تھا۔ (۳) مالگزاری کے دوامی تعین سے صرف زمیندار طبقے ہی کو نہیں بلکہ کل زرعی قوم کو فائدہ پہنچتا تھا۔ دوسرے فرقے کے پیرو یہی چاہتے تھے کہ متوالی بند و بست اسے جس کے سر انجام میں عہدہ داران بند و بست اپنے اختیار تمیزی سے مطالبۂ سرکار میں عموماً اضافہ کر دیتے تھے مملکت کے لئے مالگزاری میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔

مارکوئیس رپن نے جو ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک ہندوستان کا وائسرائے رہا ان دونوں فرقوں کے آراء کا تضاد مٹانے کے لئے باہمی رفع داد کے طور پر ایک استادانہ تجویز پیش کی۔ اُس نے ایک طرف تو یہ تسلیم کر لیا کہ عام قیمتوں میں اضافہ ہونے کی مقررہ اور واجبی بناء پر مطالبۂ مالگزاری میں ہر وقت اضافہ کرنے کا سرکار کو حق حاصل ہے اور دوسری طرف اُس نے کاشتکاروں کو اس بات کا بھی یقین دلایا کہ جب تک عام قیمتوں میں اضافہ نہو مطالبۂ سرکار میں ہر گز اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ اُس نے سرکار کو یہ باور کرایا کہ اگر ملک کی خوش حالی میں اضافہ ہو

جس کا ثبوت قیمتوں میں اضافہ ہے تو اس کے ساتھ ساتھ سرکار کے محاصل میں بھی اضافہ ہو جائے گا اور کسانوں کو یہ یقین دلایا کہ مطالبۂ سرکار کی مقدار دوامًا معین رہے گی کیونکہ ہمیشہ کھیتوں کی پیداوار کا صرف ایک حصۂ متناسبہ بشکل محصول اراضی لیا جائے گا۔ لارڈ رپن کے اس منصوبہ میں بڑی خوبی کے ساتھ دونوں باتیں آگئی تھیں، ایک تو حقوق سرکار کی حفاظت دوسرے تحفظ حقوق کاشتکار، جس کے بغیر دنیا کے کسی حصے میں بھی زراعت سرسبز نہیں ہو سکتی۔ لیکن لارڈ رپن نے دسمبر ۱۸۸۴ء میں ہندوستان سے اپنے وطن کو مراجعت کی اور اس تصفیے کو وزیر ہند نے جنوری ۱۸۸۵ء میں مسترد کر دیا۔ یہ رقع داد باہمی ہندوستان کے سالہا سال کے تفکر و تجسس کا نتیجہ تھی اور اس کو وائیٹ ہال (محکمۂ وزیر ہند) نے یوں مسترد کر دیا۔ اس طرح ایک زراعت پیشہ قوم غیر معین مطالبۂ سرکار کا جو زراعت کی کامیابی کے لئے قطعی مہلک تھا دوبارہ شکار بن گئی۔

نصف لگان کا قاعدہ تو قائم رہا لیکن اس کی حیثیت ایک نظریے سے بڑھ کر نہ تھی اور عمل ہمیشہ اس کے خلاف ہی ہوتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے مصارف سے ہندوستان کی مالیاتی ذمہ داری اور بھی بڑھ گئی تھی اور اقتضائے وقت بھی یہی تھا کہ مزید محصول لگائے جائیں۔ برطانوی تاجروں اور برطانوی اصحاب رائے کی مرضی کے خلاف تجارت پر کوئی محصول نہیں لگایا جا سکتا تھا اس لئے مزید محصول کا بار زراعت ہی پر ڈالا گیا چنانچہ ۱۸۷۱ء سے اراضی پر مالگزاری کے علاوہ متعدد جدید محصول عائد کر دیے گئے تھے۔ اگر مالگزاری اس نوعیت کی جملہ آمدنی اراضی کی (۵۰) فی صدی تھی تو اراضی پر جملہ محصول بشمول محصول جدید آمدنی مالگزاری کا (۵۶) یا (۵۸) حتیٰ کہ (۶۰) فی صدی ہو گیا تھا۔ اور اہل ہند یہی پوچھ رہے تھے کہ جب کہ زراعت پر مزید بار عائد کر کے مقررہ حد سے یوں تجاوز کیا جاتا ہے تو پھر محصول اراضی کے محدود کرنے کا منشا کیا ہے؟

۱۸۷۵ء میں مارکوئیس سالسبری وزیر ہند کے عہدے پر مامور تھا۔ اُن معاملات پر نظر کرتے ہوئے جن پر وہ توجہ مبذول کرتا تھا اُس کی ژرف نگاہی اور بصیرت کا ہر شخص معترف ہے۔ اُس نے ۱۸۷۵ء میں اپنی وہ مشہور یادداشت قلمبند کی جس میں اس نے ہندوستانی یک طرفہ مالی حکمت عملی کی کمزوریاں بتا کر اُس نے اس کی

بڑی مذمت کی تھی۔ اس یاد داشت سے لوگ اکثر اقتباسات پیش کرتے رہتے ہیں۔ اُس نے لکھا تھا کہ "جہاں تک ہندوستان کے مالیاتی نظام میں تغیر ممکن ہے یہی مناسب ہوگا کہ جملہ قومی مطالبے کا کمتر حصہ کاشتکار ادا کریں۔ یہ حکمت عملی بجائے خود کفایت شعاری پر مبنی نہیں کہ اضلاع سے جہاں اصل کم یاب ہے محاصل کثیر مقدار میں وصول کئے جائیں اور شہروں کو جہاں اصل نہ صرف بکثرت موجود ہے بلکہ تعیش میں ضائع کی جاتی ہے یونہی چھوڑ دیا جائے۔ ہندوستان کے لئے جہاں اس قدر محاصل بے معاوضہ بیرون ملک ارسال کئے جاتے ہیں یہ صورت حال اور بھی ضرر رساں ہے۔ اگر ہندوستان کی فصد ہی کھولنا ہو تو نشتر کو جسم کے ایسے حصے پر لگانا چاہئے جہاں بہت خون جمع ہو یا کم سے کم کافی مقدار میں موجود ہو نہ کہ ایسے حصے پر جو خون کی قلت کی وجہ سے خود کمزور ہو۔"

لارڈ سالسبری کے اس انتباہ پر کسی نے توجہ ہی نہ کی۔ جس وقت سے کہ روپیہ کی شرح مبادلہ ایک شلنگ چار پنس مقرر کی گئی ہے ہم یہی سن رہے ہیں ہر سال موازنے میں محاصل میں اضافہ اور فاضلات ہی ہو رہے ہیں لیکن ان کے باوجود اس ظاہری خوش حالی سے فائدہ اٹھا کر مزارعین کے کاندھوں کا بوجھ کبھی ہلکا نہیں کیا گیا۔ ۱۸۷۱ء سے اراضی پر مالگزاری کے علاوہ جو مختلف محصول لگائے گئے تھے اُن میں سے ایک کو بھی منسوخ نہیں کیا گیا۔

ان واقعات سے جن کو میں نے ممکنہ اختصار کے ساتھ اوپر بیان کیا ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زراعت میں قومی آمدنی کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے برطانوی نظم و نسق کے تحت کوئی وسعت نہیں پیدا کی گئی تھی۔ اُن مقامات کے علاوہ جہاں مالگزاری کا دوامی تعین ہو چکا تھا ہر جگہ بیس یا تیس سال کے بعد ہر تجدید بندوبست کے وقت مالگزاری پر نظر ثانی کر کے اُس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ بظاہر آمدنی مالگزاری یا معاشی لگان کا (۵۰) فی صدی وصول کرتا ہی بیان کیا جاتا ہے لیکن بمبئی اور مدراس میں درحقیقت اس سے بھی بڑھ کر وصول کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اراضی پر ایسے مختلف محصول عائد کئے گئے ہیں جن میں مملکت خاطر خواہ اضافہ بھی کر سکتی ہے۔ اس طرح محصول اراضی کی مقدار بے انتہا سنگین اور غیر معین ہے خواہ کوئی ملک کیوں نہ ہو اگر وہاں ایسے

قواعد زیر عمل رہیں تو زراعت پر انحطاط کا چھا جانا لازمی ہے۔ ہندوستان کے کاشتکار بڑے کفایت شعار، جفاکش اور صلح پسند ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ مفلوک الحال، بے وسیلہ، قحط زدہ اور فاقہ کش ہی رہتے ہیں۔ یہ حالت ایسی نہیں کہ اس پر انگریز از روئے انصاف فخر کر سکیں۔ یہی صورت آئرلینڈ میں بھی درپیش تھی جس کی اصلاح کے انگریز درپئے تھے۔ اگر انگریز ایک دفعہ اس صورت حال کو سمجھ جائیں تو پھر وہ ہندوستان میں اس کے ہرگز روادار نہ ہوں گے۔

اگر اب ہم ذرائع تموّل کے موضوع کو چھوڑ کر تقسیم دولت اور ہندوستان کے مالیاتی نظام کی طرف متوجہ ہوں تو ہماری نظروں کے سامنے وہی دل آزار تصویر پھر جاتی ہے۔ ملکۂ وکٹوریہ کے عہد حکومت کے آخری دس سال یعنی سنہ ۹۲-۱۸۹۱ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک کے ہندوستان کے جملہ محاصل چوسٹھ کروڑ ستر لاکھ پونڈ ہوئے تھے۔ اس حساب سے سالانہ اوسط محاصل بشمول آمدنی ریلوے و آبپاشی و جملہ دیگر مدّات ساڑھے چھ کروڑ پونڈ ہوتے ہیں۔ اسی دہ سالہ مدّت میں انگلستان میں پندرہ کروڑ نوے لاکھ پونڈ ہندوستان کے خرچ ہوئے تھے جس کا سالانہ اوسط ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ ہوتا ہے۔ اس طرح ہندوستان کے جملہ محاصل کا ایک ربع بشکل مطالبات وطن ہر سال انگلستان ارسال کیا جاتا تھا۔ اگر اس میں اس رقم کو بھی شامل کر لیا جائے جو ہندوستان کے یورپی عہدہ دار اپنی تنخواہوں سے پس انداز کر کے ہر سال انگلستان ارسال کرتے تھے تو پھر ہندوستان سے جو سیم و زر کا سالانہ بہاؤ دو کروڑ پونڈ سے بھی زیادہ تھا۔ دنیا کا سب سے زیادہ متموّل ملک دنیا کے سب سے زیادہ افلاس زدہ ملک سے ہر سال ایک ایسا خراج وصول کرتا تھا جو اس کے شایان شان نہ تھا۔ وہ ملک جس کے ہر فرد کی آمدنی (۴۲) پونڈ ہے دس شلنگ فی کس ایک ایسی قوم سے وصول کرتا ہے جس کے افراد کی آمدنی صرف (۲) پونڈ فی کس ہوتی ہے۔ برطانوی قوم جو یہ دس شلنگ فی کس ہندوستان سے وصول کرتی ہے اس سے ہندوستانی اور زیادہ مفلس و نادار بن جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ساتھ جو برطانوی تجارت قائم ہے اس میں بھی انحطاط پیدا ہو جاتا ہے اس خراج سے برطانوی خارجی اور داخلی تجارت کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا اور مفت ہی مفت میں اس سے ہندوستان کی

رگِ جاں سے خوں بہا چلا جاتا ہے۔

اگر محصول اسی ملک میں خرچ کئے جائیں جہاں وہ وصول کئے جاتے ہیں تو اس سے روپیہ اہل ملک ہی میں گشت کرتا رہے گا۔ تجارت کو تقویت اور حرفت و زراعت کو ترقی ہوگی اور یہ روپیہ ایک نہ ایک شکل میں عامتہ الناس تک پہنچ جائے گا لیکن محصول جس ملک میں وصول ہوں اگر اُن کا روپیہ بیرون ملک ارسال کر دیا جائے تو پھر یہ روپیہ اس ملک سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائے گا ایسی ارسال سے نہ تو ملک کی تجارت و حرفت کو ترقی ہوتی ہے اور نہ یہ روپیہ کسی شکل میں بھی عامتہ الناس تک پہنچتا ہے ہندوستان کے محاصل سے دو کروڑ پونڈ سے بھی زیادہ رقم ہر سال بیرون ملک ارسال کی جاتی ہے اور دراصل یہ ایک معجزہ ہوگا اگر اس طرح کا عمل جس کا تسلسل برسوں تک رہے دنیا کی متموّل سے متموّل قوم کو مفلس و نادار نہ بنا دے۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں ہندوستان کے جملہ محاصل ایک کروڑ پچھتر لاکھ پونڈ اور جملہ مطالبات وطن ایک کروڑ ستر لاکھ پونڈ ہوئے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں کی اراضی سے جتنی آمدنی ہوتی ہے وہ تمام و کمال شکل مطالبات وطن ہر سال بیرون ملک ارسال کر دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یورپی عہدہ دار بھی جن کی تنخواہیں ہندوستان کے محاصل سے ادا ہوتی ہیں اپنی طرف سے لکھو کھا روپیہ بیرون ملک ارسال کرتے ہیں اور جتنا جتنا یورپی عہدہ داروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا اُتنا اُتنا اس رقم میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

مطالبات وطن کی شکل میں جو ایک کروڑ ستر لاکھ پونڈ انگلستان ارسال کئے گئے تھے وہ حسب ذیل مدّوں میں صرف ہوئے تھے: (۱) ہندوستانی قرض پر واجب الادا سود (۲) ریلیوں کے اصل کا سود (۳) دیوانی اور فوجی مطالبات۔ منجملہ موخرالذکر مطالبات کے فوجی اور دیگر ساز و سامان کی سربراہی میں اس رقم کا ایک خفیف حصہ یعنی صرف دس لاکھ پونڈ صرف ہوئے تھے۔

اس ملک میں عام طور پر یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ ہندوستان کا جملہ قرض دوسرے الفاظ میں درحقیقت وہ برطانوی اصل ہے جو ہندوستان کے نشو و نما میں صرف کیا گیا تھا۔ لیکن اس کتاب میں یہ ثابت کرکے دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے

سرکاری قرض کی بناء یہ نہیں ہے ۱۸۵۸ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کی حکمراں نہیں رہی تھی تو اس وقت ہندوستان کا قرض سات کروڑ پونڈ ہو چکا تھا۔ اس اثناء میں کمپنی بھی پندرہ کروڑ پونڈ سے زیادہ رقم جس میں اُس کا سود شامل نہ تھا بطور خراج ہندوستان سے وصول کر چکی تھی جو بالکل انصاف کے خلاف تھا۔ اس کے علاوہ متعدد جنگوں، مثلاً جنگ افغان و جنگ چین اور دوسری اسی قبیل کی جنگ و جدل کے مصارف کا جو بیرون ملک وقوع پزیر ہوئی تھیں بارگراں ہندوستان ہی کے سر ڈالا گیا تھا۔ ان وجوہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کمپنی کی حکمرانی کے ختم پر از روئے انصاف کسی کا مقروض نہ تھا۔ اُس کا سرکاری قرض محض ایک بے بنیاد افواہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس طرح منجملہ اُس رقم کے جو ہندوستان سے وصول کر لی گئی تھی دس کروڑ پونڈ کی معتدبہ رقم دراصل خود انگلستان پر فاضل نکلتی تھی۔

تاج برطانیہ کے نظم ونسق کے ابتدائی اٹھارہ سال میں ہندوستان کا سرکاری قرض دوچند ہو گیا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں جب ملکہ وکٹوریہ نے قیصرۂ ہند کا لقب اختیار کیا اُس وقت یہ قرض چودہ کروڑ پونڈ تھا۔ اُس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی لڑائیوں کے مصارف جو چار کروڑ پونڈ سے بھی زیادہ ہوئے تھے ہندوستان کے محاصل میں محسوب کر دیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ۱۸۶۷ء میں جو جنگ ابی سینا ہوئی تھی اس کے مصارف کے بہت بڑے حصے کو بھی ہندوستان ہی کو ادا کرنا پڑا تھا۔

۱۸۷۷ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان سرکاری قرض تیرہ لاکھ نوّے ہزار پونڈ سے بائیس لاکھ چالیس ہزار پونڈ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ملک کی ضرورتوں سے زیادہ اور اُس کے مقدور سے بڑھ کر ایسی کمپنیوں کے ذریعے سے جن کے منافع کی خود سرکار کفیل تھی ریلوں کی تعمیر کرائی گئی تھی اور خود سرکار نے بھی براہ راست ان کی تعمیر کی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ ۱۸۷۸ء اور ۱۸۹۷ء کی جنگ افغان تھی۔ ہندوستانی قرض کی سرگزشت مالیاتی بے دانشی اور ناانصافی کی ایک دل خراش داستان ہے۔ ہر غیر جانب دار شخص اپنے لئے اس بات کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے اس ہندوستانی قرض کا کتنا حصہ ہندوستان پر واجب الادا ہے۔

مطالبات وطن کی آخری مدین دیوانی اور فوجی مطالبات ہیں۔ ان پر

نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اگر برطانوی شاہنشاہی ہند کی تعمیر میں برطانیہ اور ہندستان دونوں کا نفع ہے تو پھر یہ عدل وانصاف کے خلاف ہوگا کہ اس عظیم الشان عمارت کو برقرار و مستحکم رکھنے کے جملہ مصارف اکیلا ہندوستان ادا کرتا رہے۔ یہ کونسا انصاف ہے کہ انگلستان میں جتنے مصارف لاحق ہوں حتیٰ کہ دفتر وزیر ہند کی مرمت وغیرہ کے اخراجات اور وائیٹ ہال کے کمرے صاف کرنے والی عورتوں کی مزدوری بھی ہندوستان ہی ادا کرے؟ چالیس سال قبل ہندوستان کے ایک بہت بڑے منتظم مملکت نے رفع داد باہمی کے طور پر ایک منصفانہ تجویز پیش کی تھی۔ سر جورج ونگیٹ نے اپنی کتاب میں جو "ہندوستان کے ساتھ ہمارے مالیاتی تعلقات" Our Financial Relations With India کے نام سے موسوم ہے اور جو ۱۸۵۹ء میں شایع ہوی تھی یہ تحریک کی تھی کہ ہندوستان کو دیوانی اور فوجی نظم و نسق کے وہ جملہ مصارف جو ہندوستان ہی میں عائد ہوں ادا کرنا چاہیئے اور انگلستان کو وہ تمام اخراجات جو انگلستان میں عائد ہوں ادا کرنا چاہیئے جیسا وہ اپنی نوآبادیات کیلئے کرتا ہے کیا اب اس طرح کا کوئی منصفانہ تصفیہ کرنا بعد از وقت ہوگا؟ ہندوستان کے جملہ دیوانی اور فوجی مصارف جو انگلستان میں عائد ہوتے ہیں ساٹھ لاکھ پونڈ ہیں اور اگر یہ رقم برطانوی محصول دینے والے ادا کریں تو اس میں بہت بڑی تخفیف کا امکان ہے۔ کیا انگلستان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس بار کو برداشت کرے گا کوئی بڑی بات ہے خصوصاً ایسی صورت میں کہ ہندوستان وہ تمام دیوانی اور فوجی مصارف جو ہندوستان میں عائد ہوں خود ادا کرے گا؟

ہندوستان کی جو معاشی حالت ہے اُس کے سیدھے سادھے واقعات یہی ہیں۔ ان حالات میں خواہ دنیا کا کوئی کیسا ہی سرسبز، جفاکش اور صلح پسند ملک ہی کیوں نہ ہو ویسا ہی بن جائے گا جیسا آج ہندوستان نظر آرہا ہے۔ اگر مصنوعات اٹھا دی جائیں اور زراعت پر بے اندازہ محصول لگا دیا جائے اور محاصل کا ایک ثلث بیرون ملک ارسال ہوتا رہے تو دنیا کی خواہ کوئی قوم ہی کیوں نہو وہ دائمی افلاس اور مسلسل قحط کے مصائب سے ہرگز نہیں بچ سکتی۔ معاشی قوانین جو یوروپ میں ہیں وہی ایشیا میں بھی ہیں۔ اگر آج ہندوستان افلاس زدہ ہے تو انھیں معاشی اسباب

وعلل کی بنا، پر ہے۔ اگر ان حالات کے باوجود ہندوستان سرسبز و شاداب بنے تو یہ ایک معاشی معجزہ ہوگا لیکن سائنس معجزات کو تسلیم ہی نہیں کرتا معاشی قوانین اپنے عمل اور اثر میں دائمی اور بالکل غیر متغیر ہیں۔

ان خرابیوں کا علاج خود ان خرابیوں کی نوعیت سے عیاں ہے۔ ہندوستان کی گرنیوں کے مصنوعات پر محصول چنگی موقوف کر دینا چاہیئے۔ ہندوستان کی حکومت پر لازم ہے کہ وہ اہل ہند کی فلاح وبہبود کی خاطر ہمت کرکے ہندوستان کی حرفت کی پشت پناہ بنے جیسا دنیا کی ہر متمدن و شائستہ حکومت اپنے ملک کی حرفت کی پشت پناہ ہوتی ہے۔ اراضی پر مالگزاری کے سوا جتنے محصول ہیں اُن سب کو ایک لخت مسدود کر دے اور مالگزاری کی کارروائی بھی مبنی بر اعتدال اور بہت ہی منتظم کر دی جائے۔ سرکاری قرض جس کا آغاز ناانصافی پر مبنی تھا اب ایک امر مسلمہ ہے لیکن اگر اب اس قرض کے لئے شاہنشاہی اپنی ضمانت دے تو اس کی شرح سود میں تخفیف ہوسکتی ہے اور ذخیرۂ تادیہ سے اس کی مقدار میں بھی بتدریج کمی ہوسکتی ہے۔ جملہ دیوانی اور فوجی مصارف کو جو انگلستان میں عائد ہوں یا کم سے کم ان کے ایک جز کو برطانیہ عظمٰی برداشت کرے جیسا وہ اپنی نوآبادیات کے لئے کرتی ہے۔ ہندوستانیوں کو زیادہ تعداد میں سرکاری خدمات دے کر ہندوستان کے دیوانی مصارف میں تخفیف کرے۔ ہندوستان میں فوجی اخراجات کو پوری قوت اور نہایت سختی کے ساتھ روکے اور ہندوستان کے محاصل سے اتنی ہی فوج کے مصارف ادا کرے جتنی فوج اُس کی ضرورتوں کے لئے کافی ہے۔ سرکاری قرض سے یا سرکاری طور پر محصولات کی آمدنی سے سود کی کفالت کرکے آیندہ ریلوں میں توسیع کرنے کی ممانعت کر دے۔ حتی الامکان معمولی محاصل ہی سے ذرائع آبپاشی کو توسیع دے۔ ہندوستان سے جو معاشی جوئے سیم وزر جاری ہے اُس کی روانی میں مستقل طور پر کمی کر دے۔ ان مالیاتی اصلاحات پر عمل کرتے وقت اہل ہند کے نمایندوں کو بھی اپنا شریک کرے اور اُن سے مشورہ لے کیوں کہ ہر ملک میں محصول دینے والوں ہی کو تخفیف مصارف سے خاص دلچسپی رہتی ہے۔

جان اسٹوارٹ مل نے لکھا ہے کہ "قوم کی حکومت بجائے خود ایک معنی اور حقیقت رکھتی ہے لیکن یہ بات کہ ایک قوم کی حکومت دوسری قوم کرے اس کا نہ کہیں وجود ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کو اپنے ذاتی اغراض کے لئے رکھ سکتی ہے جیسے روپیہ پیدا کرنے کا کوئی مقام ہو یا آدمیوں کے گلوں کے لئے ایک مرغزار جو وہاں کے ساکنوں ہی کی جلب منفعت کا ذریعہ ہو"۔ یہ بیان ایک بڑی گہری صداقت پر مبنی ہے۔ لوگوں کا انبوہ کثیر اسی طینت کا ہوتا ہے کہ معمولی حالات میں وہ دوسروں کے اغراض کے خیال سے جنبش تک نہیں کرتا۔ برطانوی اصحاب رائے ایسے ہی منصف مزاج ہوتے ہیں جیسے دنیا کے کسی اور ملک کے ہو سکتے ہیں لیکن وہ برطانوی صاحب رائے انسان ہی نہ ہوگا جو اپنے مفاد اور اپنے اغراض کو پیش نظر نہ رکھے کیوں کہ اقتضائے فطرت ہی یہی ہے۔ پارلیمنٹ اپنے اہل الرائے کے احکام کی تابع ہے اور وزیر ہند جو برطانوی کابینہ کا ایک رکن ہے ارکان کابینہ کی متفقہ خواہشوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ وزیر ہند ہی اپنی کونسل کے ارکان کا تقرر کرتا ہے اور یہ ارکان کسی معنی میں بھی اہل ہند کے نمایندے نہیں ہیں۔ ہندوستان کا وائسرائے بھی وزیر ہند ہی کا تابع ہے حکومت ہند وزیر ہند کی کونسل ہی کے تفویض ہے اور بقول سر ولیم ہنٹر یہ کونسل ایک عدید یہ ہے اور رعایا کی نمایندہ نہیں ہے۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ارکان عام طور پر خرچ کرنے والے سر رشتوں ہی کے صدر ہیں اور جیسا سر ڈیوڈ باربرنے "ماموریہ مصارف ہندوستان" کے سامنے اپنی شہادت میں بیان کیا تھا: "ہر وقت رجحان طبع اسی طرف رہتا ہے کہ مزید مصارف عائد کرنے کے لئے سر رشتۂ مالیات پر دباؤ ڈالا جائے اور یہ عملاً دباؤ ہی ہے۔ دیگر سر رشتہ جات حکومت زیادہ روپیہ خرچ کرنے ہی پر ہمیشہ زور دیتے رہتے ہیں اور ان کے مطالبات کا ایک سلسلہ قائم رہتا ہے جن پر وہ شدّ و مدّ کے ساتھ مصر رہتے ہیں۔" حکومت ہند پر از سرتا پا نہ کسی کا اثر ہے کہ وہ تخفیف مصارف کی محرک و موید ہو اور نہ کسی کا زور چلتا ہے کہ وہ محصول دینے والوں کے اغراض کی حفاظت کرے۔ ایک ایسے دستور کے تحت جیسا

ہندوستان کا ہے مالیاتی اصلاحات تو ناممکن ہیں۔ اگر تخفیف مصارف ہی مقصود ہو تو اس دستور میں کہیں نہ کہیں اسیرانِ محصول کے اغراض کی نمایندگی کی گنجائش نکالنی ہوگی۔

شاہنشاہی ہند کے متعلق تاریخ یہی فیصلہ کرے گی کہ عصر جدید کے ادارات میں وہ سب سے زیادہ عظیم الشان ادارہ ہے۔ لیکن آنے والے مورخین کو یہ دلخراش قصہ دھرانا پڑے گا کہ اس شاہنشاہی نے ہندوستان میں امن تو قائم کیا لیکن وہ اہل ہند کو خوش حال نہ بنا سکی۔ یہ کہ صنعت اور حرفت کا نام و نشان تک باقی نہ رکھا۔ یہ کہ کاشتکار ایسے سنگین اور تغیّر پذیر محصول سے پس گئے جنھیں ادا کرنے کے بعد آمدنی سے پس انداز کرنے کے لئے کچھ نہیں بچتا تھا۔ یہ کہ محاصل کا بیشتر حصہ ایک طفل گم شدہ کی طرح انگلستان چلا جاتا تھا۔ اور یہ کہ تباہ کن مسلسل قحط سے لکھوکھا نفوس کا صفایا ہو گیا تھا۔ برخلاف اس کے انگریزوں کے لئے اس قصے کا بیان کرنا باعث اطمینان ہوگا کہ انگلستان نے بیسویں صدی عیسوی میں آئرلنڈ کی طرح ہندوستان میں بھی اپنی تمام گزشتہ غلطیوں کی تلافی کر دی یہ کہ محصول اراضی میں تخفیف کر دی۔ حرفتوں میں نئی روح پھونک دی رعایا کی نمایندگی کی ترویج کی اور اہل ہند ہی کے مفاد میں ہندوستان پر حکومت کی۔ اور یہ کہ اہل ہند کے دل و دماغ بھی یہی محسوس کرنے لگے تھے کہ اب ان کا شمار بھی ایک عظیم الشان متحد شاہنشاہی کے شہریوں میں ہو چلا تھا۔

رامیش دت۔

لندن۔ دسمبر ۱۹۰۲ء عیسوی۔

دیباچہ طبع ثانی

اس کتاب کی اشاعت کو ابھی تین سال نہ ہوئے تھے کہ طبع ثانی کا مطالبہ ہونے لگا جو مؤلف کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث ہوا۔ اور مؤلف کو یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی کہ امریکہ میں یہ کتاب ایک حد تک مقبول ہوئی اور اس کے ان الواب کا جن میں تاریخی واقعات بیان کئے گئے ہیں ہالینڈ کے پروفیسر زمین نے ایک یورپی زبان میں ترجمہ کیا

موجودہ زمانے میں آثار بہت امید افزا نظر آ رہے ہیں سنہ رواں میں ہندوستان کی جدید حکومت نے اراضی پر جو بعض سنگین الواب عائد کئے تھے ان کو موقوف کر دیا اور انگلستان کی جدید پارلیمنٹ نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ وہ مجالس وضع قوانین میں نمایندگی کے عنصر میں عنقریب اضافہ کرنے والی ہے۔

رامیش دت۔

لندن۔ اگست ۱۹۰۶ء عیسوی

فہرست مضامین

معاشی تاریخ ہند جلد دوم

پہلی کتاب

عہدِ کمپنی بہادر

سنہ ۱۸۳۰ء تا سنہ ۱۸۵۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا باب

آکلینڈ اور النبرو

۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنک نے ہندوستان کو خیر باد کہا۔ اس کی ہفت سالہ حکومت کا زمانہ امن تخفیف مصارف اور اصلاح کا زمانہ تھا۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں امن قائم کیا اور ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ صلح پسندی کے ساتھ گزاری۔ اس نے سرکاری قرضے میں تخفیف کی اور سالانہ مصارف میں نہ صرف کمی کی بلکہ محاصل میں اخراجات کے بمقابل فاضلات بھی کر کے دکھائے۔ اسی نے شمالی ہند میں اس مرتبہ بندوبست کی ابتدا کی جس سے زمیندار اور کاشتکار دونوں کو فائدہ پہنچا۔ اس نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سررشتہ جات عدالت و مالگزاری کی اعلیٰ خدمتیں بھی دیں۔ ستی کی رسم بند کر دی اور ٹھگی کے جرائم کا انسداد کیا۔ انگریزی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس نے ان اصول پر کاربند رہنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کے نظم ونسق میں ہندوستانیوں کے اغراض سب پر مقدم ہونے چاہئیں۔ اس کے جانشین سر چارلز مٹکاف نے بھی انہیں تجربوں اور روایات سے فائدہ اٹھا کر وہی طریقہ اختیار کیا اور انہیں اصول کا پابند رہا جنکی بنٹنک نے پابندی کی تھی چنانچہ مٹکاف نے اخباروں کو آزادی بھی بخشی اور

ایک قابل و نیک نیت حاکم ہونے کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

لارڈ ولیم بنٹنک کا استعفاء جب اگست ۱۸۳۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظماء تک پہنچا تو اس وقت ہنری جورج ٹکر انکا میر مجلس تھا۔ ٹکر نے ہندوستان میں ممتاز خدمتیں انجام دی تھیں اور ویلزلی اور منٹو کے تحت مالی انتظامات میں بھی خاص قابلیت دکھائی تھی۔ خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اور انگلستان کی طرف مراجعت کرنے پر بھی اس نے ہندوستان کے اغراض کو کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ بنٹنک کا استعفاء پیش ہونے پر ٹکر کو فکر ہوئی کہ اس کا جانشین کوئی اسی کا ہم پلہ شخص مقرر ہونا چاہیئے۔ مونٹ اسٹوارٹ الفنسٹن اور چارلس مٹکاف یہ دونوں اس کے پیش نظر تھے۔ مقدم الذکر حال ہی میں بمبئی سے انگلستان واپس آیا تھا اور موخر الذکر بنگالے میں ہنوز اپنی مفوضہ خدمت انجام دے رہا تھا۔ الفنسٹن نے جو اس زمانے میں انگلستان میں آسودہ زندگی بسر کر رہا تھا دوبارہ ہندوستان کے شور و شر میں مبتلا ہونے سے انکار کر دیا۔ اس پر نظماء کے میر مجلس نے گورنر جنرل ہند کے عہدۂ جلیلہ پر سر چارلس مٹکاف کے تقرر کی تجویز پیش کی جس کو نظماء نے کثیر غلبۂ آراء کے ساتھ منظور کر لیا۔ مگر وزرائے سرکار برطانیہ نے اس میں تامل ظاہر کیا۔ جب مجلس نظماء کی یہ تجویز مجلس نظم میں پہنچی تو مجلس نظم نے کمپنی کے انتخاب کو اس عہدہ کیلئے نامناسب قرار دیا کیونکہ دراصل ارکان کی خفیہ خواہش یہ تھی کہ یہ سب سے بڑی خدمت اپنے گروہ کے کسی طرفدار کو مل جائے۔

انگلستان کے نظم و نسق میں بڑے بڑے تغیرات متواتر وقوع میں آئے "جدت پسند گروہ" کی وزارت جس نے سر چارلس مٹکاف کے تقرر کو نامنظور کیا تھا ۱۸۳۴ء کے آخر میں مستعفی ہوگئی۔ اس کے بعد سر رابرٹ پیل نے "قدامت پسند" حکومت قائم کی جس نے سر چارلس مٹکاف کے بجائے ایک "قدامت پسند" امیر کا انتخاب کیا۔ یہ امیر لارڈ ہیٹسبری تھا جس کا تقرر جنوری ۱۸۳۵ء میں اس خدمت پر ہوا اور فروری میں تاج برطانیہ نے اسکی منظوری بھی دیدی۔ مارچ میں ہیٹسبری کو وداعی ضیافت بھی دی گئی۔ سر رابرٹ پیل۔ ڈیوک ولنگٹن

اور دیگر "قدامت پسند" معززین شریک جلسہ تھے لیکن اپریل میں لارڈ ہیٹسبری کے ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے "قدامت پسند" حکومت کا عزل ہوگیا اور جدت پسند وزارت جس نے جو اس کے بعد ہی قائم ہوئی اس قدامت پسند امیر کے تقرر کو منسوخ کرکے اس کے بجائے اپنے گروہ کے ایک امیر کو گورنر جنرل ہند کے عہدہ پر مامور کیا۔ سر چارلز مٹکاف سے جو بنٹنک کی روانگی کے بعد گورنر جنرل کی خدمت ایک قائم مقام کی حیثیت سے انجام دیرہا تھا عنان حکومت لینے کے لئے لارڈ آکلینڈ مقرر ہوا یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ معاملات قدامت پسند گروہ کے لئے زیادہ باعث ذلت تھے یا جدت پسند گروہ کے لئے لیکن اتنا تو ضرور معلوم ہوتا تھا کہ دونوں گروہ مساوی طور پر اپنے اپنے اغراض کو ہندوستان کے نظم و نسق کی ضرورت پر ترجیح دیتے تھے۔

لیکن گورنر جنرل ہند کے عہدہ پر لارڈ آکلینڈ کا تقرر بہت گہرے معنی رکھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کی خارجی حکمت عملی کی تشکیل انگلستان کی خارجی حکمت عملی کے مماثل ہونی چاہئے۔ انگلستان میں جدت پسند گروہ نے ۱۸۳۰ء کے انتخاب میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنی وزارت قائم کی اور ایک تھوڑے سے وقفے کے سوا جو ۱۸۳۴ء اور ۱۸۳۵ء کے درمیانی موسم سرما میں واقع ہوا تھا گیارہ سال تک انہیں کی حکومت قائم رہی اس جدت پسند حکومت" میں اس وقت سب سے زبردست شخص لارڈ پامرسٹن وزیر خارجہ تھا اور اس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ روس کو مشرق میں کسی طرح بڑھنے نہ دے۔ چنانچہ اس نے اسی غرض سے ۱۸۳۳ء میں ترکی حکومت کی تائید اور امداد بھی کی۔ ۱۸۴۰ء میں اس نے یورپ کی تین طاقتوں کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ ترکوں کو افواج و عساکر سے کمک دیں اور ۱۸۴۱ء میں اس نے مصر کو دوبارہ ترکی طاقت کے زیر نگیں کر دیا۔ ان تمام باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان پر لارڈ آکلینڈ کے تقرر کا اصلی منشاء روس کے خلاف انگلستان کی حکمت عملی کو تکمیل پر پہنچانا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ الحاق و فتح کی خاطر لڑائیاں مول لیتی تھی مگر پہلی جنگ افغان کا جرم اس پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔

کیونکہ یہ جنگ اس کی منظوری یا رضامندی کے بغیر اس کے سر پڑی تھی۔
سنہ ۱۸۳۵ء ہی میں مجلس نظماء کے میر مجلس وقت ہنری سینٹ جورج ٹکر نے مجلس نظم کو ان اصول کے تسلیم کرنے پر راضی کر لیا تھا کہ روس کو نہ بڑھنے دینے کے لیے انگلستان جو چالیں چل رہا تھا اور جو معاملات ایران سے طے ہو رہے تھے ان سے ہندوستان کو کوئی سروکار نہ ہوگا بلکہ وہ سب خاص یورپ ہی سے متعلق ہونگے۔ اس "افسوس ناک خست" کے ساتھ جو ہندوستان کے اکثر مالی معاملات میں انگلستان کا خاصہ رہی ہے یہ انتظام کیا گیا کہ سفارت ایران کے لیے ہندوستان سالانہ بارہ ہزار پونڈ دیتا رہے لیکن انگریزی سفیر مقیم طہران اور ایران کے تمام سیاسی امور پر تمام اقتدار وزرائے دولت برطانیہ ہی کے ہاتھ میں رہے جب روس و ایران سے متعلق مسئلے کو خاص یورپ کا مسئلہ تسلیم کر لیا گیا تھا اس وقت یہ گمان تک نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جبکہ اس مسئلے کے حل کرنے میں ہندوستانیوں کا خون اور خزانہ پانی ہو کر بہے گا۔

ڈاکٹر مکنیل شاہ ایران کے دربار میں سفیر مقرر ہوا اور اس نے لارڈ پامرسٹن وزیر خارجہ کے ساتھ براہ راست مراسلت شروع کر دی۔ فروری سنہ ۱۸۳۷ء میں اس نے لارڈ پامرسٹن سے شکایت کی کہ قندھار کے گماشتے نے روسی ایلچی سے ملاقات کی مگر سفیر انگلستان سے ملا تک نہیں۔ اور اسی مہینے میں پامرسٹن کو ایک اور مراسلہ لکھا جس میں شاہ ایران کی ہرات پر ممکنہ فوج کشی کو جائز قرار دیتے ہوئے حسب ذیل امور پیش کیے:-

"ہرات پر ایران کے دعوئے اقتدار سے قطع نظر کر کے اگر اس مسئلہ کو محض دو خود مختار فرماں رواؤں کے مابین تصفیہ طلب امر تصور کیا جائے تو میری دانست میں ہرات کی حکومت ہی کی اس میں زیادتی پائی جائے گی"

"ایران نے افغانیوں کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں کی تھی لیکن شاہ سابق کی وفات پر حکومت ہرات نے ترکمان اور ہزارہ قبائل کو ساتھ لیکر علداری ایران میں خوب تاخت و تاراج کی اور ایرانی رعایا کو غلاموں کی طرح بیچے

کی غرض سے گرفتار کر لیا۔"

"ان حالات کے لحاظ سے اگر شاہ ایران شاہزادہ کامران کے خلاف اعلان جنگ کرے بھی تو شاہ ایران کے حق بجانب ہونے میں میرے نزدیک کوئی شبہ نہیں ہے۔"

الغرض ایرانیوں نے ہرات پر حملہ کر دیا۔ دوست محمد امیر افغانستان بھی شاہ ایران کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ ایک زمانے میں اسی دوست محمد نے رنجیت سنگھ والی پنجاب سے پشاور واپس لینے کی کوشش کی تھی اور کابل میں روسی سفارت کا قیام بھی منظور کر لیا تھا۔ بادی النظر میں یہی وجوہ تھے جن کی بناء پر لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل وقت نے افغانستان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

اب قارئین کو بڑے تجسس کے بعد بھی پتا نہیں چلتا کہ آخر اس جنگ کا جس میں ہندوستان بلا وجہ گرفتار ہو گیا۔ کوئی معقول سبب بھی تھا کہ نہیں اگر یہ کوشش اس لیئے تھی کہ رنجیت سنگھ سے پشاور واپس لے لیا جائے تو یہ کوشش رائگاں گئی کیونکہ رنجیت سنگھ اپنے مال کی آپ بخوبی حفاظت کرنے کے قابل تھا یا یہ بھی فرض کیا جائے کہ یہ جنگ محض اس غرض سے شروع کی گئی تھی کہ دوست محمد خان نے ہرات پر حملہ کرنے میں شاہ ایران کی مدد کی تھی اس لیئے اس سے انتقام لیا جائے تو بھی یہ مفروضہ درست نہیں ہو سکتا کیونکہ گورنر ہرات کے طرز عمل کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوست محمد خان کا شاہ ایران کی کمک کرنا "بالکل جائز و حق بجانب" تھا جیسا خود ڈاکٹر میکنیل نے اپنے ۱۸۳۷ء کے مذکورہ الصدر مراسلے میں اعتراف کیا سچ پوچھئے تو اس جنگ کی اصل غرض یہ تھی کہ دوست محمد جیسے قابل اور زبردست حکمران کو باوجود دوستانہ ہونے کے معزول کر کے انگریزوں کے کسی آور دے کو اس کی جگہ تخت نشین کیا جائے۔

اسطرح درحقیقت لارڈ پامرسٹن انگلستان کے ایک زبردست حریف کا مشرق میں مقابلہ کر رہا تھا با ایں ہمہ لارڈ آکلینڈ نے اس جنگ کے مصارف ہندوستان کے محاصل سے ادا کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ سینٹ جو رج ٹکر نے لکھا کہ "ملکۂ معظمہ کی حکومت کے لئے سہولت اسی میں تھی کہ روس کے مقابلے کے لیے اپنا بیڑہ بحیرۂ بالٹک یا بحیرۂ اسود روانہ کرنے کے بجائے اس مہم کے جملہ مصارف کا بوجھ ہندوستان ہی

پر ڈال دے۔ لیکن ہم ایسی کوششوں کی جن کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی دولت ملک کے باہر اور امور پر صرف کی جارہی ہے یقیناً مدافعت کریں گے"۔

بالآخر ہرات کا محاصرہ ایرانی فوجوں نے اٹھالیا۔ اب افغانی معاملات میں لارڈ آکلینڈ کی مداخلت کی ظاہری وجہ جو تھی وہ بھی غائب ہوگئی۔ افغانستان کے ساتھ جنگ کا ارادہ ترک کرنے کے لئے ابھی کافی مہلت تھی۔ اگرچہ ڈیوک ونگٹن ایسا شخص نہ تھا کہ اس کو "ہر صورت صلح پسند" کہا جاسکتا تاہم خود اس کی بھی رائے یہی تھی کہ اس مہم سے اب دست بردار ہوجانا چاہیئے چنانچہ اس نے سینٹ جورج ٹکر کو یہ لکھا کہ "میں تو یہ سمجھتا تھا کہ ہرات کا محاصرہ اٹھانا خود دریائے سندھ کی مہم سے دست بردار ہونے کی علامت تھی۔ اگر اب ارادہ بدل گیا ہے تو یہ بڑی بدنصیبی ہے۔ اس مسئلے کے تصفیئے کے لئے کہ افغانستان میں کون حکمراں رہے کون نہ رہے دریائے سندھ کو عبور کرکے افغانستان میں ہمارا داخل ہونا ہمیشہ کے لئے ہماری فوج کو یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں کوچ کرنے رہنے پر مجبور رکھے گا"۔

لیکن لارڈ آکلینڈ اپنی دانست میں اس معاملے کو ونگٹن سے بھی بہتر سمجھتا تھا چنانچہ اس نے مجلس نظماء کی مجلس معاملات راز کو یہ لکھا کہ "شاہ ایران کے محاصرۂ ہرات اٹھادینے کی صحیح اطلاع ملنے پر میں نے اس منفید مطلب صورت حال پیدا ہوجانے کے باوجود ان تدابیر پر قائم رہنے کا مصمم ارادہ بالا علان ظاہر کیا جنکی تکمیل ہندوستان کی مغربی سرحد پر ہمیشہ امن قائم رکھنے اور اس سمت سے حملہ آوری کے منصوبوں کا دوامی سدباب کرنے کے لیئے کی گئی تھی"۔ اب شصت سالہ تجربے کی بنا پر ہم خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ڈیوک ونگٹن اور لارڈ آکلینڈ ان دونوں میں کون حق پر تھا اور افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے سے کیا ہم نے ایسے حملوں کا دوامی سدباب کردیا جو کچھ رکاوٹیں موجود تھیں ان تک کو باقی نہیں رکھا اور اب "اس ملک میں ہماری فوج یہاں سے وہاں وہاں سے یہاں کوچ پر لگی ہوئی ہے"۔

بہرحال یہ جنگ جاری رہی۔ انگریزوں کی فوج سندھ سے ہوکر افغانستان گئی کیونکہ رنجیت سنگھ نے اپنی پنجاب کی عملداری سے ہوکر گزرنے کی اس کو اجازت

نہیں دی تھی ۱۸۳۹ء میں قندھار فتح ہوگیا۔ جولائی میں غزنی پر چڑھائی کی گئی اور اگست میں فوج کابل پہنچ گئی۔ دوست محمد دریائے جیحوں کو عبور کرکے بخارا میں روپوش ہوگیا اور اس کی جگہ شاہ شجاع تخت نشین کیا گیا۔ اس پر نہ صرف انگلستان کے لوگ بھول گئے بلکہ جو کارکن اشخاص موقع پر موجود تھے انہوں نے بھی وہ لاف زنی کی کہ کسی انگریز مدبر یا نبرد آزما نے ایسی آج تک نہیں کی۔ غزنی کی فتح کے بعد سر جان کین نے لارڈ آکلینڈ کو لکھا کہ "اپنی پینتالیس سال کی ملازمت میں میں نے جس آب و تاب کے کارنامے چار دانگ عالم میں دیکھے ہیں۔ ان میں ایک یہ فتحیابی بھی ہے جو انگریزی فوج نے میرے تحت یہاں حاصل کی" اس کے علاوہ "سردار دوست محمد خان کے فرار ہو جانے اور ملک معظم شاہ شجاع الملک کے کابل میں اپنی رعایا کی تہنیت اور مبارکباد کے ساتھ داخل ہونے" کے متعلق لارڈ آکلینڈ نے بھی نظماء کی مجلس معاملات راز کو لکھا۔ اور خود ملک معظم شاہ شجاع الملک نے ملکۂ وکٹوریہ کو لکھا "میری خواہر شاہانہ کے دوست نواز احساسات سے مجھ کو اعتماد کلی ہے کہ میری دلی خواہشات پر ہر وقت نظر التفات یونہیں مبذول رہے گی"۔ شجاع الملک کی خواہش یہ تھی کہ درانی شاہنشہی کا ایک خاص تمغۂ اعزاز بنایا جائے اور درجۂ اوّل کا تمغہ لارڈ آکلینڈ، سر جان کین اور چند دیگر اشخاص کو عطا کیا جائے

پہلی جنگ افغانستان کے تاریخی واقعات کی تفصیل موجودہ کتاب کے مقصد سے باہر ہے۔ مدارس کی تاریخ ہند سے متعلق ہر نصابی کتاب میں اس جنگ کا بیان موجود ہے اور ایک صاف گو انگلو انڈین مورخ نے بھی زیادہ تفصیل اور صداقت کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ افغانیوں نے اپنے معاملات میں پردیسیوں کی مداخلت گوارا نہیں کی۔ شاہ شجاع کو جو حال حال میں امیر ہوا تھا اپنے کاروبار پر انگریزی سفیر کی نگرانی تلخ تھی۔ کابل کے ملاؤں نے شاہ شجاع کا خطبہ پڑھنے سے اس لیے انکار کر دیا کہ وہ ان کا خود مختار بادشاہ نہ تھا رفتہ رفتہ جب ہندوستانی خزانے کی بہتی گنگا میں وہ پہلی سی طغیانی نہ رہی تو قبائل کے سردار و سرخیل بھی کھلی دشمنی کرنے لگے ۱۸۴۱ء میں ۲ر نومبر کو کابل میں بغاوت شروع ہو گئی جس میں سر الگزانڈر برنس مارا گیا۔ ۲۳ر دسمبر کو مکناٹن

نامی انگریز سفیر کو دوست محمد خاں کے بیٹے اکبر خاں نے ایک عام بھری مجلس میں مار ڈالا۔ جنوری ۱۸۴۲ء میں انگریزوں کا لشکر جس میں چار ہزار سپاہی اور بارہ ہزار ہمراہیانِ لشکر تھے کابل سے پسپا ہونا شروع ہو گیا۔ اس پر مصائب پسپائی کے دوران میں کبھی مجادلہ ومحاربہ ہوا۔ اور کبھی صلح کے نامہ و پیام ہوتے رہے۔ اکبر خاں نے اور انگریزوں کو ان کے اہل وعیال کے ساتھ بطور یرغمال طلب کیا اور ہزیمت خوردہ افواج پر گولہ بارود برسانے کے لئے اس کی فوجیں غلزائی قبیلے کے ساتھ مل گئیں۔ انگریزوں کا سارا لشکر سپاہیوں اور ہمراہیوں کو ملا کر سولہ ہزار کی تعداد میں افغانیوں کی گولہ باری سے جانبر نہ ہو سکا۔ اور ان میں سے زخمی ہو کر جو لوگ بچ گئے وہ افغانستان کی برفباریوں میں سردی سے اکڑ کر مر گئے یا فاقہ کشی سے جانبر نہ ہو سکے۔ سارے لشکر میں ڈاکٹر برائیڈن اکیلا شخص تھا جو اپنی جان سلامت لے گیا۔ لارڈ آکلینڈ کے بعد لارڈ النبرو ۱۸۴۲ء میں گورنر جنرل ہند مقرر ہوا۔ اس اثنا میں انگلستان میں "جدت پسند گروہ" کے زوال پر "قدامت پسند حکومت" قائم ہو چکی تھی اور نئے وزرائے سلطنت اس پر مصائب اور ناعاقبت اندیش جنگ کے ذمہ دار نہ تھے اس لئے اگر وہ اس جنگ کا سب الزام اپنے پیشروؤں کے سر لگا دیتے تو بالکل حق بجانب ہوتے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے حق میں یہ انصاف کرنے کی ان سے توقع بھی تھی کہ وہ اس جنگ کے مصارف سے ہندوستان کو بالکل بری الذمہ کر دیں گے لیکن وزرائے برطانیہ کو خواہ وہ "جدت پسند گروہ" سے ہوں یا "قدامت پسند گروہ" سے ایک ناکامیاب جنگ کے مصارف کے لیے اپنے اپنے حلقہ ہائے انتخاب کے لوگوں کے سامنے ہاتھ پسارنا پسند نہ آیا۔ ادھر مجلس نظا نے اپنے دعاوی نہایت شدّ و مدّ کے ساتھ پیش کیے اور ادھر مجلس مالکان کمپنی نے بھی اسی شدّ و مدّ کے ساتھ ان کی تائید کی۔ اگرچہ اہل ہند کو یہ بڑی ناانصافی معلوم ہوتی تھی کہ ہندوستان کی سرحد سے باہر کی جنگ کے مصارف کے لیے ہندوستان پر مالی بار ڈالا جائے با ایں ہمہ سب انکار و اعتراض بے سود ثابت ہوئے۔ پہلی جنگ افغانستان کے مصارف ڈیڑھ کروڑ پونڈ ہوئے تھے اس تمام رقم کا بار ہندوستان کے محاصل پر ڈالا گیا اور برطانیہ عظمیٰ نے ایک حبہ بھی اس کا ادا نہیں کیا۔

فروری ۱۸۴۲ء کو لارڈ النبرو کلکتہ پہنچ گئے۔ النبرو میں ہندوستان کے نظم و نسق کا کام انجام دینے کی قابلیت تھی کیونکہ وہ ہندوستان کی مجلس نظم کی پیریذیڈنسی کا کام کر چکا تھا۔ اس نے زمانہ سابق میں ان تمام محصولات راہداری کے اٹھا دینے میں مدد دی تھی جو ہندوستان کی تجارت داخلہ کے سنگ راہ تھے اور اس مجلس منتخبہ کی میر مجلسی بھی کی تھی جس کو دار الامرائے ہندوستان کی عام پیداوار اور مصنوعات کے مسئلے پر تحقیقات کرنے کی غرض سے مقرر کیا تھا لیکن ایسے شخص کے لیے ہندوستان پہنچنے کے ساتھ ہی دوسرے سب کام چھوڑ کر صرف افغانی معاملات پر فوری توجہ کرنا اس وقت بالکل ناگزیر بن گیا تھا۔

جون ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ وفات پا چکا تھا اور اس وقت پنجاب سے ہو کر انگریزی فوج کے کوچ کرنے کا کوئی مزاحم نہیں رہا تھا۔ کمک کے لئے جنرل پولک پنجاب ہو کر گزرا اور جلال آباد سے غنیم نے محاصرہ اٹھا لیا۔ پولک نے اکبر خاں کو شکست دی اور ستمبر ۱۸۴۲ء میں کابل پر قابض ہو گیا۔ کابل کا بڑا بازار جس کا ایشیا کی شاندار سے شاندار عمارتوں میں شمار ہے باروت سے اڑا دیا گیا اور فتح کے جوش میں فوج نے رعایا پر بطور پاداش طرح طرح کی زیادتیاں بھی کیں۔

یکم اکتوبر ۱۸۴۲ء میں یعنے لارڈ آکلینڈ کے اعلان جنگ سے ٹھیک چار سال کے بعد آکلینڈ کے جانشین نے اعلان کیا کہ افغانستان سے افواج فاتح واپس طلب کر لیجائیں گی اس اعلان میں چند فقرے ایسے بھی ہیں جن کو کوئی ڈیوک ولنگٹن سا شخص ہی لکھ سکتا تھا اور جن کی کوئی لارڈ لارنس جیسا آدمی ہی تعمیل کرا سکتا تھا۔ یہ جملے ایسے ہیں جن کی صداقت ابد الآباد تک قایم رہے گی۔

"کسی فرماں روا کو ایسے لوگوں پر مسلط کرنا جو اس سے بالکل ناراض ہیں انگریزوں کی حکمت علمی اور اغراض کے خلاف ہے ورنہ اس کے یہ معنی ہوے کہ رعایا کا جنگی ساز و سامان اور راس المال نہ صرف ہر حملہ آور کی خدمت بجا لانے کے لئے وقف ہے بلکہ ایک ایسے فرماں روا کے تمام مصارف برداشت کرنے کے لئے بھی جس سے رشتۂ اتحاد پیدا کرنے میں رعایا کو کسی فائدے کی توقع ہی نہیں۔"

"گورنر جنرل ہند ہر ایسی حکومت کو تسلیم کر لے گا جو خود افغانیوں کی پسند کی

ہوئی ہو اور جو اطراف کی مملکتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کی نہ صرف خواہشمند ہو بلکہ قابل بھی ہو۔

دو حکومت ہند اپنے حدود شاہنشاہی پر جو فطرت کے قائم کیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں قانع رہے گی اور اپنی تمام کوشش عام طور پر امن قائم رکھنے میں اور خود مختار فرماں رواؤں یعنے اپنے حلیف کی حفاظت اور خود اپنی وفادار عقیدت کیش رعایا کی فلاح و بہبود و خوش حالی میں صرف کرے گی"

یہ دانشمندانہ اور مدبرانہ الفاظ تھے لیکن لارڈ النبرو کے نظم ونسق پر یہ داغ لگ گیا کہ اس نے اتنا لکھنے کے بعد ہی ایک کمزور اور ہمسایہ ریاست کے ساتھ ان اصول کے مغائر دوسری قسم کی حکمت عملی اختیار کی۔ یاد ہو گا کہ امیران سندھ نے ۱۸۳۹ء میں انگریزوں کی فوج کو کابل جاتے ہوئے اپنے ملک سے گزرنے کی اجازت دی تھی بس اس تاریخ سے سندھ کو بہ حیثیت مغربی ایشیا کے رہ گزر ہونے کے ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ انگریزوں کی فوج جب تک افغانستان پر قابض رہی اس وقت تک امیران سندھ نے حکومت ہند کی خوب مدد کی مگر افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کے باوجود جنگ افغانستان کے ختم ہوتے ہی حکومت ہند نے فوری اس ملک کا الحاق کر لیا۔

ایک زمانے سے میجر اوٹرم سندھ میں انگریزوں کا سیاسی وکیل رہا تھا اور اس کے خاصہ طبیعت کے موافق امیران سندھ کے ساتھ اس کا برتاؤ لطف آمیز مشفقانہ اور اس کے ساتھ ساتھ موقع و ضرورت کے لحاظ سے قوت و استقلال سے کام لینے میں بھی وہ کبھی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ اکتوبر ۱۸۴۲ء میں اعلیٰ اختیارات اوٹرم سے چھین کر سر چارلس نے پیر کو تفویض کیے گئے تھے۔ پیر ایک بہادر اور ممتاز سپاہی تو تھا مگر ساتھ ہی ساتھ مغرور خود رائے اور تند مزاج واقع ہوا تھا اور اسی وجہ سے ہندوستان کے والیان ریاست کے ساتھ سیاسی روابط قائم رکھنے کی غرض سے اس کا انتخاب بہت ہی ناموزوں تھا۔[۱]

---

[۱] ۱۸۱۰ء عیسوی میں نے پیر کفیلونیہ کا گورنر مقرر ہوا تھا لیکن ہر ایک سے لڑنا جھگڑنا اس کا شیوہ تھا (صفحہ آئندہ)

نے پیرے ایسی سُنی سنائی باتوں کو باور کر لیا کہ بعض امیران سندھ انگریزوں کی حکومت سے بدظن اور بددل ہیں اور اس بنا پر اس نے امیران سندھ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جنگ میانی اور جنگ حیدرآباد ان دونوں لڑائیوں میں ۱۸۴۳ء کے فروری اور مارچ میں امیران سندھ کو شکست ہوئی اور لارڈ النبرو نے جسکو مشرق میں صلح و اتحاد پیدا کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا سندھ کے الحاق کا حکم صادر کر دیا۔

ایک دوستانہ ریاست پر ایسے الزام لگا کر جو کبھی ثابت ہی نہ ہو سکے اس ملک کے الحاق کو جائز بنانے کی کوشش میں آج تک کسی جانبدار مورخ نے اپنی تضییع اوقات نہیں کی۔ مجلس نظما کی تعریف کی بات ہے کہ اگست ۱۸۴۳ء میں اس نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ امیران سندھ کے خلاف جو کارروائی کی گئی تھی وہ نہ صرف انصاف اور زمانہ شناسی بلکہ حکومت ہند کے اغراض اور نیک نامی کے بھی خلاف تھی۔ اغلب یہ ہے کہ سندھ کے متعلق لارڈ النبرو کا یہ اقدام ٹوری گروہ کی وزارت کے ایما سے ہوا ہو جیسا افغانستان کے معاملے میں وہگ وزرا کے ایما سے لارڈ آکلینڈ نے کیا تھا مجلس نظما ہر شخص کو واپس طلب کر لینے کی مجاز تھی چنانچہ اس نے ٹوری وزرا کے علانیہ اعتراضات کے باوجود ۱۸۴۴ء میں جب لارڈ النبرو کے دو ہی سال نظم و نسق میں گزرے تھے اُسے واپس طلب کر لیا۔

سندھ کے الحاق کے متعلق ایک اور واقعہ تاریخی نقطۂ نظر سے نہ سہی تو ادبی نقطۂ نظر سے ضرور دلچسپ ہے۔ سر چارلس نے پیر فاتح سندھ کا ایک چھوٹا بھائی ولیم نے پیر نامی تھا جو صاحب سیف و قلم ہونے کی حیثیت سے ایک خاص امتیاز رکھتا تھا یہ ڈیوک ونگٹن کی سرکردگی میں پینسیولر جنگ میں شریک رہا تھا چنانچہ اس جنگ کی تاریخ بھی اس نے لکھی تھی جو انگریزی زبان میں تا حال ایک مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ایسا بہادر سپاہی اور ممتاز مورخ اپنے بھائی اور میجر اوٹرم کے جھگڑوں میں پھنس گیا۔ اس پینسیولر جنگ کی تاریخ کے مولف نے ۱۸۴۵ء میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱) اس کی طبیعت میں داخل تھا اسی بنا پر حکام وطن کے ساتھ اس نے لڑائی مول لی۔ سندھ کی فتح کے بعد برطانوی حکام سے سخت لڑائی شروع کر دی۔ زمانہ مابعد میں یہ پھر ہندوستان آیا اور سپہ سالار مقرر ہوا لیکن اس وقت بھی لارڈ ڈلہوزی سے جھگڑا کر لیا اور بالآخر ۱۸۵۱ء میں ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے رخصت ہوا۔

"فتح سندھ" پر اسی نام کی ایک کتاب شائع کی۔ اس اشاعت میں صرف اپنے بھائی
کو بری الذمہ ثابت کرنے پر قناعت نہ کر کے اس نے میجر اوٹرم پر یہ الزام لگایا کہ وہ
جنگی قابلیت نہ رکھتا تھا اور یہ کہ اوٹرم نے اس حکمت عملی کی بھی مخالفت کی تھی
جس سے ہندوستان کی تمدنی ترقی مقصود تھی مزید یہ کہ اس نے ایسی تدابیر اختیار
کرنے کی رائے دی تھی جو اگر اختیار کر لی جاتیں تو انگریزوں کی افواج کا قلع قمع ہو
ہو جاتا۔ ان دونوں بھائیوں نے جن کے جنگی اور ادبی کارناموں کی شہرت عام
تھی اس بات کی کوشش کی کہ اپنی اپنی شخصیت کے متحدہ اثر سے ایک گمنام سپاہی
پیشہ نوجوان آدمی کو دبوچ لیں، مگر آنے والی نسلوں کی انصاف پسندی کی یہ بھی ایک مثال ہے
جو وہ کبھی کبھی سچے اور با عزت اشخاص کے حق میں دکھاتی ہیں کہ جیمز اوٹرم کو ان بار بار
حملوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ اس زمانے میں بھی بہ مقابل فاتح سندھ کے اوٹرم
کی شہرت ہندوستان میں زیادہ بلند پایہ ہے۔ اس نے ولیم نے پیپیر کی تالیف کا اپنے
ہی سادہ طرز تحریر میں جو جواب دیا ہے اس کو اب بھی اکثر لوگ پڑھتے ہیں
درآنحالیکہ ولیم نیپیر کی جانبدارانہ کتاب کسی کو یاد بھی نہیں۔ اوٹرم کی کارگزاری کی
ابھی ابتدا ہی تھی کہ اس نے غربا پروری سے اور بیکسوں کے ساتھ ہمدردی دکھا کر اپنے
اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا اور اسی وقت سے "بیرڈ ہند" کہلانے لگا۔ اس کے علاوہ
۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اس نے خاص امتیاز حاصل کیا اور اس کے بعد کے سال
میں اس کو "بیارونٹ" کا خطاب عطا ہوا اور جب ہندوستان کا نظم و نسق
ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج برطانیہ پر منتقل ہوا تو اوٹرم کو لارڈ کیننگ کی کونسل میں جو
پہلا وائسرائے مقرر ہوا تھا جگہ دی گئی۔

سندھ کے الحاق پر جو فیصلہ جیمز اوٹرم نے کیا ہے وہی فیصلہ مجلس نظماء
غیر جانبدار مورخوں کا بھی ہے۔ "اہم معاہدوں کی جن کو قبول کرنے پر امیران سندھ
کو مجبور کیا گیا تھا ردی کاغذ سے بڑھ کر وقعت نہ دی گئی۔ جب ہمارے
لئے بہت نازک زمانہ تھا تو اس وقت امیران سندھ نے ہم پر شفقت و مہربانی
کا اظہار اور ہمارے ساتھ دوستی کا اقرار کیا تھا مگر یہ سب کچھ اب نظر انداز کر دیا
گیا مزید براں متعدد جھوٹے الزام ان پر عائد کئے گئے حتیٰ کہ ان کے لئے بہر صورت

اپنا بچاؤ کرنا ناگزیر ہوگیا ۔ پھر کیا تھا ایک نامہربان اور بے وفا حلیف کی ناخدا ترس اور بے رحم تلواروں نے بالآخران کا خاتمہ ہی کر دیا ۔"

دوسرا باب

ہارڈنگ اور ڈلہوزی

موجودہ کتاب کا منشا فتوح و الحاقات کی سرگزشت بیان کرنا نہیں ہے آکلینڈ اور ڈلہوزی کے جنگ و جدل اور الحاقات جن پر ایسے شدید مباحث پیدا ہوتے رہے ہیں اس مولف کے لئے جس کا مقصد لوگوں کے صرف معاشی حالات کے بارے میں کچھ لکھنا ہو ایسے دلچسپ نہیں کہ ان کے متعلق خامہ فرسای کی جائے لیکن ہندوستان کی معاشی تاریخ نامکمل رہ جائے گی اگر جنگ و جدل کے مصارفِ کثیر اور الحاقات سے جو شاہنشاہی کی توسیع حدود ہوی ہے اُس کا کچھ نہ کچھ حوالہ نہ دیا جائے۔ اس لئے جیسا پچھلے باب میں آکلینڈ اور ایلنبرو کے عہد حکومت کے اہم واقعات ہم نے بیان کئے ہیں۔ اسی طرح اس باب میں ہارڈنگ اور ڈلہوزی کے نظم و نسق کے واقعات بھی ہم مختصراً بیان کیے دیتے ہیں۔

۱۸۴۴ء میں جب لارڈ ایلنبرو ہندوستان سے واپس طلب کر لیا گیا تو اس کا قایم مقام سر ہنری ہارڈنگ مقرر ہوا اور اس خدمت کے لئے اس سے بہتر انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔ ہارڈنگ ایک سپاہی پیشہ بہادر آدمی تھا اور سچے جانبازوں کی طرح صلح پسند طبیعت رکھتا تھا۔ پینینسولر جنگ میں نپولین کے لشکر کے مقابلے میں اس نے وہ داد شجاعت دی تھی کہ اپنے لیے خاص امتیاز پیدا کرالیا تھا کرنا کے میدان جنگ میں جہاں سر جان مور کو کاری زخم لگا تھا یہ بھی مور کے ساتھ

شانہ بشانہ کھڑا تھا۔ جنگ آلبیویرا میں جہاں گھمسان کا رن پڑا تھا یہ بھی شریک تھا اور وٹوریہ کے معرکے میں زخمی ہوا تھا۔ میدان واٹرلو میں بھی موجود تھا اور جنگ لیگنی میں مارشل بلوشر کے ہمراہیان خاص میں تھا موخرالذکر جنگ میں اس کا بایاں ہاتھ گولہ لگ کر ایسا چور چور ہو گیا تھا کہ آخر اس کو قطع کر دینا پڑا تھا۔

نپولین کی لڑائیوں کے اختتام پر ہارڈنگ پارلیمنٹ کا رکن جو منتخب ہوا تو بیس سال تک رہا۔ ۱۸۲۱ء میں لارڈ کاسلری کی بہن سے اس نے شادی کی اور ۱۸۲۸ء میں لارڈ پامرسٹن کی جگہ وزیر جنگ کی حیثیت سے کابینہ کا بھی رکن مقرر ہوا۔ وہ ہمیشہ "ٹوری" ہی رہا اور جب سر رابرٹ پیل وزیر اعظم دولت برطانیہ مقرر ہوا تو ۱۸۴۱ء میں یہ دوبارہ وزیر جنگ مقرر ہوا اور ۱۸۴۴ء تک اسی عہدہ پر ممتاز رہا۔ لارڈ النبرو کی قائمقامی کے لیے ہارڈنگ کا اس وقت انتخاب کیا گیا جب کہ اس کی عمر ساٹھ سال کی ہو چکی تھی۔ ہارڈنگ کی سی حیثیت کے ایک ممتاز وزیر سلطنت کے لئے یہ تقرر کچھ باعثِ امتیاز نہ تھا اور جب سر رابرٹ پیل نے اس کے دو سال بعد کسی موقع پر یہ کہا کہ "سر ہنری ہارڈنگ نے گورنر جنرل ہند کی خدمت قبول کرنے میں "خدمت عامہ بجالانے کی خاطر بڑے ایثار نفس سے کام لیا ہے" تو اس میں سرمو مبالغہ نہ تھا۔

کلکتہ آکر ہارڈنگ کو بمشکل اٹھارہ مہینے ہوئے تھے کہ خواہ مخواہ ایک جنگ اس کے سر پڑی۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ والی پنجاب نے وفات پائی۔ رنجیت سنگھ نے جو سکھوں کی فوج باشکوہ فراہم کی تھی وہ اس کے قابو سے نکلنے کے بعد آپے سے باہر ہو گئی۔ روما‌ئے قدیم کے "پریٹورین گارڈز" کی طرح یہ فوج موقع پاکر چھا گئی ہر دستے میں پنچایتیں قائم کی گئیں اور ان پنچایتوں کے سوا کسی اور کو یہ فوج مانتی ہی نہ تھی۔ حالت یہ تھی کہ سکھوں کی فوج جسکو چاہتی حاکم بنا لیتی اور جسکو چاہتی معزول کر دیتی تھی۔ انقلاب پر انقلاب ہو رہے تھے اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا خود رنجیت سنگھ کے سالے پر الزام لگائے گئے جس کی ان پنچایتوں نے تحقیقات کی اور ان کے فیصلے میں یہ الزام ثابت تھے۔ اس سپاہیوں کی ٹولی نے اس کو گولی مار دی نومبر ۱۸۴۵ء میں سکھوں کی اس فوج باشکوہ نے جو ساٹھ ہزار سپاہیوں اور چالیس ہزار

ہمراہیان لشکر پر مشتمل تھی اور جس کے ساتھ ۱۵۰ ضرب توپیں تھیں بغیر سوچے سمجھے
دریائے ستلج عبور کر کے انگریزوں کی علداری پر دھاوا کر دیا۔
سکھوں کا سپہ سالار لال سنگھ ایک غدار شخص تھا اور شاید وہ اپنی فوج کا
قلع قمع ہونا ہی چاہتا تھا۔ مدکی پر انگریزوں کے ساتھ جو پہلا مقابلہ ہوا تو یہ معرکہ ابھی
شروع نہیں ہوا تھا کہ لال سنگھ نے فرار پر کمر باندھی جس کے بعد ہی سکھوں کو شکست ہوئی
دوسرا معرکہ فیروز پور شہر میں ہوا جہاں گھمسان کا رن پڑا اس لڑائی کا ایک عینی شاہد کہتا
ہے کہ انگریزوں کی توپیں ارابوں سے نیچے اتار دی گئی تھیں اور ساتھ کے گولہ بارود
کو آگ بنا کر ہوا میں اڑا دیا گیا تھا۔ انگریزوں کے سواروں کے دستے حملہ کر کے آدھی
دور نہ بڑھے تھے کہ روک دیئے گئے۔ پلٹنوں پر پلٹنیں تاب مقاومت نہ لا کر پیچھے
ہٹ گئیں اور ان کی صفوں کا صفایا ہو گیا۔ دن ڈھلنے تک کچھ نہ ہوا البتہ غروب
آفتاب کے بعد سکھوں کے پڑاؤ کا کچھ حصہ یورش کر کے ان سے چھین لیا گیا۔ صبح
ہوئی تو لڑائی پھر شروع ہو گئی لیکن لال سنگھ کی بزدلی تھی یا غداری کہ اس کی فوج
پسپا ہونا شروع ہوئی۔ تیسری جنگ علیوال کے مقام پر ہوئی جس میں انگریزوں کا
لشکر فتحیاب ہوا لیکن قطعی فیصلہ کن جنگ جس کو کہہ سکتے ہیں وہ جنگ سابرایان
ہے جو ۱۰ فروری سنہ ۱۸۴۶ء میں ہوئی۔ اس لڑائی میں سکھوں نے غازیوں کی طرح
ثابت قدمی اور مجاہدین کی طرح شجاعت دکھائی۔ لیکن تیج سنگھ جو سکھوں پر کمان کر رہا
تھا پہلے ہی حملے پر فرار ہو گیا اور کہا جاتا تھا کہ سکھوں کو جان سلامت لیکر بھاگ جانے
کا موقع نہ دینے کے لیے تیج سنگھ نے ستلج کا پل بھی گرا دیا۔ انگریزوں کو پوری فتح تو
حاصل ہوئی مگر بہت جانوں کے نقصان کے ساتھ کیونکہ اس جنگ میں دو ہزار
سپاہیوں سے زیادہ قتل اور زخمی ہوئے۔ لارڈ ہارڈنگ کا بیٹا جو اس جنگ میں
شریک تھا کہتا ہے کہ فوج کی کثرت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا ان نبرد آزماؤں
سے گویا پاٹ دیا گیا ہے۔ دریا کے بالکل کنارہ پر توپ خانہ لگا دیا گیا جہاں سے وہ
گولہ باری ہوئی کہ خون کے نالے بہہ گئے۔ چند ہی جان بچا کر بھاگے ہوں تو ہوں
ورنہ کسی نے ہتھیار ڈالے نہیں۔ سکھوں نے اسی طور سے راضی برضا اپنے نوشتۂ تقدیر
کو تسلیم کر لیا جو ہمیشہ سے ان کی قوم کا خاصہ رہا ہے۔

فاتحین نے ایسے شرائط ان مفتوح سکھوں پر عاید کیئے جن سے فاتحین کی اعتدال پسندی کا ثبوت ملتا ہے۔ سکھوں کی ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے اس لیے کر دیے گئے کہ برطانوی شاہنشہی کے مقابلے کے لیے آیندہ کوئی بڑی طاقتور سلطنت باقی نہ رہے۔ لیکن لارڈ ہارڈنگ نے (جس کو اب امارت کا خطاب عطا ہوا تھا) ان شرائط کے باوجود پنجاب کی خود مختاری کو ہر طرح ملحوظ رکھا۔ مارچ ۱۸۴۶ء کے صلحنامے کی رو سے سکھوں نے پنجاب کے مغربی حصے سے جو بیاس اور ستلج کے دوآبے میں واقع تھا دست برداری اختیار کر لی۔ پندرہ لاکھ پونڈ انگلسیہ یا اس کے مساوی الحاصل اراضی دینے کا وعدہ کر لیا اور فوج میں تخفیف کر کے صرف پیادوں کی پچیس پلٹنیں اور بارہ ہزار سواروں کا رسالہ رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ سب توپیں انگریزوں کو دینا قبول کر لیا جن سے انگریزوں کے لشکر پر گولہ باری کی گئی تھی۔ جب سکھوں نے مقررہ رقم ادا نہیں کی تو ان بقیہ مقبوضات کا ایک اور حصہ انگریزوں کو تفویض کرنا پڑا۔ اس طرح کشمیر کی ریاست پنجاب سے علیحدہ کر لی گئی اور گلاب سنگھ کو ساڑھے سات لاکھ پونڈ معاوضے پر دیدی گئی۔

اس صلح سے بھی جو مارچ ۱۸۴۶ء میں کی گئی پنجاب میں امن قائم نہ رہ سکا۔ سکھوں کی خواہش یہ تھی کہ تحفظ حکومت کے لیے انگریزوں کی فوج لاہور میں مقیم رہے۔ اس لیے دسمبر ۱۸۴۶ء میں ایک اور صلح نامہ ہوا جس کو صلح نامہ لاہور کہتے ہیں۔ رنجیت سنگھ کی بیوہ کو جو ایک لائق مگر سازشی عورت تھی سب اختیارات سے بے دخل کر کے پندرہ ہزار پونڈ وظیفہ اس کے لیے مقرر کر دیا گیا۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ کی کمسنی میں سکھوں کے آٹھ سرداروں کی ایک نیابتی مجلس وزرا مقرر کی گئی اور ریاست کی رہنمائی اور نگرانی کے لیے ایک انگریز رزیڈنٹ کا تقرر عمل میں آیا جس کو غیر محدود اور مکمل اختیارات دے دیے گئے۔ مہاراجہ کے بلوغ تک پنجاب کے قلعوں میں انگریزی فوج مقرر کی گئی اور یہ طے پایا کہ انگریزوں کی حکومت کو اس فوج کے مصارف کے لیے دو لاکھ بیس ہزار پونڈ سالانہ سکھوں کو دینا ہوگا۔

صلح نامہ ہونے کے پانچ دن کے بعد گورنر جنرل نے مجلس معاملات راز کو لکھا کہ "ان شرائط سے مہاراجہ کی کمسنی میں انگریز رزیڈنٹ کو اندرونی نظم ونسق

اور بیرونی تعلقات میں غیر محدود اقتدار مل گیا ہے"۔ لارڈ ہارڈنگ نے ۲۰ اگست ۱۸۴۷ء میں ایک عام اعلان شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ "نوجوان راج کمار کی تعلیم وتربیت اور تحفظ جان و مال میں اس کو (لارڈ ہارڈنگ کو) ایسی ہی دلچسپی ہے جیسی ایک باپ کو اپنے بیٹے کے ساتھ ہوتی ہے"۔

میجر ہنری لارنس پہلا رزیڈنٹ مقرر ہوا یہ ایک دلیر ملنسار اور بااخلاق شخص تھا۔ ممکن تھا کہ اگر لارڈ ہارڈنگ اور پانچ سال ہندوستان میں رہتا اور ہنری لارنس بھی اسی مدت کے لیے اپنی خدمت پر بحال رہتا تو پنجاب بھی ایک طاقتور متمدن اور اور دوستانہ خیالات رکھنے والی ریاست بنی رہتی لیکن اعلان عام سے چھ ماہ کے اندر اندر زمام حکومت لارڈ ہارڈنگ سے لارڈ ڈلہوزی کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ میجر ہنری لارنس بھی اپنی صحت کی خاطر ہندوستان کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوگیا اور اس کا قائم مقام سر فریڈرک کری مقرر ہوا۔

لارڈ ڈلہوزی امرائے اسکاٹلینڈ کے طبقے کا ایک نوجوان شخص تھا جس کو ۱۸۳۸ء میں "ارل" کا اعزاز ارثاً ملا تھا۔ ملبرن کی قائم کردہ وزارت کی میعاد جب ختم ہوئی تو سر رابرٹ پیل وزیر اعظم ہوا اور اس نے ۱۸۴۳ء میں لارڈ ڈلہوزی کو مجلس تجارت کا نائب میر مجلس مقرر کیا۔ اس وقت گلیڈسٹن اس کا میر مجلس تھا۔ اس کے دو سال بعد یہ نوجوان "ارل" گلیڈسٹن کی جگہ میر مجلس ہوگیا۔ اس حیثیت سے لارڈ ڈلہوزی کو نئی ریلوں کے مسئلہ کا تصفیہ کرنا تھا۔ یہ بات خاص اہمیت رکھتی ہے کہ ڈلہوزی ہی نے وزیر اعظم کے پاس ان ریلوں کو قوم کی ملک بنا دینے اور اور ان کو بالکل مملکت کی زیر نگرانی رکھنے کی تجویز پیش کی تھی۔ سر رابرٹ پیل نے انگلستان کے لیے ان ریلوں کے زیر انتظام مملکت ہونے کو نامنظور کیا اور بجا کیا۔

لارڈ جان رسل اس نوجوان محنتی اور جفاکش امیر کے متعلق اچھی رائے رکھتا تھا۔ جب جدت پسند گروہ کی وزارت قائم ہوئی تو لارڈ جان نے شرافت و فیاضی سے گورنر جنرل ہند کی خدمت اس "ٹوری" امیر کے لیے تجویز کی۔ لارڈ ڈلہوزی نے اسے قبول کر لیا اور اپنی نوجوانی ہی میں جبکہ اس کی عمر پینتیس ۳۵ سال کی تھی ۱۸۴۸ء لارڈ ہارڈنگ جیسے جہاندیدہ و تجربہ کار شخص سے جائزۂ خدمت حاصل کیا۔

لارڈ ہارڈنگ نے پنجاب میں امن اور اچھا انتظام مملکت قائم رکھنے کے لیے ہر ممکنہ احتیاط سے کام لیا تھا۔ ایک انگریز رزیڈنٹ کو "کامل اختیارات کے ساتھ اس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہر محکمے کے فرائض پر نگرانی رکھے اور ان کی رہبری کرے"۔ انگریزوں کی کچھ فوج لاہور میں متعین تھی کہ "وہ مہاراجہ کی حفاظت جان ومال کرے اور ملک میں امن قایم رکھے"۔ انگریزی حکومت اس کی مجاز تھی کہ "وہ پایہ تخت کی حفاظت اور امن وامان قائم رکھنے کے لیے جس قلعہ یا جنگ کے کارآمد موقع اور مقام پر چاہے قابض ہو" لاہور کی ریاست انگریزی حکومت کو سالانہ دو لاکھ بیس ہزار پونڈ اس غرض سے دینے پر مجبور تھی کہ اس رقم سے "اس فوج کے مصارف اور انگریزی حکومت کے سابقہ مصارف ادا ہوتے رہیں"۔ یہ انتظام مہاراجہ کی صغر سنی میں جاری رکھا گیا تھا اور "جب ہز ہائینس ۱۶ سال کی عمر کو پہنچ جائیں یعنے ۴ ستمبر ۱۸۵۴ء میں یہ انتظام مسدود وموقوف ہو جائیگا"۔

مہاراجہ دلیپ سنگھ درحقیقت انگریزی حکومت کی ولایت وسرپرستی میں تھا اور انگریزی حکومت نے اس کا تحفظ جان ومال اس کے ملک کے نظم ونسق پر نگرانی اور وہاں امن کا قائم رکھنا اپنے ذمّے لے لیا تھا۔ لارڈ ہارڈنگ نے انگریزی حکومت کے ان مشکل فرائض کی انجام دہی کے لیے مناسب تدابیر اختیار کی تھیں۔ پچاس ہزار کا لشکر ساٹھ ضرب توپ کے ساتھ ستلج کے رخ پر نگاہ رکھنے پر مامور تھا۔ نو ہزار سپاہیوں کی لشکرگاہ لاہور کی حفاظت کے لیے وہاں قائم تھی۔ اسی قدر تعداد میں ایک اور لشکر نے جس میں پیدل۔ رسالے اور توپ خانہ بھی تھا فیروزپور میں اپنی لشکرگاہ بنالی تھی۔ غرض ناگہانی حادثات سے نبٹنے کا تمام سامان تیار تھا۔

ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے لارڈ ہارڈنگ کی مراجعت سے کچھ دنوں بعد جب ہنگامے کی صورت پیدا ہوئی تو اس کے انسداد کے لئے بر وقت کچھ نہ کیا گیا۔ دیوان ملراج کے باپ نے بیس سال تک ملتان پر ایک طرح کی خودمختارانہ حکومت کی تھی اور جب انگریز رزیڈنٹ نے ملراج سے حسابات طلب کیے تو اس نے مختلف طریقوں سے اس میں تعویق پیدا کی اور خدمت سے مستعفی ہونے کے

کے حیلے حوالے کرتا رہا۔ ختم حجت کے لیے اس کا استعفا قبول کرکے ایک شخص اس کا جانشین مقرر کیا گیا جس کو دو انگریزوں یعنے ونیس اگینو اور کرنل ہنڈرسن کی حفاظت میں ملتان پہنچنے پر پہلے تو قلعۂ ملتان انگریزوں کے قبضے میں دیدیا گیا لیکن اس کے بعد ہی اگینو اور ہنڈرسن کو دہوکے سے قتل کر دیا گیا۔ پھر ملراج نے دوبارہ قلعہ حاصل کرکے اس پر اپنا قبضہ جمالیا۔ انگریزی رزیڈنٹ سر فریڈرک کری نے سپہ سالار ہند لارڈ گوف کو طلب کیا کہ وہ انگریزوں کا لشکر لے کر اس بغاوت کے فرو کرنے کے لیے فیروزپور پر چڑھائی کرے لیکن لارڈ گوف نے صاف انکار کر دیا۔ اور لارڈ ڈلہوزی نے لارڈ گوف کی تائید کی۔ اس طرح باغیوں کو بغاوت پھیلانے کی مہلت مل گئی۔

ایک انگریز افسر نے اپنا فریضہ بروقت اور بہت عمدگی کے ساتھ انجام دیا۔ اس کا نام ایڈورڈ تھا اور یہ فوج میں لفٹیننٹ تھا۔ لفٹیننٹ ایڈورڈ دریائے سندھ کے کنارے اپنے خیمے میں بیٹھا ہوا تھا کہ انگریز افسروں کے قتل ہونے اور ملراج کی بغاوت کی اس کو خبر پہنچی۔ اپنے چار سو سپاہیوں کے ساتھ اس نے ملتان پر دھاوا کیا لیکن ملراج کے چار ہزار سپاہیوں اور آٹھ بڑی بڑی توپوں کے مقابلے میں جو قلعے میں مدافعت غنیم کے لیے بالکل تیار تھیں اڈورڈ سے کچھ نہ ہو سکا۔ گرما کی تپش کے باوجود اس نے وہیں اپنے قدم گاڑ دیے اور ایک انگریز افسر سے جو بھی ممکن تھا اس نے وہ سب کچھ کیا۔ بھاولپور کی ریاست سے فوجیں جمع کیں جون اور جولائی میں ملراج کو دو دفعہ شکست دی حتیٰ کہ ملراج کو قلعے میں پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اگر حکام صدر اس وقت لاہور اور فیروزپور سے کمک بھیج دیتے جیسا دسمبر ۱۸۴۶ء کے صلح نامے کی رو سے ان پر لازم تھا تو پھر ملتان کی شورش فرو ہو سکتی تھی اور خود لفٹیننٹ اڈورڈ کے الفاظ میں "اگر ملتان کی شورش فرو ہوتی تو پھر سکھوں کی بغاوت کا یہ پیش خیمہ نہیں بن سکتی تھی۔"

اس مقامی شورش کو فرو کرنے کے لیے بروقت کچھ بھی نہیں کیا گیا برخلاف اس کے انگریز رزیڈنٹ نے ایسی تدابیر اختیار کیں جن سے سکھوں میں ایک عام بے چینی پھیل گئی۔ رنجیت سنگھ کی بیوہ جو مہاراجہ دلیپ سنگھ کی حقیقی ماں ہوتی تھی ایک

سازشی عورت تھی لیکن اس سے اب کچھ خطرہ نہ تھا کیونکہ اس کو حکومت میں کسی قسم کا حصہ لینے سے محروم کر کے شیخو پور بھیجدیا گیا تھا لفٹینٹ اڈورڈ کے قول کے مطابق "رانی جھانڈا جس میں اپنی قوم کے مردوں سے بھی زیادہ جراءت و ذکاوت تھی مبہم آوازے کسنے اور لوگوں کو برانگیختہ کرنے والے خطوط لکھنے سے اُکتا گئی تھی ...... اور اس وقت پنجاب میں کوئی ایسا سورما نہ تھا جو اس کے حکم پر تلوار لیکر اٹھ کھڑا ہوتا۔"

ان حالات میں پنجاب سے بنارس کو اس رانی کی جلاوطنی کا جو حکم رزیڈنٹ نے دیا اس کی کچھ ایسی ضرورت تو نہیں تھی لیکن سکھوں پر اس حکم کا فوری برا اثر ہوا۔ ۲۵ مئی کو رزیڈنٹ نے یہ لکھا کہ " راجہ شیر سنگھ کے پڑاؤ سے خبریں آ رہی ہیں کہ مہارانی کے نقل مکان کی کیفیت سن کر سپاہیان خالصہ نے بالکل ہمت ہار دی اور یہ کہنے لگے کہ مہارانی خالصہ سکھوں کی ماں کی جگہ تھی اور جب وہ خود چلی گئی اور صغیر سن دلیپ سنگھ ہمارے (یعنی انگریزوں کے) ہاتھ میں ہے تو پھر وہ اب کس کے لیے لڑیں یا کس کی حمایت کریں۔"

مہاراجہ کے بیاہ میں التوا کرنے کی جو تدبیر اختیار کی گئی اس کا بھی اچھا اثر نہ ہوا لفٹینٹ اڈورڈ نے اس کو اچھی طرح محسوس کیا اور ۲۰ جولائی کو اس نے رزیڈنٹ کو یہ لکھا کہ " یہ خبر عام طور پر پھیلی ہوئی ہے اور بدخواہوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سکھوں کی فوج کی سرکشی اور حال حال کے فتنہ و فساد کے الزام لگا کر انگریز پنجاب کی ریاست ہی ضبط کر لینا چاہتے ہیں ...... میری دانست میں اس وقت فوراً انگریزوں کے سابقہ عہد و پیمان اور صلح نامے کے شرائط کی پابندی کی بالا علان اس طرح تجدید کرنا نہایت دانشمندانہ اور بروقت ہوگا کہ سرکاری طور پر مہاراجہ کے بیاہ کی تیاریاں شروع کر دی جائیں۔ اس سے لوگوں کو بہت کچھ اطمینانِ قلب حاصل ہو جائے گا۔" افسوس ہے کہ اس عاقلانہ مشورے پر کسی نے دھیان نہیں کیا۔

اس کے علاوہ سردار چتر سنگھ کے ساتھ جس کی بیٹی مہاراجہ دلیپ سنگھ سے منسوب تھی ایسا برتاؤ کیا گیا کہ اس پر لوگ اور برانگیختہ خاطر ہو گئے۔ چتر سنگھ صوبہ ہزارہ کا صوبہ دار تھا اور اس صوبے کی سب آبادی مسلمان تھی ان لوگوں کا پیشہ سپہگری تھا اور سب کے پاس ہتھیار موجود تھے اور ان پر نگرانی رکھنا بہت مشکل تھا۔

کپتان ایبٹ کو جو رزیڈنٹ کا ایک مددگار تھا چتر اسنگھ کو صلاح و مشورہ اور مدد دینے پر مقرر کیا گیا لیکن شروع ہی سے یہ شخص اس سردار کی علانیہ مخالفت کرنے لگا تھا۔ اگست ۱۸۴۸ء میں ہزارہ قبیلے کے کوہی باشندوں نے ایبٹ سے برگشتہ خاطر ہو کر سب درّوں کی راہیں بند کر دیں اور شہر کا محاصرہ کر لیا جہاں چتر اسنگھ مقیم تھا۔ سردار نے احشام قلعہ کو جو شہر کی حفاظت پر مامور تھے حکم دیا کہ قلعے سے نکل کر اپنی توپوں کی زد کے اندر ہی خیمے ڈالیں لیکن کرنل کنورا نے فصیل شہر سے باہر قدم رکھنے سے صاف انکار کر دیا اور یہ دھمکی دی کہ پہلا جو شخص اس کے نزدیک آئے گا، گولیوں سے اڑا دیا جائے گا۔ چتر سنگھ نے سکھ پیادوں کے دو دستے توپوں پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجے۔ کنورا نے توپ کو فتیلہ دکھایا مگر توپ چلی نہیں اور اسی وقت غنیم کی گولیوں سے وہ مارا گیا۔ کپتان ایبٹ نے اس واقعے کو کنورا کا قتل عمد اور چتر اسنگھ کو اس کا محرک و بانی قرار دیا۔ اس پر رزیڈنٹ نے ایبٹ کی سرزنش کی اور لکھا کہ "میں نے آپ کو فوجیں جمع کرنے اور جمعیت کو نوکر رکھنے کا مجاز نہیں کیا تھا...... میری دانست میں یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ نے ہمیشہ صوبہ دار (چتر اسنگھ) کو اپنے سے دور ہی رکھا اور اس نے جب کبھی آپ کے قرب و جوار میں سکونت اختیار کر لے کی خواہش یا ارادہ ظاہر کیا تو آپ اس سے انکار ہی کرتے رہے...... جتنی کیفیتیں اب تک پیش ہوی ہیں ان سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کنندان کنورا کی موت کو قتل عمد سے آپ کا تعبیر کرنا درست ہے یا یہ کہ چتر اسنگھ نے پیش از پیش اس کا تہیہ کر لیا تھا جیسا آپ کا غلط دعوٰے ہے"۔ باوجود ان تمام باتوں کے اگست میں کپتان ایبٹ کی سزا کے احکام صادر نہیں کیے گئے بلکہ اُلٹا یہ حکم ہوا کہ سردار چتر اسنگھ صوبہ داری سے معزول کر دیے جائیں اور ان کی جاگیر خالصہ کر لی جائے اس طرح سکھوں کی تمام قوم کے سامنے اس شخص کی تذلیل کی گئی جس کی بیٹی سکھوں کے فرماں روا کے ساتھ منسوب تھی اور جو قریب میں سکھوں کی مہارانی ہونے والی تھی ان تمام کو ناعاقبت اندیشانہ و خلاف مصلحت حرکتوں پر سکھوں کی قوم کو طیش آ گیا ملتان میں بغاوت پھیلنے لگی۔ چتر اسنگھ کا بیٹا شیر سنگھ پانچ ہزار کے لشکر کے ساتھ ملراج سے جا کر مل گیا۔ اس پر انگریزوں کے لیے ملتان کا محاصرہ اٹھا لینا ناگزیر ہو گیا۔ سکھوں کے تقریباً سب سردار

بغاوت میں شریک ہو گئے اور آبادی کے باہر سب کھلے میدان جنگل پہاڑ وغیرہ باغیوں ہی کے زیر قبضہ تھے۔

بغاوت ملتان شروع ہونے کے کہیں سات ماہ کے بعد نومبر ۱۸۴۸ء میں لارڈ گوف اپنے لشکر کو لیکر بڑھا۔ پہلا معرکہ چناب کے کنارے رام نگر میں ہوا جس میں انگریزوں کے لشکر کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ دوسرا معرکہ سعداللہ پور میں ہوا جس کو بہ مشکل انگریزوں کی فتح کہا جا سکتا ہے۔ تیسرا معرکہ چلین والا کے مقام پر ہوا اور یہ انگریزوں کے حق میں بہت برا ثابت ہوا۔ انگریزوں کی پیادہ جمعیت نے اس وقت دھاوا کیا جبکہ وہ بے دم سی تھی اور سب کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس لیے حملہ کارگر نہ ہوا۔ اور ان کو پسپا ہونا پڑا۔ انگریزوں کا رسالہ اپنی توپوں کی مدد کے بغیر ان کی زد سے باہر آگے بڑھا چلا گیا پھر اس رسالے کو ایسی ہزیمت اٹھانی پڑی کہ لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے۔ سکھوں نے تین رجمنٹوں کے علم اور چار توپیں چھین لیں۔ اس طرح بغیر سوچے سمجھے حملے کر دینے سے ۸۹ افسر اور ۲۳۵۰ سپاہی کام آئے۔ لارڈ ڈلہوزی نے اپنے سرکاری مراسلوں میں اس معرکے کو بھی انگریزوں کی فتح بتایا ہے لیکن اپنے غیر سرکاری خطوط میں اس نے یکے بعد دیگرے "ان تین ناکام معرکوں پر اظہار افسوس کیا ہے جو رام نگر سعداللہ پورا اور چلین والا کے مقام پر ہوئے تھے"۔

چلین والا کے معرکے کی خبر جب انگلستان پہنچی تو وہاں لوگوں کے طیش کی انتہا نہ رہی۔ لارڈ گوف فوراً واپس طلب کر لیا گیا اور اس کی جگہ سر چارلس نے پیر کو سپہ سالار ہند مقرر کر کے بھیجا گیا۔ نے پیر کے ہندوستان آنے سے پہلے ۲۰ رفروری ۱۸۴۹ء میں لارڈ گوف نے گجرات میں ایک فیصلہ کن فتح سے اپنے دامن کا دھبہ دھونے کی کوشش کی۔ جنوری میں ملتان پر انگریزوں کا قبضہ تو ہو ہی چکا تھا۔ گجرات کی اس فتح کے بعد گلبرٹ نے جس کو "ہندوستان بھر میں بہترین سوار" کہا جاتا تھا مغرور سکھوں کی فوج کا پنجاب کے میدانوں میں تعاقب کیا اور ۱۲ مارچ کو راولپنڈی میں جا کر سکھوں نے ہار مان لی اور ہتھیار ڈال دیے۔ ملتان میں اس ہنگامے کے شروع ہونے کے ایک سال بعد پھر امن قائم ہوا۔

دسمبر ۱۸۴۶ء کے صلحنامے کی رو سے انگریزی حکومت نے پنجاب میں بغاوتوں

کے فرو کرنے اور کمسن مہاراجہ دلیپ سنگھ کے تحفظ جان و مال کا ذمہ لیا تھا اور نومبر سنہ ۱۸۴۸ء
کے اعلان عام میں جو لارڈ ڈلہوزی کی منظوری سے ہوا تھا یہ ظاہر کیا تھا کہ "انگریزوں
کی فوج کا لاہور میں داخلہ موجودہ حکومت کی بیخ کنی اور مخاصمت کے لیے نہیں بلکہ
محض امن قایم کرنے اور لوگوں کو حکومت کا مطیع و منقاد بنانے کی غرض سے ہوا تھا۔"
با ایں ہمہ جب فتنہ و فساد فرو ہو گیا تو سکھوں کی حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔
مہاراجہ کو معزول کر کے پنجاب کا الحاق انگریزوں کی قلمرو کے ساتھ کر لیا گیا۔ سر ہنری لارنس
نے جس کو دسمبر سنہ ۱۸۴۶ء کے صلح نامے کے بعد پہلا رزیڈنٹ مقرر کیا گیا تھا اس
الحاق پر سخت اعتراضات کیے اور اپنا استعفیٰ بھی پیش کر دیا۔ لیکن لارڈ ڈلہوزی
لارنس کی قدر و قیمت سے بہ حیثیت ایک اچھے صلح کار ہونے کے خوب واقف تھا۔ اس
نے منت سماجت کر کے لارنس کو اپنا استعفیٰ واپس لے لینے پر آمادہ کیا۔ اسی لارنس کی
خداداد قابلیت اور سپہگری کے جوہر ہم پنجاب کے نظم و نسق کے سلسلے میں آیندہ اور
بھی بیان کریں گے۔

اس کے تین سال بعد لارڈ ڈلہوزی نے شاہنشاہی ہند کی مشرقی سرحد پر ایک
اور جنگ شروع کر دی۔ برما میں یانڈوبو کے صلح نامے کے خلاف پردیسی
تاجروں پر مختلف محصولات لگائے گئے تھے اور اہل برما کے ساتھ بیوپار کرنے
میں بڑے بڑے خطرات اور مشکلات کا سامنا تھا۔ اس لیے سنہ ۱۸۴۰ء سے
انگریزی حکومت نے اپنی طرف سے کسی مختار عام کا دربار آوا کو بھیجنا موقوف کر دیا
تھا۔ ۲۷ ستمبر سنہ ۱۸۵۱ء میں رنگون کے انگریز تاجروں نے چند شکایتیں لارڈ ڈلہوزی
کے پاس کیں۔ لارڈ ڈلہوزی تو ایسی شکایتوں کو کان لگا کر سننے کے لیے پہلے ہی سے
تیار بیٹھا تھا۔ اس نے فوراً ایک بحری افسر کو ان شکایتوں کی تحقیقات پر مامور
کر دیا۔ اس کے بعد ان تاجروں کے نقصان کی تلافی کے لیے اس نے ۹۰۰ پونڈ
بطور تاوان مانگے اور رنگون کے برمی گورنر کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ اس کے ایک
سال قبل اسی قسم کے مطالبات پامرسٹن نے حکومت یونان کے سامنے پیش کیے تھے
کہ جزیرۂ مالٹا میں رہنے والے ایک یہودی کے نقصان کی تلافی ہو۔ مگر لارڈ ڈلہوزی
کے مطالبات کی تعمیل نہیں کی گئی۔ اس لیے اس نے اعلان جنگ کر دیا۔ انگریزوں نے

رنگون ۔ پروم اور پیگو فتح کر لیا اور ۲۰ دسمبر ۱۸۵۲ء میں لارڈ ڈلہوزی نے جنوبی برما کے انگریزی عملداری کے ساتھ الحاق کا اعلان کر کے اس جنگ کو ختم کر دیا ۔

لارڈ ڈلہوزی کے نظم و نسق میں دیسی ریاستوں کے کسی رئیس کے لاولد فوت ہو جانے پر اس ریاست کے الحاق کر لینے کا قصہ اس کے فتوحات سے زیادہ حیرت انگیز ہے ۔ ہندوؤں کا قدیم رواج اور قانون یہ ہے کہ کسی ہندو کے اگر اولاد نہ ہو تو اپنی جائداد و املاک ارثاً کسی شخص کو دینے کے لیے وہ کسی کو بھی اپنا متبنیٰ بنا سکتا ہے اور حقیقی اولاد اور ایسے ورثاء میں قانون کی نظر میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا جاتا ہے ۔ پانچ صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت شمالی ہند میں رہی مگر اس طویل مدت میں مسلمان بادشاہوں اور سلاطین میں سے ایک نے بھی ہندوؤں کے قانون تبنیت پر کوئی اعتراض نہیں کیا ۔ کسی ہندو رئیس کے فوت ہو جانے کے بعد اس کا حقیقی فرزند یا لے پالک بیٹا شاہنشاہ سے نئی سند حاصل کر کے اس کا قائم مقام ہو جاتا تھا ۔ البتہ یہ بھی تھا کہ اگر شاہنشاہ کا فتوح کی طرف رجحان ہوتا تھا تو وہ بغیر کسی پس و پیش کے ریاستوں کا الحاق کر لیتا تھا خواہ ایسی ریاستوں کا والی اس وقت زندہ ہو یا مر چکا ہو اور خواہ وہاں کے رئیس کا صلبی بیٹا موجود ہو یا صرف متبنیٰ مگر انگریزی راج میں کسی ہندو رئیس کے لڑکے کو فرزندی میں لینے پر انگریزی سرکار سے منظوری حاصل کرنے کا قاعدہ جاری کیا گیا ۔ جب یہ رواج قائم ہو گیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھانپ لیا کہ تبنیت کی منظوری نہ دینے سے کمپنی کی عملداری میں اور وسعت پیدا کرنی ممکن ہے ۔ اسی بنا پر مجلس نظماء نے ۱۸۳۴ء میں یہ اعلان کیا کہ کسی کے متبنیٰ کرنے پر جو منظوریاں صادر ہوتی ہیں ان کو تحت قاعدہ نہیں بلکہ مستثنیات سمجھنا چاہیئے ۔ ۱۸۴۱ء میں حکومت ہند نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ وہ کسی ریاست یا محاصل کی توریث کے وقت عزت اور انصاف کی رو سے جو صاف و صریح طریق عمل ہو گا اس کے اختیار کرنے میں پس و پیش نہ کیا جائے گا بلکہ استقلال سے کام لیا جائے گا ۔“ یہ بات لارڈ ڈلہوزی کے لیے مختص تھی کہ ”عزت اور انصاف کی رو سے“ جو اصول معین کیے گئے تھے ان کو وہ عملی جامہ پہنائے ۔ دو ایک غیر اہم ریاستوں کے سوا جن کا خاص حالات میں سابق میں الحاق کر لیا گیا تھا لارڈ ڈلہوزی کے عہد سے پہلے تو ان اصول پر کبھی عمل ہی نہیں کیا گیا تھا ۔

اس حکمت عملی کا پہلا شکار والیٔ ستارا ہوا۔ یہ راجہ مرہٹہ طاقت کے بانی سیواجی کے خاندان کی یادگار تھا۔ ۱۸۱۸ء میں مارکوئیس ہیسٹنگز نے جب آخری پیشوا کی دکنی ریاست کا الحاق کر لیا تو اس وقت ستارے کی ریاست قائم کی جس کو ایک پشت گزر چکی تھی۔ ستارے کے راجہ نے اپنے ملک و قوم کے رسم و رواج کے موافق ایک لڑکے کو اپنی فرزندی میں لیا تھا جس کا وہ مجاز تھا۔ ۱۸۴۸ء میں اس راجہ نے انتقال کیا تو بمبئی کے گورنر وقت سر جورج کلارک نے اس تبنیٰ و بعدہٗ کو ریاست ستارا کی گدی پر بٹھانے کی سفارش کی۔ گورنر کے ارکان کونسل نے اس پر گورنر کی مخالفت کی۔ اور کلارک کے جانشین کو تو اس رائے سے بالکل اتفاق ہی نہ تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے موقع پا کر یہ غیر فیاضانہ حرکت کی کہ اس ریاست کا الحاق کر لیا۔ یہ معاملہ مجلس نظماء کے سامنے پیش ہوا۔ ہنری سینٹ جورج ٹکر جس کا ذکر پچھلے باب میں آ چکا ہے اور ان صفحات میں بھی پھر آئے گا بڑا تجربہ کار شخص تھا اس نے ستارے کے الحاق کی مخالفت کی لیکن بحث کا نتیجہ پہلے ہی صاف ظاہر تھا اور مجلس نے ایک کثیر غلبۂ آراء سے الحاق کو منظور کر لیا۔

اس کے بعد ریاست کراولی کا مسئلہ غور طلب تھا۔ راجہ ستارے کے سال وفات کراولی کا راجہ بھی فوت ہوا اور راجہ ستارا کی طرح اس نے بھی انتقال سے پہلے ایک لڑکے کو اپنا متبنیٰ کر لیا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی کی نظروں میں ستارا اور کراولی میں کچھ فرق نہ تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ کراولی کی ریاست بھی حکومت ہند کو ملنی چاہئے۔ مگر مجلس نظماء نے یہ تصفیہ کیا کہ کراولی انگریزوں کی دست نگر ریاست نہ تھی بلکہ حلیف تھی جس کی حفاظت انگریزوں کے ذمے تھی اس لیے اس ریاست کا الحاق نہیں کیا جانا چاہئے۔ ۲۶ جنوری ۱۸۵۳ء کے مراسلے میں وہ سب دلائل لکھے ہوئے ہیں جو مجلس نظماء اور لارڈ ڈلہوزی میں مابہ الاختلاف تھے۔

"کرنل لو نے متبنیٰ کو تسلیم کر لینے کی رائے دی تھی اور سر فریڈرک کری نے اس تجویز کی تائید کی تھی مگر گورنر جنرل کا رجحان اس طرف تھا کہ یہ ریاست حکومت کو پھیر دی جائے جس سے مسٹر لوئس کو بھی بالکل اتفاق تھا۔

"گورنر جنرل نے اس اہم مسئلے پر موافق و مخالف دلائل کو غیر جانبدارانہ اور صحیح صحیح بیان کر دیا ہے۔ اس مقدمے کے تمام حالات پر خوب غور و خوض کرنے کے

بعد ہم یہ تصفیہ پسند کرتے ہیں کہ نرسنگھ پال کے متبنیٰ بھرت پال کو کراولی کا راجہ ہونے کی منظوری دینا چاہیئے۔

"اس نتیجے پر پہنچنے میں ہم ان اصول سے انحراف کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ جن کو ہم نے ستارا کے مقدمے میں اپنے ۲۴ر جنوری ۱۸۴۹ء کے مراسلے میں ضبط تحریر میں لایا ہے ...... لیکن ہماری نظروں میں ستارا اور کراولی کے حالات میں ایک بیّن فرق ہے جس پر گورنر جنرل نے اپنی یادداشت میں کافی توجہ اور لحاظ نہیں کیا۔ ریاست ستارا انگریزی حکومت کے عطیہ اور ایما کی بنا پر حال ہی میں قائم کی گئی تھی لیکن کراولی راجپوتوں کی ایک قدیم ریاست ہے جو اس وقت سے اپنے رئیس کے زیر نگیں ہے جب ہندوستان میں انگریزوں کا نام ونشان تک نہ تھا"

نظماء کے اس مراسلے سے کمپنی کی اعتدال پسندی کے وجوہ معلوم ہوتے ہیں۔ ستارا مرہٹوں کی ایک بہت معمولی ریاست تھی اور اس کے الحاق میں کوئی سیاسی خطرہ نہ تھا۔ کراولی راجپوتوں کی ریاست تھی اور اس کے الحاق پر ممکن تھا کہ تمام راجپوتانہ بدظن ہو جاتا۔ "انجمن اصلاح اہل ہند" نے مسٹر ڈکنسن کی رہنمائی میں جو ہندوستان کا مخلص اور سچا دوست تھا کراولی کے الحاق کی ناواجبیت پر عوام کی توجہ منعطف کرائی اور یہ کہہ کر دھمکی بھی دی کہ دارالعوام میں مسٹر بلیکٹ اس مسئلے پر ایک تحریک بھی پیش کرنے والے ہیں۔ غرض انگلستان کی حکومت وقت نے بدنامی سے بچنے کے لئے گورنر جنرل کو اس معاملے سے دست کش ہو جانے کا حکم دیا۔

صوبۂ متوسط میں ریاست سنبھالپور کا راجہ لاولد تھا اور کسی کو متبنیٰ کیے بغیر فوت ہو گیا۔ اس پر سنبھالپور کا بھی الحاق کر لیا گیا۔ مگر ایک اور نہایت ہی اہم اور تاریخی مقدمہ تصفیئے کے لیے پیش ہوا۔ جھانسی کا راجہ گنگا دھر راؤ نامی نومبر ۱۸۵۳ء میں ایک لڑکے کو جس کا نام بعد میں دامودھر گنگا راؤ رکھا گیا تھا اپنا متبنیٰ کرنے کے بعد فوت ہو گیا۔ راجہ نے مرتے وقت دو انگریزوں یعنے سیاسی وکیل اور سپہ سالار کے سامنے جو جھانسی میں مقیم تھے۔ اس تبنیت کو تسلیم کر لیا اور صدر حکام کے موسومہ خطوط ان تک پہنچا دینے کے لیے ان دو انگریزوں کو دیے تھے اور اپنی بیوی اور متبنیٰ کو ان کے برے بھلے کی خبر رکھنے کے لیے حکومت ہند کے حوالے کیا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی کی رائے ہوئی کہ

"اگرچہ یہ تنبیت خانگی املاک کے انتقال حقِ وراثت کے لیے کافی تھی مگر ریاست کے انتقالِ حکومت کے لیے نہیں" اس پر اس نے اس ریاست کا الحاق کرلیا۔

انگریزوں کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں جھانسی کی ریاست نے انگریزوں کے نمایاں خدمات انجام دیے تھے۔ راجہ جھانسی نے ۱۸۲۵ء میں کلپی کو بچا لیا تھا جس پر لارڈ ولیم بینٹنک نے ۱۸۳۲ء میں سرِ دربار نہایت ہی اچھے لفظوں میں اس کی تعریف کی اور شکریہ ادا کیا تھا۔ راجہ نے اپنے خطابوں میں "فدوی بادشاہ جم جاہ انگلستان" کا اضافہ بھی قبول کرلیا تھا۔

الحاق کے بعد بیوہ رانی نے حکومتِ ہند کے پاس اپنے خاندان کی وفاداری کا حوالہ دیتے ہوئے مکرر التجا پیش کی اور جھانسی کے وکیل سیاسی میجر میلکم نے اس بیان کی تائید ان لفظوں میں کی کہ "میرے خیال میں بائی صاحبہ نے ریاست جھانسی کی وفاداری اور عقیدت بیان کرنے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کیا کیونکہ یہ ریاست اس وقت سے ہماری حکومت کا ساتھ دے رہی ہے جبکہ موقع بڑا نازک تھا ایک طرف تو اس کے ورغلانے کے لیے ہر طرح کا سامان ہو رہا تھا اور دوسری طرف ہماری حکومت کو وہ عروج نہ تھا جو اب اسے حاصل ہے" میجر میلکم نے بیوہ رانی کی تعریف میں یہ لکھا کہ "اس خاتون کی کردار نہایت ارفع و اعلیٰ ہے اور جھانسی میں ہر شخص اس کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہے" لیکن لارڈ ڈلہوزی نے نہ تو ریاست کی تاریخ گزشتہ سے اپنے دل پر کچھ اثر لیا اور نہ موجودہ رانی کی حیثیت اور اخلاق سے برخلاف اس نے جو بات دل میں ٹھانی تھی۔ اسی پر اڑا رہا اور کسی کی ایک نہ سنی۔

اس الحاق سے پہلے جھانسی کی جو وفادار اور دوستانہ ریاست تھی اب وہی انگریزوں کی دشمن جانی بن گئی اور ایک اعلیٰ اخلاق رکھنے والی خاتون کی یوں قلبِ ماہیت ہوئی کہ وہ بھی رفتہ رفتہ ایک سنگدل اور انتقام جو عورت بن گئی۔ جھانسی کی یہی رانی تھی جس نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو اکسایا اور اس میں شریک ہو کر باغیوں کو ہر طرح کی مدد بھی دی۔ اسی نے جھانسی میں ایسی خونریزی ہونے دی جو اس ہنگامے میں سب مقامات سے زیادہ ہوئی تھی اس نے مردانہ لباس زیبِ تن کیے انگریزوں کی فوج کا مقابلہ کیا اور اپنی قوم کے سب بہادروں میں ایسی بہادر ثابت ہوئی کہ تلوار ہاتھ میں لیے جان پر کھیل گئی۔ اگر جھانسی کی اس رانی کو موقع ملتا تو وہ اپنی چھوٹی سی ریاست میں ایک نہایت قابلہ اور نیک نہاد منتظمہ ثابت ہوتی جیسی اور بہت سی ہندو عورتیں ہوئی ہیں جن کا ذکر موجودہ زمانے کی تاریخ میں آیا ہے لیکن اس طرح کا دردناک انجام اس کی تقدیر کا لکھا ہو گیا۔ اور موجودہ زمانے کے ہندوستان کی داستانوں میں اسے "ہندوستان کی جون اوف آرک" کہکے لوگ یاد کیا کرتے ہیں۔

چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا یکے بعد دیگرے الحاق کر لیا گیا لیکن "قانون بازگشت" کے تحت جتنے الحاقات عمل میں آئے ان میں سب سے اجیر مگر سب سے زیادہ اہم ریاست ناگپور کا الحاق تھا۔ راگوجی بھونسلہ راجہ ناگپور نے ۱۱ دسمبر ۱۸۵۳ء میں انتقال کیا۔ اس کی بیواؤں میں سے ایک نے اپنے ایک نوجوان رشتہ دار کو جو یا صاحب کے نام سے مشہور تھا اپنا متبنیٰ اقرار دیا۔ یہ تبنیت ہندوؤں کے قانون کی رو سے بالکل جائز تھی مسٹر مینسل نامی رزیڈنٹ نے اس کے دفتر کے نام جو نافذ العمل ہدایات صادر کی تھیں ان پر عمل کر کے نہ تو اس تبنیت کی مانعت کی اور نہ تبنیت کے رسوم کی تکمیل میں خاص طور پر کوئی مدد دی البتہ تبنیت کو تسلیم کرنے کی سفارش اس نے کی۔ ۱۷ جنوری ۱۸۵۴ء میں لارڈ ڈلہوزی نے ایک یادداشت قلمبند کی تھی جس میں اس وسیع و آباد ریاست کے الحاق کا بھی ذکر ہے۔

براڑ کا وسیع اور زرخیز ملک جس میں روئی کی پیداوار کثرت سے ہوتی تھی ایک دوسرے حیلے سے انگریزوں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ عہد معاونت کے بعد جو فوج سرکار نظام کے خرچ پر ممالک محروسہ سرکاری میں رکھی گئی تھی وہ بہت ہی بیش مصارف تھی اس لیے سرکار عالی پر ۰۰۰،۰۰۵ پونڈ بقایا ہو گیا تھا۔ گورنر جنرل کا ایما یہ تھا کہ وہ براڑ کے علاوہ کرشنا اور تمبھدرا کے دوآبے کا زرخیز خطہ اس قرض کی ادائی اور فوج کے آیندہ مصارف کی کفالت میں لینے آمادہ ہے جب اس عہد نامہ کا مسودہ نظام وقت کے سامنے پیش ہوا تو نظام نے اس پر اعتراض بھی کیا مگر سننے والا کون تھا۔ نظام نے پوچھا کہ کیا شصت سالہ اتحاد کا یہی انجام ہے اور یہ بھی کہا کہ اس قلمرو کا ایک ثلث حصہ یوں چھین لینے سے رعایائے ملک کی نظروں میں رئیس کی سبکی ہوتی ہے نظام کی سب رد و کد بے سود ہوی اور عہد نامے پر بالآخر دستخط کرنے ہی پڑے۔ اس کے بعد ہی نظام وقت نے رحلت کی۔[1]

لارڈ ڈلہوزی کے ایک اور الحاق کا بیان باقی ہے یعنے سلطنت اودھ کا۔ اودھ کی خرابی حکومت اس کے الحاق کا باعث ہوی اور کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو اس مضمون پر سرکاری کاغذات پڑھنے اور ان لوگوں کی شہادت جانچنے کے بعد جن پر انگشت نمائی ہو نہیں سکتی اور جو اودھ سے ہمدردی بھی رکھتے تھے جیسے سلیمن اور اوٹرم یہ کہہ سکے کہ اودھ میں بدنظمی اور اندھیر نہ تھا۔ پھر بھی یہ ممکن نہ تھا کہ اس بدنظمی کی اصلاح کی جائے جنرل سر ولیم سلیمن نے جو ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۴ء تک لکھنؤ میں رزیڈنٹ تھا حکومت ہند کے پاس اودھ کی اصلاح نظم و نسق کے منصوبے بہ اصرار پیش کرتا رہا تھا اور اس کو ان تجاویز

---

[1] اس کے بعد نظام نے جملہ واجب الادا قرض کے ادا کر دینے کی شرط پر براڑ کی واپسی کے لئے جتنی تحریکات پیش کیں وہ سب بے سود ثابت ہوئیں اور حال ہی میں برطانوی حکومت ہند کو براڑ دوامی پٹے پر دیدیا گیا۔

کی کامیابی کا اتنا یقین نہ تھا کہ وہ اپنی نیک نامی تک معرض خطر میں ڈالنے کے لیے تیار تھا لیکن لارڈ ڈلہوزی کے سر پر اصلاح کے بجائے الحاق کا بھوت چڑھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ایک یادداشت میں جو اس موضوع پر مشورہ لینے کی شکل میں پیش کی گئی تھی یہ لکھا کہ انگریزی حکومت دیسی ریاست میں اصلاح کرنے کی ذمہ داری عرق ریزی اور لاحقہ خطرات کو اپنے سر لینے کے لیے تیار ہے تو ایسی ریاست کے محاصل کے فاضلات اپنے زیر تصرف لانے کی بھی وہ مستحق ہے۔ لارڈ ڈلہوزی کا الحاق ممالک کا یہی جوش تھا جس کی وجہ سے لارڈ ڈلہوزی کسی جگہ فوری کوئی چارۂ کار اختیار نہیں کر سکا اور جب کہیں خرابی بڑھ چلی تو یہ گویا اسی انتظار میں رہتا تھا کہ بے دست و پا ریاست پر فوراً لپکے اور اس کو بھی کمپنی کی علمداری میں شامل کرلے۔ لارڈ ڈلہوزی نے نظماء کے سامنے اودھ کے متعلق تین۳ منصوبے پیش کیے تھے۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ (۱) یا تو شاہ اودھ ایک مدت معینہ کے لیے اپنی سلطنت انگریزوں کے زیر انتظام کر دے (۲) یا بادشاہ کا شاہی تزک و احتشام برقرار رکھ کر انتظام مملکت ہمیشہ کے لیے کمپنی کو تفویض کر دیا جائے (۳) یا اس ریاست کا حسب ضابطہ کلیتاً انگریزوں کی قلمرو سے الحاق کر لیا جائے۔ اسی وقت بنٹنک کا سا حکمراں اگر کوئی ہوتا تو پہلے منصوبے پر کاربند ہوتا۔ خود لارڈ ڈلہوزی نے دوسری تدبیر اختیار کرنے کی تائید کی تھی لیکن مجلس نظما نے تیسری تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۱ نومبر ۱۸۵۵ء کے مراسلے میں جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ "یہ ایک ایسی طرز تحریر کا نمونہ ہے جس میں نہایت ہی اہم ہدایات تو دی جائیں مگر اس طرح کہ لکھنے والے پر کوئی ذمہ داری ہی عاید نہ ہوسکے"، نظماء نے اودھ کے الحاق کے لیے احکام صادر کر دیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ لارڈ ڈلہوزی ہندوستان میں اپنی خدمت کا جائزہ دینے سے پہلے ان احکام کی تعمیل کروا دے۔ ہندوستان میں آٹھ سال تک مسلسل کام کرنے سے لارڈ ڈلہوزی کی صحت بالکل خراب ہوگئی تھی۔ اس کی عمر تینتالیس (۴۳) سال سے زیادہ نہ تھی مگر یہ قبل از وقت بوڑھا ہوگیا تھا اور اس وقت اس قدر بیمار تھا کہ چل پھر نہیں سکتا تھا بایں ہمہ اس نے مجلس نظماء کے احکام کی فوری تعمیل کا وعدہ کر لیا جس کو اس نے ایفا بھی کیا۔ صوبۂ اودھ کا الحاق ۱۳۔ فروری ۱۸۵۶ء کے اعلان عام کی رو سے انگریزی عملداری کے ساتھ ہوگیا۔ اسی مہینے کی آخری تاریخ

لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند کی خدمت سے سبکدوش ہوگیا۔ اس نے اپنے طبیب سے کہا کہ "اس مہینے میں صرف انتیس دن کا ہونا بھی کیا ہی اچھا ہوا ورنہ میں تو اور دو دن تک بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔"

ہم نے پچھلے صفحات میں لارڈ ڈلہوزی کے فتوح و الحاقات کو مختصراً بیان کر دیا ہے۔ اس نے اپنے ہشت سالہ نظم و نسق کے اثناء میں آٹھ بڑی بڑی ریاستوں کا الحاق کر لیا تھا۔ ان الحاقات کے مختلف وجوہ بیان کیے گئے تھے۔ مثلاً پنجاب کا اس لیے الحاق کر لیا گیا تھا کہ اس ملک میں بغاوت پھیل گئی تھی اگرچہ انگریزی حکومت نے چھوٹے چھوٹے فرماں رواؤں کے ساتھ جو معاہدے کیے تھے ان میں ایسی بغاوتوں کے فرو کرنے کا بھی ذمہ لیا تھا۔ جنوبی برما سے محض ان انگریز تاجروں کی شکایتوں کے پیش ہونے پر جو اس ملک سے تجارت کرتے تھے اس ملک کا الحاق کر لیا گیا تھا۔ براڑ اس غرض سے چھین لیا گیا تھا کہ نظام اپنا قرض بیباق نہیں کر سکتے تھے سلطنت اودھ کا اس لیے الحاق کر لیا گیا تھا کہ وہاں بدنظمی پھیلی ہوی تھی۔ سنبھالپور کا الحاق اس بناء پر کر لیا گیا تھا کہ آخری راجہ کا کوئی حقیقی وارث نہ رہا تھا۔ ستارا جھانسی اور ناگپور کا الحاق اس وجہ سے کر لیا گیا تھا کہ لارڈ ڈلہوزی نے ان والیان ریاست کے متبنیٰ ورثاء کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

ہم ان مباحث میں پڑنا نہیں چاہتے جو ان تجاویز کے جواز و عدم جواز پر ہوتے رہے ہیں۔ آج تک کسی غیر جانبدار مورخ نے از روئے انصاف لارڈ ڈلہوزی کی حکمت عملی اور افعال کے جواز کی صورت پیش نہیں کی عہد وکٹوریہ کے ایک پر مغز صاحب قلم مسمیٰ سیلی نے ڈلہوزی کے جرائم کا تقابل پروشیا کے فریڈرک اعظم کے جرائم کے ساتھ کر کے ان کو قابل معافی قرار دیا ہے لیکن یہ تقابل کسی قدر غلط ہے۔ فریڈرک کی لڑائیاں اپنے ہم طاقت و ہم پلہ دشمنوں کے ساتھ تھیں اور اس کے جرائم کا کفارہ اس کا وہ مقصد اعلیٰ سمجھنا چاہیئے جس سے وہ اپنے وطن کو بھی یورپ کی بڑی بڑی اقوام کے پہلو بہ پہلو کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ ڈلہوزی نے ان لوگوں پر پنجہ مارا جن کو اس کی مقاومت کی تاب نہ تھی اس کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی وسیع شاہنشہی اور کثیر محاصل میں اضافہ کرنے کی خاطر ایک قدیم قانون میں اپنے مطلب کے

موافق غلط معنی پیدا کرکے خود کو ذلیل ہی کیا۔
قدیم شہنشاہی پسند حکمرانوں میں جن کا عقیدہ یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کی نجات اور ترقی اسی میں ہے کہ سواراج اور حکومت خود اختیاری ان سے چھین لی جائے لارڈ ڈلہوزی آخری شخص گزرا ہے۔ ہندوستان سے مراجعت کے بعد آخری چند سال اس کی زندگی کے ایسے گزرے جس میں اُس نے وہ زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جبکہ شہنشاہی پسند خیالات اس وقت قابل قبول نہیں رہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی برخاست کردی گئی اور" اصول بازگشت" خود اُس کی فرماں روا ملکہ نے منسوخ کردئے۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت کے ابتدائی زمانے میں ہندوستانیوں کی خود اپنی کوششوں سے ترقی کرنے پر زیادہ بھروسہ کیا جانے لگا۔ اسی زمانے میں ایک" قدامت پسند" وزیر ہند سر اسٹفیرڈ انارتھ کوٹ نے ریاست میسور پر ایک دیسی رئیس کو دوبارہ مسلط کردینے کا تہیہ کر لیا۔ ایک اور" قدامت پسند" وزیر ہند لارڈ سالسبری نے صرف بدنظمی اور جرائم کی بنا پر ریاست بڑودہ کا الحاق کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میسور کی ریاست کا وہاں کے قدیم شاہی خاندان کو واپس دیدینا اور بڑودہ پر حکمرانی کے لیے ایک نئے اور موزوں شخص کا انتخاب کرنا ان تمام سیاسی امور میں جو وزراے دولت برطانیہ نے ہندوستان کے لیے آج تک انجام دیے ہیں سب سے زیادہ دانائی اور فیاضی کا کام تھا چنانچہ آج ان دونوں ریاستوں سے جن پر دیسی روسا حکمرانی کر رہے ہیں ہندوستان کے کسی اور حصے کا انتظام بہتر نہیں ہے۔

تیسرا باب

شمالی ہند میں بندوبست اراضی

انگریزوں کے صوبۂ بنگالہ (جس کا بانی لارڈ کلائیو تھا) کے حدود میں وارن ہیسٹنگز اور مارکوئیس ولزلی کے عہد حکومت میں آناً فاناً توسیع ہوی سنہ ۱۷۷۵ء میں نواب اودھ کے انتقال پر اس کے جانشین کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا تھا اس کی رو سے وارن ہیسٹنگز نے بنارس اور اس کے چند ملحقہ اضلاع کا الحاق کر لیا۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں لارڈ ویلزلی کے دباؤ میں آکر نواب اودھ نے الٰہ آباد اور آس پاس کے چند اضلاع بھی انگریزوں کے تفویض کر دیے اور یہی "ممالک مفوضہ" کہلاتے ہیں۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں دہلی آگرہ اور گنگا کا دوآبہ انگریزوں نے مرہٹوں سے فتح کر لیا تھا مگر لارڈ ویلزلی کے عہد حکومت میں اس کو دوبارہ فتح کرنا پڑا اور اب یہی ممالک "مفتوحہ" کہلاتے ہیں۔

بنارس میں اراضی پر مطالبہ سرکار سنہ ۱۷۹۵ء میں جس طرح دواماً مقرر کر دیا گیا تھا اسی طرح کا دوامی بندوبست سنہ ۱۸۰۳ء اور سنہ ۱۸۰۵ء میں ممالک مفوضہ اور مفتوحہ میں بھی کرنے کا وعدہ تو کیا گیا مگر یہ کبھی ایفا ہی نہیں ہوا کیونکہ سنہ ۱۸۰۸ء میں آر ڈبلیو کاکس اور ہنری سینٹ جورج ٹکر دونوں نے جو کمشنران خاص تھے ان ممالک میں فوراً دوامی بندوبست کرنے کی مخالفت کی تھی۔[1]

---

[1] ہنری سینٹ جورج ٹکر جس کا ذکر پچھلے باب میں آچکا ہے ہندوستان میں مالگزاری کا دوامی بندوبست

بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ

طول طویل مباحثوں کے بعد مجلس نظما نے آخر کار سنہ ۱۸۲۱ء میں شمالی ہند میں دوامی بندوبست کرنے کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ سنہ ۱۸۲۲ء کا دستور العمل (۷) منظور کر لیا گیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ جاگیری خام لگان ۸۳ فیصدی تک لینے کا سرکار کو حق حاصل ہے اور یہ کہ وقتاً فوقتاً بندوبست پر نظر ثانی کرنے کی بھی سرکار مجاز ہے۔

بیشک لارڈ ولیم بنٹنک مستحق شکریہ ہے کہ اسی نے جو بے انتہا لگان پہلے سے تھا اس میں تخفیف اور طویل المیعاد بندوبست کی ترویج کی۔ سنہ ۱۸۳۳ء میں ایک کانفرنس بھی الہ آباد میں منعقد کی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ سنہ ۱۸۳۳ء کا دستور العمل (۱۱) منظور ہوا اور یہی شمالی ہند کے بندوبست اراضی کا اساسی اصول متصور ہوتا ہے۔ سرکاری مطالبے میں تخفیف کر کے وہ لگان کا ۶۶ فی صدی مقرر کیا گیا اور بندوبست ۳۰ سالہ کر دیے گئے۔

یہ اہم کام رابرٹ مارٹنز برڈ کے ذمے کیا گیا اور اس نے ایسی ہی ہمدردی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا جیسی لارڈ ولیم بنٹنک نے اس حکمت عملی کی تشکیل میں دکھائی تھی۔ اس بارے میں جو طریق عمل برڈ نے اختیار کیا تھا اس کو کئی سال کے بعد اس نے دار العوام کی مجلس منتخبہ کے سامنے اپنی شہادت میں بیان کیا ہے۔ سب سے پہلے

کرنے کا بہت بڑا حامی تھا۔ سنہ ۱۸۰۸ عیسوی میں اس نے اس بندوبست کے التوا کی تحریک کی تھی نہ کہ اس سے بالکل دست بردار ہو جانے کی۔ اس واقعے کے کئی سال بعد اس نے لکھا تھا کہ "در سنہ ۱۸۰۸ عیسوی میں اس تجویز کی جس کو متعدد منتظمین مملکت نے یکے بعد دیگرے ملک کی خوشحالی کے لیے نہایت ضروری تصور کیا تھا قوۃ سے فعل میں لانے کے لیے مامور ہوا تھا۔ اگرچہ مجھکو اس سے بالکل اتفاق تھا کہ یہ تجویز بجائے خود نہایت دانشمندانہ اور مفید تھی اور ایسے اصول پر مشتمل تھی جن سے انجام کار فائدہ کی بہت کچھ توقع تھی لیکن میں نے محض اس بنا پر اس کے التوا کا مشورہ دیا تھا کہ ہم اس وقت بلحاظ حالات اتنے بڑے کام کے سرانجام کے لیے بالکل تیار نہ تھے لیکن مجھکو کبھی یہ خیال تک نہوا کہ اس تجویز کے اصل اصول سے یوں دست بردار ہو جانا چاہیے یا یہ کہ قابضان اراضی کو جن سے ہم نے بڑے وثوق کے ساتھ اور نہایت ہی باقاعدہ طریقے پر عہد و پیمان کیے تھے ان فوائد سے محروم کر دیا جائے جن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا اور یہ کہ آخر کار اس مفروضے پر کہ ان کا وجود حاج کار اور اراضی پر ایک بارگران ہے ان کو بالکل نظر انداز ہی کر دیا جائے۔ وعدہ محو نہیں ہو سکتا خواہ اس کا ایفا نہوا ہو"

(سوانح عمری ہنری سینٹ جورج ٹکر مولفہ کے۔ ص ۲۲۲)

یہ ہوتا تھا کہ ایک مقررہ رقبے یعنی پرگنے کے اندرونِ حدود جس قدر اراضی ہوتی تھی اس کا ایک سرسری تخمینہ قائم کر لیا جاتا تھا۔ پھر یہ ہوتا تھا کہ ہر کھیت کو شامل کر کے زمین کا ایک نقشہ تیار کیا جاتا تھا اس کے بعد فنی پیمایش کی جاتی تھی جس میں مزروعہ اور غیر مزروعہ دونوں قسم کی اراضی بتائی جاتی تھی۔ اس کے بعد اس تمام و کمال رقبے پر محصول اراضی لگایا جاتا تھا اور آخر میں محصول کی جملہ رقم اس رقبے میں جتنے گاؤں ہوتے تھے ان پر تقسیم کر دی جاتی تھی۔

یہ خیال کرنا بہت آسان ہے کہ پرگنے پر محصول اراضی کا تعین اور اس پرگنے کے قصبات پر اس کی تقسیم ہی دو باتیں ایسی تھیں جن پر زراعت پیشہ سخت تردد کے ساتھ نظریں لگائے رہتے تھے۔ اس نظام میں جو کمزوری تھی وہ درحقیقت تعین محصول ہی تھی۔ اگرچہ لگان کے ۶۶ فی صدی حصے کا مطالبہ کرنا ہی ایک اصول قائم کر دیا گیا تھا لیکن خود اس لگان کا تعین قیاس پر مبنی تھا بالخصوص ان اراضی پر جو دیہی جماعتوں کے زیر قبضہ تھیں مارٹنز برڈ کا بیان ہے کہ "اس کے بعد ہیں اس خطے پر کیا مالگزاری لگانی چاہئے اس کے متعلق ہم حسب ذیل امور کی تحقیقات شروع کر دیتے تھے کہ سابق میں یہاں مالگزاری کی رقم کتنی وصول ہوتی تھی۔ خود رعایا کا بیان کیا ہے اور فصل اور مٹی کی نوعیت کیا ہے اس کے علاوہ ان تمام مختلف ذرائع سے بھی جن کو تجربے سے ہم نے حاصل کیا ہے اس بات کی دریافت مکمل کرتے تھے کہ اب اس اراضی پر سرکاری مطالبہ کیا ہونا چاہئے جو از روئے انصاف درست سمجھا جائے گا۔"

اس طریقے پر عمل کرنے میں بندوبست کے عہدہ داروں کو بہت کچھ آزادی حاصل تھی اور اسی لیے ہمیشہ یہ غیر تیقن رہتا تھا کہ بندوبست کے بعد زراعت پیشہ لوگوں پر کتنی رقم واجب الادا نکلتی ہے۔ متعلقہ مواد اس درجہ موہوم اور ناقابل اعتماد ہوتا تھا کہ اس پر خود بندوبست ہی کے دو عہدہ دار متفق الرائے نہیں ہو سکتے تھے اور ایک بندوبست کے وقت جو مالگزاری مقرر کی جاتی تھی وہ دوسرے بندوبست کے وقت بدل دی جاتی اور عموماً بڑھا دی جاتی تھی۔ جب زراعت پر محصول اس طرح غیر معین رہے تو پھر زرعی ترقی اور سرسبزی ناممکن ہے۔ دوامی بندوبست کے مویدوں کا مقصد یہ تھا کہ اجتماع دولت ہو مگر یہ اس لیے ممکن الوقوع نہیں معلوم ہوتا تھا کہ

دولت اور خوشحالی کی علامتوں کے ظاہر ہوتے ہی تجدید بندوبست کے وقت اراضی پر پہلے سے زیادہ سنگین محصول لگا دیا جاتا تھا۔

اس نقص کے باوجود جس بندوبست کی ابتدا ۱۸۳۳ء میں ہوی تھی اس کی تکمیل ہمدردانہ طریقہ پر کی گئی جس سے شمالی ہند کے کسانوں کو جن پر انگریزی حکومت کے ابتدائی سی سالہ دور میں سنگین محصول لگائے گئے تھے اور جن کے ساتھ مختصر المیعاد بندوبست کیے گئے تھے آیندہ کی پریشانیوں سے نجات حاصل ہوی۔ مارٹنز برڈ مسلسل نو سال تک عرق ریزی کرتا رہا اور ۱۸۴۲ء میں ہندوستان کو خیرباد کہنے سے پہلے اپنے بندوبست کے جو قریب الختم تھا نتائج پر اس نے ایک مکمل رپورٹ پیش کی۔

دوامی بندوبست کا خیال ترک کر دیا گیا تھا۔ پھر بھی برڈ کا ارادہ اور خواہش یہی تھی کہ ان اضلاع میں جہاں بہت سی قابل زراعت زمین زیر کاشت آ چکی تھی اس کے مقررہ بندوبست کو دوامی سمجھا جائے۔ اس کی نہایت ہی واضح رپورٹ سے ہم ذیل کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔

پرگنہ دہلی

اس پرگنے کا کچھ حصہ جس کی آبپاشی نہروں سے ہوتی تھی نہایت آباد اور خوشحال تھا سابق میں یہاں اراضی پر بے انتہا مالگزاری لگا دی گئی تھی لیکن اب وہ بات نہیں رہی سرکار نے جو مالگزاری اب مقرر کی تھی وہ بالکل انصاف پر مبنی اور واجبی تھی۔ اس پرگنے کے باقی حصے میں جہاں ذرائع آبپاشی مفقود تھے کسانوں کو اپنی محنت کا بہت ہی قلیل معاوضہ ملتا تھا۔

"اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ آئندہ بندوبست پر نظر ثانی کرنے کے وقت دہلی کی عملداری میں اضافۂ رقم کی توقع نہیں ہے اِلّا اس کے کہ سرکار وہاں بھی ایک نہر کھول دے"

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو $36\frac{1}{2}$ سیر ملتا تھا۔

پرگنہ میرٹھ

ضلع سہارنپور۔ "اس ضلع کے بعض حصوں میں اراضی پر بے انتہا محصول لگا دیا گیا

تھا اور محاصل وصول کرنے کے طریقے بھی بہت سخت اور بالکل خلاف قانون اختیار کیے گئے تھے۔

بعض یہی جماعتوں میں جو لوگ نہایت جفاکش اور محنت کی روٹی کھانے والے تھے وہی سخت پریشان حال تھے۔ سرکاری مطالبہ سب پر مساوی مقداریں کرنے کی ہر طرح کوشش کی گئی لیکن پھر بھی بہت کچھ غیر مساوات اب بھی باقی ہے۔" اس ضلع کے بعض مواضع میں موجودہ بندوبست کے ختم میعاد پر سرکاری محاصل میں اضافہ ہو سکتا تھا مگر " قابل زراعت زمین کا ایک خمس حصہ بلا محصول چھوڑ دینا ضروری تھا تاکہ مویشیوں کے لیے وہاں گھانس اور دوسری قسم کا چارہ وغیرہ پیدا ہو یا اتنا حصہ یونہی افتادہ رہے کیونکہ بعض دفعہ اراضی چھوڑ کر لوگ چلے بھی جاتے ہیں۔" ہردوار سے الہ آباد تک آبپاشی کی جو نہر گئی ہے اور جو ابھی زیر تعمیر ہے اس کی تکمیل پر سرکاری محاصل میں متوسط اضافے کی توقع ہے۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ۴۰ سیر ملتا تھا۔

ضلع مظفر نگر جہاں شرح محصول اس وقت بہت کم ہے اس حصے میں آیندہ بندوبست پر محاصل میں کچھ اضافے کی امید ہے لیکن " ایسے مواضع ہیں جہاں قابل زراعت زمین کی آدھی بھی زیر کاشت نہیں اس کے باوجود وہاں اسی معیار نرخ پر محصول وصول ہوتا رہا ہے جو کاشت کی زمینوں کے لیے مقرر ہے تو پھر مطالبہ سرکاری میں بھی اضافہ نہیں ہونا چاہیئے۔"

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ½ ۲۷ سیر ملتا تھا۔

ضلع بلند شہر۔ یہ ضلع بہت پست و زبون حالت میں تھا اور یہاں لگان بھی بہت کم مقدار میں لگایا گیا تھا سرکاری محاصل میں تین طرح سے اضافے کی توقع کی جا سکتی ہے ایک تو آبپاشی کی نہر کی تعمیر تکمیل کو پہنچنے پر دوسرے زیادہ کاشت ہونے پر تیسرے شرح محصول اراضی بڑھانے پر۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ۳۳ سیر ملتا تھا۔

ضلع میرٹھ۔ یہ ضلع بہت اچھا تھا۔ آیندہ بندوبست پر سرکاری محاصل میں اضافے کی توقع کی جا سکتی ہے بشرطیکہ کاشت بھی زیادہ کی جائے۔" لیکن نہروں کے ذریعہ آبپاشی کرنے سے محاصل

ہیں جو اضافہ ہوسکتا ہے اس کے سوا صرف شرح محصول ہیں اضافہ کرنے سے محاصل سرکار میں یہاں اضافے کی کوئی امید نہیں"۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ۳۲ سیر ملتا تھا۔

ضلع علیگڈھ۔ یہ ضلع نہایت خوش حال تھا اور یہاں کاشت بھی خوب ہوتی تھی۔ محاصل میں آیندہ اضافے کی توقع صرف مذکورالصدر چھ پرگنوں میں کی جاسکتی تھی مگر دوسرے پرگنوں میں نہروں کے ذریعہ آبپاشی کیے بغیر کسی اضافہ کی گنجائش نہ تھی اس ضلع کی دیہی جماعتوں کو نیل کے نخلبند مارٹن اور سکلینک نیز دیسی مہاجنوں نے بڑے بڑے رقوم پیشگی دے رکھے تھے جس پر ان لوگوں کو بعد میں تکلیف اٹھانی پڑی اور ان رقوم کے لیے جو زمینیں مکفول تھیں وہ سب فروخت کرنی پڑیں۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ۳۹ سیر بکتا تھا۔

پرگنۂ آگرہ

ضلع آگرہ۔ اس ضلع کی تمام زمین زیر کاشت تھی اور لگان کا تعین بھی ہوچکا تھا۔ "آئندہ کسی زمانے میں بھی اس ضلع کے محاصل میں اضافے کی توقع نہیں اس لیے جمع یا مالگزاری کی موجودہ رقم کو دوامًا مقرر کر دینا چاہیے، یہاں کی پیداوار میں ترقی یا کاشت کے طریقے میں اصلاح یا آبپاشی میں اضافے کی امید اسی وقت کی جاسکتی ہے جب کہ مزارعین کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ اگر وہ اپنی محنت اور دولت ان پر صرف کردیں تو اس کا تمام فائدہ بلا شرکت غیرے انہیں کو ملے گا۔

ضلع متھرا۔ اس ضلع کی سب زمین بھی زیر کاشت تھی "موجودہ دھارے پر جو محاصل وصول ہوتے ہیں وہی رقم دوامًا مقرر کردینی چاہیے آیندہ بھی کسی اصلاح و ترقی کی امید نہیں بجز اس کے کہ لوگوں کو بلا شرکت غیرے اپنی اصلاح و ترقی سے مستفید ہونے کا یقین کلی ہو جائے"۔

ضلع فرخ آباد۔ اس ضلع کے بعض حصوں میں تمام زمین زیر کاشت تھی آیندہ بندوبست پر اس ضلع کے اور حصوں کے محاصل میں ۲ طرح سے اضافہ ممکن تھا ایک یہ کہ وہاں زیادہ کاشت ہونے لگے دوسرے دھارے میں بھی اضافہ کیا جائے۔

اگر نہروں کے ذریعہ آبپاشی بھی یہاں کی جائے تو اور اضافہ ہو سکتا ہے۔

ضلع مینپوری۔ اس ضلع کے بعض حصوں میں پوری کاشت ہوتی تھی اور اس پر مالگزاری بھی مقرر ہو چکی تھی مگر باقی حصے ایسے نہ تھے۔

ضلع اٹاوہ۔ یہاں پوری زمین زیر کاشت تھی اور اس کے لگان کا بھی تعین ہو چکا تھا۔ "آئندہ اضافے کی کوئی توقع نہیں بجز اس کے کہ نہروں کے ذریعہ آبپاشی کی جائے ورنہ موجودہ دھار ادوامی متصور ہونا چاہیے۔"

پرگنۂ روہیلکھنڈ

ضلع بجنور۔ اس ضلع سے سابق میں لگان بہت زیادہ لیا گیا تھا اور حصول محاصل کے لیے جو ذرائع اختیار کیے گئے وہ بھی بہت سخت تھے۔ "مثلاً گروبداروں اور خریداروں کے نام ان کی مرضی کے خلاف جبراً انتقال املاک کر دینا۔ مہاجنوں سے ان کے کسی بندل کو سنے بغیر زبردستی قرض لینا اور ان مواضعات میں جو رعایا کے فرار ہو جانے کی تاریخ سے سرکاری عہدہ داران کے زیر انتظام تھے کاشت کا کام بیگاروں سے لینا وغیرہ" ان خرابیوں کی بعد کو اصلاح کر دی گئی۔ اور مالگزاری کی ایک واجبی رقم مقرر کی گئی لیکن اس کے تعین میں مساوات حاصل نہیں ہوی۔

ضلع مرادآباد۔ اس ضلع کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں کیے گئے۔

ضلع بریلی۔ اس ضلع پر سابق میں بے انتہا محصول لگا دیا گیا تھا۔ اور اس کے بعض حصوں پر ۱۸۳۷ء کے قحط کے شدید اثرات پڑے تھے۔ یہاں کے اکثر باشندوں نے بھوکوں مرنے کی تاب نہ لاکر لوٹ مار کرنے کے لیے ٹولیاں قائم کی تھیں۔ اکثر کاشتکار اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے حال کے بندوبست میں جو لگان مقرر کیا گیا ہے وہ مبنی بر اعتدال ہے۔

ضلع بدایون۔ بندوبست کے زمانے میں ضلع بھر میں بڑی تکلیف اور پریشانی پھیلی ہوی تھی۔ بندوبست ایسے زمانے میں کیا جا رہا تھا جب کہ "بے اندازہ مالگزاری لگانے کی طرف عام رجحان تھا۔" اسی لیے اس کے تعین کے بعد متواتر اس پر نظر ثانی ہوتی رہی اور رعایا کو اب بھی اس زیادہ ستانی سے پوری نجات حاصل نہیں ہوی تھی۔

"اگر سرکار اور سرکاری عہدہ داران کو اس بات کا یقین ہو جائے (جس کی مجھکو امید ہے کہ اب تک ہو گیا ہوگا) کہ حد سے زیادہ مالگزاری وصول کرنے سے یقیناً نقصان ہوتا ہے اور دونوں تہیہ کریں کہ وہ انہیں مبنی بر اعتدال اصول پر کاربند رہیں گے جو سب سے پہلی دفعہ اب زیر عمل آئے ہیں تو بیشک طرفین کو بڑا فائدہ ہوگا۔"

ضلع شاہجہاں پور۔ سابقہ بندوبست میں یہ ضلع کثیر مالگزاری کی آفت سے بچ گیا تھا اور موجودہ بندوبست میں بھی اس پر لگان کا زیادہ بار نہیں ڈالا گیا تھا۔ یہ ضلع نہایت سرسبز حالت میں تھا۔

ضلع پیلی بھیت۔ سابق میں اس ضلع کے آدھے حصے پر بے انتہا لگان عائد کیا گیا تھا لیکن اب اس میں معقول تخفیف کر دی گئی تھی اور باقی آدھے حصے میں تعین لگان راجہ گیر نام سنگھ کے ساتھ کر لیا گیا تھا۔ اس ضلع کی آب وہوا نہایت خراب تھی۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ½ ۲۸ سیر بکتا تھا۔

پرگنۂ الہ آباد

ضلع کانپور۔ پہلے اس ضلع سے بے اندازہ مالگزاری وصول کی جاتی تھی مگر اب اس میں کمی کر دی گئی تھی۔ اس ضلع کے اکثر حصوں میں تمام زمین زیر کاشت تھی اور اس کے لگان کا بھی تعین ہو چکا تھا۔ نہروں سے آبپاشی ہونے کے سوا کانپور میں مطالبۂ سرکار میں اضافے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس لیے موجودہ دھارا دوامی متصور ہونا چاہیئے۔"

ضلع فتح پور۔ ضلع فتح پور پر بھی مذکورالصدر بیان صادق آتا ہے۔ "نہروں کے ذریعہ آبپاشی ہونے پر جو اضافہ ممکن ہے اس کے سوا موجودہ لگان دوامی متصور ہونا چاہیئے۔"

ضلع الہ آباد۔ گزشتہ زمانے میں یہ ضلع بے اندازہ مالگزاری کی آفت سے بچ گیا تھا نہروں کے ذریعہ آبپاشی ہونے سے جو اضافہ ہو سکتا ہے اس کے سوا "موجودہ بندوبست کو دوامی ہی سمجھنا چاہیئے۔"

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ۲۷ سیر ملتا تھا۔

پرگنۂ بنارس

ضلع اعظم گڈھ۔ یہ ضلع نہایت زرخیز تھا۔ یہاں ذرائع آبپاشی بھی اچھے تھے اور کاشت بھی خوب ہوتی تھی۔ بعض حصوں کی مالگزاری کا کاملاً تعین ہو چکا تھا اور اس میں آئندہ اضافہ نہیں ہونا چاہئے۔ باقی حصوں میں "موجودہ میعاد کے ختم پر کاشت میں اضافہ کے تناسب ایک واجبی اضافہ ہو سکتا ہے لیکن دھارا نہیں بڑھانا چاہئے۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ روپے کو ½۲۹ سیر تھا۔

ضلع گورکھپور۔ یہ ضلع نہایت زرخیز تھا اور اس کی عام حالت بھی بہت اچھی تھی۔ آئندہ کاشت نیز دھارے میں اضافہ ہونے پر سرکاری محاصل میں اضافے کی توقع کی جا سکتی تھی۔

یہاں گیہوں کی اوسط قیمت یہ تھی کہ گیہوں روپے کو ۳۱ سیر تھا۔

برڈ کے بندوبست کے نتائج ذیل کے اعداد سے جو اس کی رپورٹ کے ضمیمہ نقشوں سے لیے گئے ہیں تفصیلی طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس نقشے میں دس روپے ایک پونڈ انگلیشیہ کے مساوی قرار دیے گئے ہیں:

پرگنہ	ضلع	مجموعی رقبہ (ایکڑ)	زیر کاشت زمین (ایکڑ)	برڈ کا مشخصہ محصول اراضی (پونڈ)
دھلی	دھلی	۳۶۴۵۳۴	۱۷۴۶۰۵	۳۶۳۳۷
	رہتک	۸۴۴۶۶۶	۴۷۴۴۶۵	۶۲۸۳۱
	گرگاؤں	۱۱۶۰۴۳۷	۶۴۷۳۵۳	۱۰۱۴۲۴
	حصار	۱۶۵۷۹۷۵	۶۹۶۱۴۷	۳۸۰۳۰

میرٹھ	سہارنپور	۱۰۱۸۷۰۵	۶۰۶۸۴۷	۱۰۰۵۵۸
	مظفرنگر	۱۹۱۷۰۶	۳۹۲۳۷۷	۶۷۲۷۴
	میرٹھ	۱۷۷۶۴۳۰	۱۰۳۴۰۱۶	۲۸۱۵۶۱
	بلندشہر	۱۰۲۵۰۹۶	۵۹۲۶۳۰	۹۵۱۶۸
	علی گڈھ	۱۱۱۹۲۳۸	۹۰۰۵۶۲	۱۹۶۴۴۸
روہیلکھنڈ	بجنور	۱۰۲۷۵۳۳	۴۵۹۴۰۹	۱۱۲۲۳۷
	مرادآباد	—	—	۶۶۸۷۰
	بدایون	۱۴۵۰۴۱۸	۷۵۲۱۰۳	۱۱۰۳۰۶
	پیلی بھیت	—	—	۳۹۰۴۹
	بریلی	۱۱۱۶۱۷۴	۶۳۹۵۷۹	۱۲۶۳۴۵
	شاہجہانپور	۱۳۰۹۲۱۱	۶۵۱۵۴۹	۱۰۲۷۰۷
آگرہ	متھرا	۱۰۱۶۱۵۳	—	۱۵۲۷۲۸
	آگرہ	۹۳۵۸۲۵	۶۴۶۸۰۸	۱۳۹۲۹۷
	فرخ آباد	۱۲۴۷۲۸۸	۶۱۴۲۵۳	۱۴۹۵۷۵
	مینپوری	۱۲۸۰۹۲۷	۶۱۳۴۲۲	۱۳۸۲۳۸
	اٹاوہ	۱۰۷۱۷۵۶	۴۷۷۹۰۱	۱۳۱۰۹۳
الہ آباد	کانپور	۱۴۹۷۷۹۵	۷۸۲۲۷۶	۲۱۸۱۵۴
	فتح پور	۹۹۰۵۸۴	۵۰۶۹۰۵	۱۴۱۸۹۳
	الہ آباد	۱۷۹۰۲۴۴	۹۹۷۵۰۸	۲۱۵۶۵۰
بنارس	گورکھپور	۴۵۶۰۰۴۹	۱۹۲۷۲۳۴	۲۰۸۳۵۴
	اعظم گڈھ	۱۶۵۲۲۹۳	۷۷۳۶۱۶	۱۵۱۷۸۸

مارٹنز برڈ نے نو سالہ عرق ریزی کے بعد جس کام کو اس طرح اتمام کے قریب پہنچا دیا تھا وہ اُس صوبے کے لفٹننٹ گورنر کے ملاحظے میں پیش ہوا تو ۱۵ اپریل ۱۸۲۲ء میں اس سربرآوردہ عہدہ دار نے ایک پرمغز یادداشت اس پر قلمبند کی۔ اس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ بندوبست نہایت غور و خوض اور چھان بین کے ساتھ کیا گیا تھا اور اس کا مقصد صرف محاصل میں اضافے کی صورت پیدا کرنا نہ تھا اس نے سالانہ چار اقساط میں مالگزاری وصول کرنے کے طریقے کو منظور کر لیا اور حدود بندی اور تصحیح حسابات کے طریقے کو بھی بہت پسند کیا۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ تنخواہ دے کر ہر موضع میں چوکیداروں کو رکھنا گاؤں والوں کو اچھا نہیں معلوم ہوگا۔ اس نے سخت سے سخت الفاظ میں ان ذیلی عہدہ داروں کو زجر و توبیخ کی جنھوں نے اپنی کارگزاری دکھانے کے جوش میں زیادتی یہ کی کہ ان پٹوں کو بھی بازگشت کرا لیا جن پر لگان معاف تھا۔

"بغیر دریافت کیے بندوبست کے عہدہ داروں نے چپہ چپہ زمین جس پر لگان تک معاف تھا اور جس کی دیہی کتابوں میں کھتاونی بھی نہیں ہوئی تھی چھین لی حتیٰ کہ دس بیگوں کے اندر جو زمین بعد کے حکم سے بھی لگان سے مستثنیٰ کی گئی تھی اور جو ⅚ اراضی کے زیر کاشت آنے تک کسی صورت قابل محصول نہیں سمجھی جاتی تھی وہ بھی لے لی گئی۔ ضلع فرخ آباد میں تو نہ عہد نامے کے شرائط کی اور نہ ان احکام کی جو سرکار نے براہ راست صادر کیے تھے کچھ پروا کی گئی اور وارن ہیسٹنگز اور لارڈ لیک جیسی ممتاز ہستیوں نے جن کارہائے نمایاں کا سرانجام کیا تھا ان کا بھی مطلق لحاظ نہیں کیا گیا۔"

جس طریقے سے موروثی مالکانِ اراضی کے حقوق میں مداخلت کی گئی تھی اس کی اور زیادہ پُرزور الفاظ میں لفٹننٹ گورنر نے مخالفت کی۔ ذیل میں اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

"راجہ مینپوری کو جس کے پیشرو کی غیر متزلزل وفاداری کا جبکہ ہلکر کا لشکر سنہ ۱۸۰۴ء میں اس ضلع کو تاخت و تاراج کر چکا تھا انگریزی سرکار نے اعلیٰ سے اعلیٰ لفظوں میں اعتراف کیا تھا بغیر حکم سرکار حاصل کیے محض اس مفروضے پر کہ

تعلقدار کے کیا حقوق ہونے چاہئیں ہمیشہ کے لئے نسلاً بعد نسل اس کے ۸۰۵ امواضعات میں سے ۱۱۶ امواضعات میں جو اس کے تعلقہ میں شامل اور انگریزی حکومت قائم ہونے سے کہیں پہلے اس کو ارثاً ملے تھے کسی قسم کی مداخلت کرنے سے محروم کر دیا گیا ہے"۔

ہر موضع کے معاملات میں ہمیشہ مداخلت کرنے کو لفٹنٹ گورنر پسند نہیں کرتا تھا۔" ہر کھیت کی حالت وقتاً فوقتاً قلمبند کرتے رہنے میں ہر موضع یا یوں کہیے کہ موضع کے ہر باشندے کے معاملات میں ہمیشہ عاملانہ مداخلت ضروری ہوتی ہوگی اور لازمی بات ہے کہ کہیں کی رعایا کیوں نہ ہو اس قدر مداخلت جب اس کو ناگوار گزرتی ہے تو اسی طرح ہندوستان کے باشندوں کے لیے بھی یہ بات قابل برداشت نہ ہوگی"۔ لفٹنٹ گورنر کی نظروں میں یہ طریق کار سب کو بالکل مساوی الحیثیت اور یکساں بنا دینے والا تھا اور اس سے آگے چل کر معاشرتی سطح اس قدر ہموار بن جاتی تھی کہ کسانوں اور حکمران طبقے میں مابہ الامتیاز کوئی بات باقی نہیں رہتی تھی کسی دیسی ذریعہ و توسط کے بغیر حکومت کرنا ایک خطرناک تجربہ کرنا ہے اور میری نظروں میں بھی وہ بات ہے جو ہمارے زیر عمل تدابیر میں مضمر ہے"۔

اوپر جو کچھ اقتباس پیش کیا گیا ہے وہ ہر زمانے میں قابل قدر سمجھا جائےگا۔ برڈ کے بندوبست کی بہت کچھ تعریف کی گئی ہے اور بجا کی گئی ہے کیونکہ اس سے شمالی ہند کی زرعی آبادی کو بڑا فائدہ پہنچا۔ انگریزی حکومت کے ابتدائی تیس سال تک محصول اراضی جو حد سے زیادہ اور شدید زحمت کا باعث تھا اس میں ایک اعتدال پیدا ہوگیا اور طویل المیعاد بندوبست عمل میں آنے سے رعایا کو مسلسل پریشانیوں سے نجات ملی مگر یہ بھی ملحوظ رہے کہ جہاں کہیں تمام زمین کی کاشت ہوتی تھی اور لگان کا پورا تعین ہو چکا تھا۔ وہاں اسی لگان کو برڈ کا ارادہ یہ تھا کہ دوامی کر دیا جائے لیکن اس بات کو بعد کے منتظمین مملکت نے بالکل نظر انداز کر دیا۔ برڈ کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ دوسرے اضلاع میں بھی جب وہاں کاشت خوب ہونے لگے تو آیندہ یہی عمل ہونا چاہئے مگر یہ

آرزو بھی کبھی پوری نہ ہوئی۔ برخلاف اس کے سب کو "مساوی الحیثیت اور یکساں کر دینے والی" تدبیریں جن پر ۱۸۴۲ء میں ٹی۔ سی رابرٹسن نے اظہار افسوس کیا تھا ساٹھ سال گزرنے کے بعد اب زیادہ نمایاں بن گئی ہیں۔ شمالی ہند میں موضع کا پٹواری جس کو سرکار کی طرف سے تنخواہ مقرر ہے موقع پاکر آج گویا مالک سیاہ وسفید بن گیا ہے اور اس کو وہ اقتدار حاصل ہے جو جائز طور پر درحقیقت رعایا کے نمایندہ مثلاً موضع کے زمینداروں یا دیہی جماعتوں کو ملنا چاہئے۔ "سب کو بالکل مساوی الحیثیت اور یکساں بنا دینا جس سے آگے چل کر معاشرتی سطح ایسی ہموار ہو جائے کہ کسانوں اور حکمران طبقے میں مابہ الامتیاز کوئی بات باقی نہ رہے" ہندوستان کے لیے دانائی کی حکمت عملی نہیں۔

رابرٹسن کے بعد ۱۸۴۳ء میں جیمز ٹامسن شمالی ہند کا لفٹنٹ گورنر مقرر ہوا اور یہ ایک فیاض نفس اور رحمدل آدمی تھا۔ اس نے دس سال اس صوبے پر حکمرانی کی۔ اس کے تحت متعدد منتظمین مملکت نے نظم ونسق کا کام سیکھا اور تجربہ حاصل کیا جیسے جان لارنس۔ رابرٹ منٹگمری اور ولیم میور جنھوں نے تاریخ ہند میں نہ صرف انتظامی قابلیت بلکہ رعایا کے ساتھ اپنی گہری ہمدردی کا نقش اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ خود ٹامسن ممتاز ترین منتظمین مالگزاری میں سے تھا۔ اس نے ایک طرف تو ان خرابیوں کی اصلاح کی جنکی نشاندہی اس کے پیشروؤں نے کی تھی اور دوسری طرف مارٹنز برڈ کے کام کی تکمیل کی اور ۱۸۴۹ء میں اس بندوبست عظیم کو بھی ختم کر دیا۔ اس کے چار سال بعد جس روز ملکہ کے فرمان سے ٹامسن کو گورنر مدراس کی اعلیٰ تر خدمت پر سرفرازی کے احکام صادر ہوئے اسی روز ۲۷ ستمبر ۱۸۵۳ء میں اس نیک نفس جلیل القدر شخص نے انتقال کیا۔ ایسے ہمدرد عہدہ دار کی مدراس میں جس قدر ضرورت تھی ویسی کہیں نہیں تھی مگر افسوس ہے کہ مدراس کی قسمت میں ٹامسن کی حکمرانی نہ تھی۔

لفٹنٹ گورنری کی خدمت پر مامور ہونے کے بعد ٹامسن نے جو سب سے پہلا اہم کام کیا وہ یہ تھا کہ اس نے ۱۸۴۴ء میں "عہدہ داران بندوبست کے لیے ہدایات" مرتب کیے اور یہی ہندوستان کا سب سے پہلا مکمل "قانون بندوبست"

یہ قانون ۱۹۵ فقروں پر مشتمل ہے اور اس میں وہ سب اصول اور طریق کار مقرر کر دیے گئے ہیں جن کے موافق شمالی ہند میں بند وبست کیا گیا تھا۔ اس کے چند شرائط ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں۔

"۵۲۔ یہ مناسب ہوگا کہ بند وبست کے اندرون میعاد مالک اراضی کی جو کچھ خالص پیداوار سمجھی جاتی ہے اس میں سے دو ثلث سے زیادہ حصے کا سرکار کو مطالبہ نہیں کرنا چاہیئے۔ باقی ایک ثلث مالک اراضی کے لیے بطور منافع چھوڑ دینا چاہیئے جس سے وہ مجمع کے مصارف بھی ادا کرسکے۔ خالص پیداوار کے یہ معنی ہیں کہ مصارف کاشت کی (جس میں سرمایہ پر منافع اور محنت کی اجرت بھی شامل ہے) منہائی کے بعد محاصل جاگیر میں جو فاضلات ہوں۔ اگر جاگیر کلیتاً ان لوگوں کے زیر قبضہ ہے جو اس کے مالک بھی ہیں اور کاشت بھی کرتے ہیں تو خالص پیداوار سے مطلب ان کے سیریات کی کاشت کا منافع ہے اور اگر یہ جاگیر ان لوگوں کے زیر قبضہ ہے جو اس کے محض مالک ہیں اور کاشت نہیں کرتے بلکہ انھوں نے ایک مقررہ دھارے پر اسامیوں کے نام زمین کا پٹہ کر دیا ہے تو خالص پیداوار سے مطلب جاگیر کا خام لگان ہوگا۔"

"۱۲۸۔ لگان مقررہ پر کاشتکاروں نے جو بعض زمینیں لی ہیں ان پر قبضہ قائم رکھنے کا کاشتکاروں کو حق حاصل ہے اور جب تک یہ لوگ اپنے ذمے کی رقم ادا کرتے رہیں اپنے کھیتوں سے بے دخل نہیں کیے جاسکتے۔ اگر یہ کاشتکار لگان کی وہ رقم ادا ہی نہیں کرتے جس کا مطالبہ قانوناً جائز ہے تو مالک اراضی ادائے بقایا کے لیے ان پر نالش کرسکتا ہے اور اپنے حق میں فیصلہ حاصل کرنے کے بعد بھی اگر اپنی واجب الوصول رقم وصول نہیں کرسکتا تو پھر ان کاشتکاروں کو کھیتوں سے بے دخل کرکے زمین پر خود قبضہ حاصل کرنے کی کلکٹر کے پاس درخواست پیش کرسکتا ہے۔"

"۱۲۹۔ اسامی غیر دخیل کار کو جس سال انھوں نے کھیتوں کی کاشت کی ہے اس مدت سے متجاوز اراضی پر کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔

"۱۵۴۔ جہاں متعدد مشترکہ اسامیاں ہوتی ہیں جیسی دیہی جماعتیں تو

معمول یہ ہے کہ ان میں سے دو ایک کا انتخاب کر لیا جاتا ہے اور یہ انتظام کر دیا جاتا ہے کہ باقی رعیت انھیں منتخبہ اسامیوں کے توسط سے سرکار کو مالگزاری ادا کرتی رہے یہ مشترکہ اسامیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک تو "مالگزار" (مالگزاری ادا کرنے والی) اور دوسری "پٹی دار" (بلا اشتراک غیرے قابض زمین) لیکن صرف صدر "مالگزاروں" کے ساتھ سرکار محاصل کا قرار داد کرتی ہے اور یہی لوگ براہ راست سرکار کو مالگزاری ادا کرتے ہیں۔ ان کو عام طور پر "نمبردار" بھی کہا جاتا ہے۔"

"۱۵۹۔ سیاہۂ حقوق کی ترتیب کا طریقہ اب بیان کرنا باقی ہے۔ .... یہ سیاہۂ دوامی ہونا چاہیئے۔ گویا یہ ایک حقوق کی سند ہوگی جس کو دیکھ کر ان اشخاص کے حق میں جن کو اراضی سے کچھ بھی تعلق ہے یا جو اس طرح کی دلچسپی پیدا کرنے کی فکر میں ہیں قطعی تصفیہ کیا جا سکے گا۔ سب سرکاری عہدہ دار مثلاً کلکٹر مجسٹریٹ اور بالخصوص جج رعیت کے معاملات کے تصفیہ کے کے وقت اسی سیاہۂ حقوق کو پیش نظر رکھیں گے۔"

آج کل کے ہندوستان کے منتظمین مملکت نے ان قواعد میں ان چند اصول کو تاڑ لیا ہوگا جو بعد میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے "قوانین لگان" میں شریک کیے گئے تھے۔

شمالی ہند کا بندوبست ۱۸۴۹ء میں مکمل ہونے کے بعد آخر کار مجلس نظماء کے پاس پیش ہوا۔ نظماء نے اپنے ۱۳ راگست ۱۸۵۱ء کے اہم مراسلے میں اس عظیم الشان کارنامے پر تبصرہ کیا۔ مارٹنز برڈ کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد جن زمینوں پر اس نے محصول لگایا تھا ان پر نظر ثانی اور جمع میں اس طرح تخفیف کی گئی کہ بہت سی حقیت اراضی جس پر محصول معاف تھا محصول سے مستثنےٰ ہی رکھی گئی چنانچہ نظماء کے مراسلے میں جو اعداد درج ہیں ان میں اور برڈ کی رپورٹ کے اعداد میں جن کی تفصیل قبل ازیں کر دی گئی ہے بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔

ذیل میں مجلس نظماء کے مراسلے کے اعداد کی تفصیل پیش کی جاتی ہے جس میں دس روپے ایک پونڈ انگلیسیہ کے مساوی قرار دیئے گئے ہیں،

ضلع	جملہ محصول اراضی پونڈ	ضلع	جملہ محصول اراضی پونڈ
سہارنپور	۹۰۴۴۳	فتح پور	۱۳۹۷۶۷
مظفرنگر	۶۷۲۷۴	الہ آباد	۲۱۸۹۹۵
آگرہ	۱۵۵۴۰۱	اعظم گڈھ	۱۳۵۷۴۱
فرخ آباد	۹۲۱۷۳	جونپور	۱۲۳۱۳۳
مینپوری	۱۳۸۲۱۳	بنارس	۸۱۷۰۶
اٹاوہ	۱۳۱۱۰۳	مرزاپور	۶۷۰۶۸
بجنور	۸۲۷۵۵	دھلی	۳۵۷۹۴
مرادآباد	۱۳۳۴۶۳	پانی پت	۸۰۷۷۸
پیلی بھیت	۳۷۵۸۹	حصار	۳۸۰۲۰
بریلی	۱۰۰۷۰۶	روہتک	۶۲۸۳۱
شاہجہاں پور	۱۰۲۷۰۷	گرگاؤں	۱۰۸۸۴۸
کانپور	۲۱۸۱۵۴	....	....

بعض اضلاع مثلاً آگرہ۔ مرادآباد۔ الہ آباد اور گرگاؤں کے اعداد میں بمقابل برڈ کے اعداد کے بہت کچھ بیشی نظر آتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اس لیے ہو کہ جب برڈ نے اپنی رپورٹ پیش کی تھی اس وقت بندوبست مکمل نہیں ہوا تھا۔ دوسرے اضلاع مثلاً سہارنپور۔ فرخ آباد۔ بجنور۔ پیلی بھیت۔ بریلی اور فتح پور میں معتدبہ تخفیف وقوع میں آئی ہے۔

بندوبست کے تحت دہ سالہ مدت میں شمالی ہند میں سرکار کا مطالبہ کیا رہا ہے اور جمعبندی کی رقم کتنی وصول ہوی ہے۔ وہ ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا:

سال	مطالبۂ سرکار	مقدار جمع
سنہ ۱۸۳۸ء سے ۱۸۳۹ء تک	۴۵۵۴۸۹۹	۳۶۳۰۲۱۵

سنہ ۱۸۳۹ء سے سنہ ۱۸۴۰ء تک	۴۱۲۰۶۶۸	۳۵۶۵۲۸۱
سنہ ۱۸۴۰ء سے سنہ ۱۸۴۱ء تک	۳۷۶۴۲۶۱	۳۴۷۰۴۰۲
سنہ ۱۸۴۱ء سے سنہ ۱۸۴۲ء تک	۴۱۶۱۹۰۳	۳۸۸۳۳۵۷
سنہ ۱۸۴۲ء سے سنہ ۱۸۴۳ء تک	۴۳۹۱۸۹۰	۴۰۴۸۸۱۲
سنہ ۱۸۴۳ء سے سنہ ۱۸۴۴ء تک	۴۳۴۹۴۱۵	۴۱۱۰۵۱۴
سنہ ۱۸۴۴ء سے سنہ ۱۸۴۵ء تک	۴۳۴۵۸۸۲	۴۱۲۸۷۴۴
سنہ ۱۸۴۵ء سے سنہ ۱۸۴۶ء تک	۴۳۰۱۸۳۷	۴۲۰۰۳۴۱
سنہ ۱۸۴۶ء سے سنہ ۱۸۴۷ء تک	۴۳۰۷۷۰۰	۴۲۳۲۱۲۲
سنہ ۱۸۴۷ء سے سنہ ۱۸۴۸ء تک	۴۲۹۲۱۶۶	۴۲۴۸۵۸۲

اس بندوبست کے سب مفید نتائج اس نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ اس دہ سالہ مدت کی ابتدا میں مطالبہ سرکار بہت بڑا تھا لیکن تقریباً دس لاکھ پونڈ انگلیشیہ کا بقایا رہ گیا تھا۔ جب ختم مدت پر مطالبے میں تخفیف کر دی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطالبے کی تقریباً کُل رقم وصول ہو گئی۔

ان واقعات اور اعداد پر تبصرہ کرتے ہوئے نظماء نے ہندوستان کے ملازمین دیوانی کو اس کارِ عظیم کے سرانجام پر مبارکباد دی اور رابرٹ مارٹنز برڈ کی کارگزاری پر بطور خاص اظہار پسندیدگی فرمایا۔

اس میں شک نہیں کہ ملازمین دیوانی اور مارٹنز برڈ دونوں نظماء کی اس قسم کی تعریف ہی کے مستحق تھے مگر پھر بھی ان کا کام ابھی تک ادھورا ہی ہے۔ درحقیقت اس تمام تعمیر کا سنگ بنیاد ہی متزلزل ہے۔ کیونکہ تمام پرگنے پر محصول اراضی کا مقرر کر دینا محض قیاسات پر مبنی تھا اور اس کے علاوہ محصول اراضی صرف غیر متیقن ہی نہ تھا بلکہ بہت زیادہ بھی تھا۔ ٹامسن کے ”ہدایات“ کے (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) قاعدہ (۵۲) کی رو سے مطالبہ سرکار خالص پیداوار کے دو ثلث حصے تک پہنچ سکتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پھر بھی یہ قاعدہ رحمدلی پر مبنی تھا کیونکہ انگریزی سرکار نے سنہ ۱۸۲۲ء میں ۸۳ فی صدی اور سنہ ۱۸۳۳ء میں ۷۵ فی صدی کا مطالبہ کیا تھا۔

پھر بھی اس قاعدے کے تحت پورا مطالبہ کرنے سے شمالی ہند کے مالکان اراضی اور کاشتکاروں کے پاس کچھ باقی نہیں رہتا تھا اور یہ مطالبہ ان کے لیے درحقیقت سخت تباہ کن تھا۔ سنہ ۱۸۵۱ء کے مراسلے پر نظام کے دستخط کرنے کے چند ہی سال بعد یہ دردناک حقیقت آشکارا ہوئی۔

جدید بندوبست شروع کرنے کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اس مسئلے پر کہ زمین کی خالص پیداوار میں سرکار اور مالکان اراضی کو کیا حصۂ متناسبہ ملنا چاہیے از سر نو غور و خوض کرنے کا پھر موقع آ پہنچا۔ تجربے سے یہ ثابت ہوا تھا کہ ۶۶ فی صدی محصول جس کا سرکار نے اب اب تک مطالبہ کیا تھا بہت زیادہ اور ناقابل عمل تھا۔ ٹامسن کا قاعدہ (۵۲) حد درجہ تکلیف دہ ثابت ہوا تھا اور مالکوں اور کاشتکاروں کی نظروں میں اراضی قابل قدر ملک نہیں رہی تھی۔ ٹامسن کے قواعد پر نظر ثانی ضروری معلوم ہوتی تھی اسی لیے ۱۸۵۵ء میں جدید قواعد اس غرض سے نافذ کیے گئے کہ "ان اشکال میں جو عہدہ داران بندوبست کے لیے ہدایات کی اشاعت کے وقت اس رسالے سے حذف کردیے گئے تھے یا اس رسالے میں ان کی تفصیل درج نہ تھی اور اگر تھی بھی تو جو کچھ اس میں لکھا تھا اس کی ترمیم بعد کے احکام سے سرکار نے کردی تھی کلکٹر کی رہنمائی کی جائے"۔ چونکہ یہ قواعد جدید ضلع سہارنپور کے مکرر بندوبست سے متعلق صادر ہوئے تھے اسی لیے عام طور پر ان کو "قواعد سہارنپور" کہا جاتا ہے:-

"قواعد سہارنپور" میں سب سے اہم قاعدہ (۴۴) ہے جس کی رو سے محصول اراضی جاگیر کی خالص پیداوار یا خالص لگان کے ۶۶ فی صدی کے بجائے ۵۰ فی صدی کردیا گیا۔ اس قاعدے کی عبارت حسب ذیل ہے:-

"کسی جاگیر کا اثاثہ بالتفصیل معلوم نہیں کیا جا سکتا لیکن بمقابل پہلے کے اب اوسط خالص اثاثے کے متعلق زیادہ صحیح معلومات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے اراضی پر بے انتہا محصول لگا دینے کا امکان اب زیادہ ہے کیونکہ اس میں شک نہیں کہ دو ثلث یعنی ۶۶ فی صدی حقیقی اوسط اثاثے کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ معمولی طور پر مالکان اراضی یا دیہی جماعتیں کسی طویل مدت تک اس کو ادا نہیں کر سکتیں

اسی سبب سے سرکار نے "عہدہ داران بندوبست کے لیے ہدایات" نامی رسالے کے فقرہ (۵۲) میں جو قاعدہ درج ہے اس کی اب یوں ترمیم کی ہے کہ جاگیر کے اوسط خالص اثاثے کا ۵۰ فی صدی مطالبۂ سرکار مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر جاگیر کی جمع اس کے خالص اوسط اثاثے کا نصف حصہ مقرر کر دی جائے بلکہ یہ ہے کہ اس اثاثے اور دوسرے مواد پر غور کرتے وقت کلکٹر اس بات کو ملحوظ خاطر رکھے کہ پہلے کی طرح خالص اثاثے کا دو ثلث نہیں بلکہ تقریباً نصف حصہ جس کو نہایت تحقیق کے ساتھ معلوم کیا گیا ہو مطالبۂ سرکار مقرر کر دینا چاہیے کلکٹر کو یہ بھی چاہیئے کہ مذکور الصدر رسالے کے (۷۴) فقرے سے (۵۱) فقرے تک جو تنبیہ کی گئی ہے اس کو پیش نظر رکھنے اور جاگیر زیر بندوبست کے اوسط خالص اثاثے کو بلا کم و کاست دریافت کرنے کی بے سود کوششوں میں تضیع اوقات نہ کرے"۔

آج کل ہندوستان میں مالگزاری کا تعین اسی قاعدے پر مبنی ہے نصف صدی کے بے اندازہ مالگزاری اور دوسری غلطیوں کے بعد انگریزی سرکار نے نصف لگان یعنے زمین کی نصف خالص پیداوار تک اپنے مطالبے کو محدود رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور رفتہ رفتہ ہندوستان کے اور اقطاع میں بھی جہاں مالگزاری کا دوامی تعین نہیں ہوا تھا یہی طریقہ پھیل گیا۔ صوبۂ متوسط اودھ اور پنجاب میں ان ممالک کے الحاق کے بعد ہی طریقہ رائج کیا گیا۔ مدراس و بمبئی جیسے صوبوں میں بھی جہاں عموماً کاشتکار بلا توسط مالکان اراضی براہ راست سرکار ہی کو مالگزاری ادا کرتے تھے وزیر ہند نے یہی طریقہ ۱۸۶۴ء کے مراسلے کے ذریعہ نافذ کر دیا۔

چوتھا باب

بمبئی میں بندوبست اراضی

مارکوئیس ہیسٹنگز کے عہد حکومت میں ہندوستان کی مغربی سرحد جلد جلد اور آگے بڑھا دی گئی اور آخری جنگ مرہٹہ کے بعد ۱۸۱۷ء میں دکن کا تمام علاقہ انگریزی حکومت کے تحت آگیا۔ اس نومقبوضہ علداری پر سب سے پہلے مونٹ اسٹوارٹ الفنسٹن نے ۱۸۱۹ء میں ایک قابل قدر رپورٹ پیش کی اس کے بعد ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۲ء میں چپلین نے بھی دو رپورٹیں پیش کیں۔ ان سے مرہٹوں کی سابقہ علداری کی زرعی حالت کے ساتھ ساتھ کسانوں کے حالات پر بھی بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

الفنسٹن نے یہ لکھا تھا کہ دکن میں مرہٹہ حکومت کی سب سے اہم صورت حال یہ تھی کہ تمام دیہات کو قصبات یا دیہی جماعتوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا۔ "ان میں مختصر پیمانہ پر سب کچھ موجود تھا جو ایک مملکت میں ہوتا ہے۔ کسی وقت اگر ان کی محافظت کے لیے کسی قسم کی حکومت بھی باقی نہ رہے تو یہ آپ اپنی حفاظت معقول طریقے پر کر سکتے ہیں"۔

پونے کے کپتان رابرٹسن نے لکھا تھا کہ "پٹیل جو دیہی جماعت کا صدر ہوتا تھا سابق زمانے میں اور اب بھی ایک مجسٹریٹ کی حیثیت رکھتا ہے جو حکومت کا مقرر کردہ اور دیہی جماعت کے ارادہ مجموعی سے قائم ہے۔ وہ ان

سب باتوں کی پابندی کراتا ہے جو انگلستان میں شخصیہ کے قوانین مقامی کہلاتے ہیں
سابق میں وہ اس جماعت کے مصارف اور اس جماعت کے صدر ہونے کی حیثیت
سے اپنا وقار برقرار رکھنے کے لیے معقول رقم چندے سے جمع کرلیتا تھا۔ اب وہی
اس انجمن کی فلاح و بہبود کی خاطر اصلاح کی تدبیریں سوچتا ہے اور اس انجمن کے
ارکان سے امن عامہ قائم رکھنے میں ہر طرح کی مدد لیتا ہے۔ سابق کی طرح اب بھی
وہ ایک بزرگ خاندان کی حیثیت سے ان دیوانی مقدمات کا انفصال کرتا ہے
جن میں لوگ اس کو اپنی خوشی سے ثالث یا پنچ مقرر کرتے ہیں اور ان کارروائیوں
میں یہ سرپنچ ہوتا ہے جن میں یہ خود یا فریقین مقدمہ ما بہ النزاع امور کے تصفیے کے
لئے دوسروں کو پنچ مقرر کرتے ہیں۔"

دوسری اہم صورت حال مرہٹوں کے عہد حکومت میں یہ تھی کہ کسان مالک
اراضی بھی تھے اور خود اپنی زمینوں کی کاشت بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ اس لیے "میراث
دار" کہلاتے تھے کہ اپنے کھیتوں کے یہی موروثی حقدار تھے۔ الفنسٹن بیان کرتا ہے
کہ "کثیر التعداد رعیت اس شرط پر اپنی اراضی کی مالک ہے کہ وہ ایک مقررہ
لگان سرکار کو ہمیشہ ادا کرتی رہے۔ ان کی یہ ملک موروثی ہے اور فروخت
بھی ہو سکتی ہے۔ جب تک وہ محصول اراضی ادا کرتے رہتے ہیں ان کو اپنی مقبوضہ
اراضی سے کبھی بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔" کپتان رابرٹسن لکھتا ہے کہ "ایسی حقیت
اراضی کی اصلی بنیاد دیکھی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگلستان کی کسی ایسی
ملک مطلق سے کم حیثیت ہرگز نہیں جو ہر طرح کی نزع سے بالکل پاک ہو۔" چیپلین
کہتا ہے کہ "میراثی حقیت اراضی مفتوحہ عملداری کے اس حصے میں جو دریائے
کرشنا سے لے کر مغربی گھاٹیوں تک چلا گیا ہے عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔" اور
مسٹر چیپلین یہ بھی کہتا ہے کہ "کلکٹر پونا کا میراث داروں کے تحفظ حقوق کی حمایت
کرنا بالکل درست ہے چنانچہ متعدد مقامات میں اس نے نہایت شد و مد کے
ساتھ اس بات کی جانچ بھی کی ہے۔ لیکن مجھ کو یہ یقین ہے کہ آج تک کسی نے
ان کے حقوق پر حملہ کرنے کا خیال تک نہیں کیا تو پھر اب اس مسئلے پر زیادہ
بحث کرنا فضول ہے۔"

بڑے افسوس کی بات ہے کہ مفتوحہ عملداری پر انگریزوں کی حکومت ہوئے ابھی ایک پشت بھی نہیں گزری تھی کہ میراث داروں اور دیہی جماعتوں جیسے دو قدیم اداروں کا دراصل خاتمہ ہی ہو گیا۔ ہر کاشت کار سے براہ راست انتظام اور اندازہ ہر بندوبست پر کاشتکار کے مقررہ لگان پر نظر ثانی کرنے کا تہیہ کر لیا گیا تھا جس سے دیہی جماعتیں کمزور ہو گئیں اور میراثی حقوق کچھ باقی نہ رہے۔ کوئی غیر جانبدار مورخ ایسا بھی نافہم نہ ہو گا کہ مرہٹوں کی حکمرانی کا جس میں جنگ وجدل لا متناہی ہوتے تھے انگریزوں کی حکمرانی کے ساتھ جس میں رعایا کو حفظ دامن حاصل تھا مقابلہ کرے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ کوئی غیر جانبدار مورخ ایسا بھی نہ ہو گا جو ان قدیم خود اختیاری حکومت رکھنے والے اداروں کے انحطاط پر اور قدیم اسامیوں کے حقوق زائل اور اراضی کے بار سنگین میں یوں اضافہ ہو جانے پر جب کہ یہ سب کچھ انگریزی نظم ونسق کا نتیجہ ہے اظہار افسوس نہ کرتا ہو۔ یوں تو کسی ملک کے حکومت خود اختیاری رکھنے والے دیسی اداروں کا میٹ دینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں مگر بالخصوص ایک پردیسی راج کے لیے جس کو رعایا کے فطری رہنماؤں اور نمائیدوں سے راہ رکھے بغیر ان کے حالات اور امنگوں سے کبھی واقفیت ہی نہیں ہو سکتی یہ بڑی نادانی کی بات ہو گی۔ انگریزوں کو دکن فتح کیے پچیاسی سال ہو چکے لیکن دیہی جماعتوں کے مماثل حکومت خود اختیاری کا کوئی اور نظام ان کے بجائے آج تک قائم نہیں کیا گیا۔

دکن کی فتح کے ساتھ ہی مختلف اضلاع میں عارضی طور پر بندوبست کر دیا گیا تھا مگر بمبئی کی ملازمت دیوانی کے مسٹر پرنگل نے ۱۸۲۴ء سے باضابطہ پیمائش کے بعد بندوبست کرنا شروع کر دیا اور پرنگل کا طریقہ ہی ۱۸۳۰ء تک جاری رہا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ کھیتوں کی پیمائش کے بعد مختلف النوع اراضی کے تخمینہ پیداوار پر پرنگل نے محصول اراضی کا تعین کر دیا تھا جس سے پیداوار کا ۵۵ فی صدی حصہ حق سرکار ہوتا تھا۔ لیکن پیمائش غلط ہوئی تھی۔ پیداوار کا تخمینہ بھی صحیح نہ تھا اور سرکاری مطالبہ بھی حد سے زیادہ تھا اسی لیے بندوبست کا عمل رعایا کے لئے موجب سختی و آزار ثابت ہوا۔" اگر کسان مطالبہ سرکار ادا نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے تھے تو ان بدبختوں سے

ان کے مقدور کی انتہا تک وصول کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز کوششوں سے کبھی دریغ نہیں کیا جاتا تھا جو نہایت ظالمانہ اور قابل نفرت ہونے کی وجہ سے بیان سے باہر ہیں۔ اکثر تو گھروں کو چھوڑ کر آس پاس کی دیسی ریاستوں میں روپوش ہو گئے تھے۔ زمین کے بڑے بڑے خطے بے کاشت پڑے ہوئے تھے اور بعض اضلاع میں تو قابل کاشت رقبے کا ایک ثلث سے زیادہ حصہ رعایا کے زیر قبضہ نہ تھا۔"

۱۸۳۵ء میں گولڈاشمڈ اور لفٹنٹ ونگیٹ نے مکرر پیمائش شروع کر دی اور وہ اصول قائم کر دیے جن پر بمبئی کا نظام مالگزاری آج تک بھی چلا آ رہا ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیسے شمالی ہند کے موجودہ نظام بندوبست کا آغاز سال ۱۸۳۳ء سے ہوا اسی طرح بمبئی کے موجودہ نظام بندوبست کی ابتداء ۱۸۳۵ء سے ہوئی۔ اور بمبئی اور شمالی ہند دونوں جگہ انھیں سنین سے طویل المیعاد ۳۰ سالہ بندوبست عمل میں آنے لگے تھے۔

گولڈاشمڈ اور ونگیٹ نے جو منصوبہ اختیار کیا تھا وہ بالکل سیدھا سادہ تھا۔ انھوں نے زرخیزی کے لحاظ سے اراضی کی نو ۹ قسمیں قرار دی تھیں۔ ہر ضلع کے موجودہ حالات اور سابقہ سرگزشت دریافت کرنے کے بعد اس پر محصول اراضی کا وہ تعین کر دیتے تھے اور اس وصول طلب رقم کو اسی ضلع کے تمام مواضعات اور کھیتوں پر منقسم کر دیتے تھے۔ ہر کھیت کے مالک پر فرض تھا کہ اپنے کھیت پر معینہ محصول اراضی ادا کر دینے کے بعد اس کی کاشت کرے۔" مہتمم بندوبست کاشتکار سے کچھ پوچھنے کے بغیر محصول اراضی کا تعین کر دیتے تھے اور جب نرخ نامہ مالگزاری کا رواج پڑا تو یہ ہونے لگا کہ ہر کھیت پر آئندہ کیا دھار لگایا جائے گا اس سے ہر کھیت کے مالک کو کلکٹر اپنے پاس طلب کر کے آگاہ کر دیتا تھا۔ اگر وہ ان شرائط پر کھیت اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا تو اس کی خوشی اور نہ رکھنا چاہتا تھا تو اس کی مرضی۔"

ناظرین خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ اس سیدھے سادھے منصوبے میں دکن کی دیہی جماعتیں بالکل نظر انداز کر دی گئی تھیں اور میراثی اسامیوں کو ایک مقررہ شرح محصول پر اپنی موروثی اراضی پر قبضہ رکھنے کا جو حق حاصل تھا وہ بھی

زائل ہو گیا تھا۔ انگریز منتظمین مملکت کی نظروں میں ہر اسامی سے فرداً فرداً بلاتوسط غیرے بندوبست کر لینا ہی بڑی دانائی تھی اور انہوں نے ہر کھیت پر اپنی مرضی کے موافق محصول لگا دیا۔ اس طرح محصول اراضی کا بالجبر تعین کرنا بھی کم و بیش قیاسات ہی پر مبنی تھا اور اسی لیے اس میں بھی وہی نقص رہ گیا تھا جو محصول کی متغیر مقدار سے شمالی ہند کے نظام میں موجود تھا۔ عہدہ داران بندوبست کے مختلف طبائع کے موافق اس کا تعین ہوتا تھا کہ جہاں وہ سخت گیر ہوئے محصول سنگین ہو گیا اور جہاں انہوں نے اعتدال سے کام لیا محصول بھی مبنی بر اعتدال ہو گیا۔ اگر کسی بندوبست میں حوادث زمانہ کے واقع ہونے سے اعتدال پیش نظر رہتا تھا تو خوش حالی کے آثار نظر آتے ہی دوسرے بندوبست پر اعتدال تشدد سے مبدل ہو جاتا تھا جب تک بندوبست کے عہدہ دار ہر نئے بندوبست پر اپنی مرضی کے موافق محصول اراضی میں کمی و بیشی کرنے کے مجاز تھے اس وقت تک زرعی دولت کا اجتماع بالکل ناممکن تھا اور جب تک مطالبۂ سرکار کے یوں زبردستی بڑھ جانے کو کسی صورت کسان روک نہیں سکتے تھے اس وقت تک وہ اپنی حالت مستقل طور پر درست نہیں کر سکتے تھے۔

صدر مجلس مالگزاری اور حکومت ہند نے رعیت واری بندوبست کی اس کمزوری کو تاڑ لیا تھا اور اسی زمانے میں اس بندوبست کی بدترین شکل مدراس میں نظر آتی تھی۔ سر ٹامس منرو کی وفات سے دس سال بعد مدراس کے کاروبار میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ محصول اراضی بڑھ کر گھٹ جانے کے بعد پھر بڑھ گیا تھا۔ اس طرح لگان کی غیر معینہ مقدار کی خرابی تو پہلے ہی سے موجود تھی اب وہ بے اندازہ بھی ہو گئی۔ مطالبۂ مالگزاری کی بے اندازہ رقم نہ وصول ہو سکتی تھی نہ کبھی وصول ہوئی تھی کسان مٹی میں مل گئے اور ملک کے اس سرے سے اس سرے تک زرعی بدحالی پھیل گئی۔ اس نظام کی مخالفت میں صدر مجلس مالگزاری نے صدائے احتجاج بلند کی۔
صدر مجلس کے اس مراسلے کی نقل بمبئی بھیجی گئی۔ اگرچہ اس مراسلے کا مطمح نظر مدراس کے حالات تھے مگر اس میں خود رعیت داری نظام پر حملہ کیا گیا تھا لیکن گولڈ اشمڈ اور ونگیٹ چونکہ بمبئی میں اسی نظام کی ترویج کر رہے تھے اس لیے انہوں نے اس کی

حمایت پر کمر باندھی۔ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۸۲۰ء کے مراسلے میں انہوں نے جواب دیا کہ مدراس کی زبون حالت رعیت واری نظام کی وجہ سے نہیں بلکہ حد سے زیادہ محصول عائد کرنے سے پیدا ہوئی تھی اور یہ بحث کی کہ رعیت واری نظام بشرطیکہ خوش اسلوبی کیساتھ وہ عمل میں لایا جائے رعایا کے لیئے ایسا ہی مفید ہو سکتا ہے جیسا شمالی ہند کا نظام جس کو مارٹنز برڈ نے رائج کیا تھا۔ اس قابلِ ذکر مراسلے کے چند اقتباسات سے شمالی ہند مدراس اور بمبئی کے نظام اراضی پر جو اس وقت زیر تشکیل تھے خوب روشنی پڑتی ہے۔

"۳ شمالی مغربی ممالک میں محصول اراضی بجائے ہر کھیت پر علٰحدہ علٰحدہ مقرر کیے جانے کے جیسا یہاں ہوتا ہے سب جاگیروں پر اگرچہ یہ متعدد اشخاص کے زیر قبضہ ہوتی ہیں ایک ساتھ معین کر دیا جاتا ہے کبھی تو پورا ایک موضع ہی جاگیر ہوتا ہے کبھی موضع کا کچھ حصہ اور کبھی کبھی متعدد مواضعات یا مواضعات کے متعدد حصے جاگیر میں داخل ہوتے ہیں اور یہ ایک ہی شخص کی ملک ہونے کے بجائے عموماً متعدد اشخاص کی مِلک ہوتے ہیں۔ ایسی جاگیری اراضی پر بہ حیثیت مجموعی محصول لگا دیا جاتا ہے اور ان اشخاص پر اس کے ادا کرنے کی مشترکہ ذمہ داری رہتی ہے برخلاف اس کے دکن میں موجودہ تقسیم اراضی میں عموماً ہر کھیت کا رقبہ ایسا متوسط قرار دیا گیا ہے کہ اس کی کاشت ایک آدمی تنہا کر سکتا ہے اور یہ تقسیم اراضی ہمارے بندوبست میں بحالہ رکھی گئی ہے اور محصول اراضی ہر کھیت پر علٰحدہ علٰحدہ مقرر کر دیا گیا ہے۔"

"۹۔ .... ہماری نظروں میں حق ملکیت اراضی ایک ہی صورت سے زائل ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس پر ایسی سنگین مالگزاری لگا دی جائے جس میں لگان کلیتاً جذب ہو جائے ورنہ حصول مالگزاری کے بعد بھی کچھ نہ کچھ لگان جب تک بچ رہے گا اس وقت تک لگان کے اس باقی حصے کی بدولت زمین قابل قدر سمجھی جائے گی اور قابض زمین اپنی اراضی کو فروخت کر سکے گا یا کرایہ پر دیسکے گا اور یہی بات قابض کو مالک اراضی قرار دیتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ دریافت کرنا ضروری نہیں کہ آیا سر ٹامس منرو نے حقیقی مالکان اراضی کے حقوق کو نظر انداز کر دیا تھا

یا محض قابضان وقت ہی کے نام سب زمینیں لکھدی تھیں ۔ اور اس طرح سو خزانہ کو مالگزاری محصول ادا کرنے کے ذمہ دار بن گئے تھے مگر ہم تو بلا پس وپیش یہ کہتے ہیں کہ ہمارے بندوبست میں تمام موجودہ حقوق مالکانہ کو تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ اور مالک اراضی کو پوری آزادی دیدی گئی ہے کہ جن شرائط پر وہ چاہئے اپنی اراضی کسی شکمیدار کے نام منتقل کر دے چنانچہ ہر جگہ رعیت اس حق سے استفادہ کرتی ہے ۔"

"۱۱ - ...... ہم نے دکن کے اس حصے میں جہاں تک ہمارا کام ہوا ہے اراضی کے نو درجے قائم کیے ہیں اور ہر قسم کی زمین انھیں مدارج میں سے ایک کے تحت آجاتی ہے کیونکہ ان مدارج کی تعداد ہماری دانست میں کافی ہے"

"۱۵ ...... زرعی طبقے کے موجودہ حالات خاص خاص مواضعات کی حالت سرکاری وصول باقی ۔ پیداوار کی قیمتیں اور اس طرح کی دوسری باتوں کا گزشتہ زمانے سے مقابلہ کرنے کے بعد موجودہ جمع میں کیا اضافہ یا معافی ہونی چاہئے اس کے متعلق اطمینان بخش تصفیہ کرنے کے لیے ہمارے پاس کافی مواد فراہم ہو سکتا ہے[1]"

"۳۹ - مجلس نے اپنے مراسلے کے خاتمے پر ان تمام خرابیوں کا خلاصہ کر دیا ہے جو مجلس کی نظروں میں رعیت واری نظام کی خصوصیات تھیں جیسے ضلع مدراس کی حالت تھی اور اس ضلع کا شمالی مغربی ممالک سے جو موجودہ بندوبست میں نہایت سرسبز حالت میں تھے مقابلہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ موضع وار انتظام بے انتہا بہتر ہے ۔ لیکن ہماری ناچیز رائے میں شمالی مغربی ممالک کی جو بے انتہا برتری نظر آتی ہے ۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ سرکاری مطالبہ وہاں مبنی بر اعتدال ہے اور انتظام مدراس کی ناقابل تردید بدتری کا سبب یہ ہے کہ وہاں محصول اراضی غلطی سے بے انتہا

---

[1] زرعی تمول وخوشحالی کی مزاحمت کے لیے کوئی اس سے زیادہ موثر طریقہ اختراع نہیں کیا جا سکتا کہ "زرعی طبقے کی موجودہ حالت وغیرہ کے لحاظ سے مالگزاری میں کمی وبیشی کرنے کا اختیار عہدہ داران بندوبست ہی کو دیدیا جائے ۔ جب رعیت خوشحال ہوتی تھی تو مالگزاری میں بھی بیشی کر دی جاتی تھی ۔ ایسی صورت میں اصلاح وترقی یا اجتماع دولت کا کیا امکان یا ان کے لیے کیا باعث ترغیب ہو سکتا ہے ؟

لگا دیا گیا تھا "۔

"۴۴ - یہ بھی ہیں باور آتا ہے کہ قومی خوشحالی کے نہایت ہی اہم عناصر جن میں ذیل کے مصرحہ امور کا بھی شمار ہے بندوبست کے اس منصوبے سے حاصل ہو سکتے ہیں جو فی الوقت دکن میں زیر عمل ہے مثلاً ایک مبنی بر اعتدال و مساوی المقدار محصول اراضی لگانا جس سے مالک اراضی یا قابض زمین کے لیئے لگان کا ایک حصۂ متناسبہ بچ رہے یہ بندوبست کی میعاد تیس سالہ ہو یا بندوبست کے اندرون میعاد کسی صورت مطالبے میں اضافہ نہ کیا جا سکے۔ اس اثناء میں جو لوگ اپنی اراضی میں اصلاح و ترقی کریں اس سے وہی کلیتاً مستفید ہوں۔ مشترکہ ذمہ داری اُن چند کارروائیوں تک محدود رہے جہاں کھیت مشترکہ قبضے میں ہوں یا مشترکہ پٹی داروں نے شکمی اراضی کی ایک ذیلی تقسیم آپس ہی میں کر لی ہو، اراضی پر حق مالکانہ کا تسلیم کرنا، مالکان اراضی کو شکمیداروں سے لگان وصول کرنے کے انتظام اور اپنی اراضی کے فروخت کرنے میں پوری آزادی دینا، کھیتوں یا اراضی کے ایسے محدود حصوں پر جو اس ملک کے مالکان اراضی کے عام حالات کے لحاظ سے قابل انتقال متصور ہوتے ہوں، لگان کی ذمہ داری شکمی داروں پر منقسم ہونے کی وجہ سے اراضی کے انتقال قبضہ یا فروخت کے لیے سہولتیں پیدا کرنا۔ صرف زیر کاشت اراضی پر محصول وصول کرنا، اور اس طرح رعیت کو ہر وقت اپنے مقدور کے موافق اپنے حلقۂ محنت کو بڑھانے گھٹانے کی اجازت دینا جو ایک ایسے ملک میں جہاں عشر زراعت پیشہ لوگوں کا سرمایہ نہ صرف بالکل تھوڑا ہے بلکہ موسمی تغیرات کے اثرات سے کم و بیش بھی ہوتا رہتا ہے ایک بہت بڑی رعایت ہو گی"۔

جان ویبرٹ اس رپورٹ اور دوسری ایسی رپورٹوں سے مسلح ہو کر مجلس مالگزاری کے الزاموں سے بمبئی کے نظام کو بری کرنے کے لیے حکومت بمبئی سے مخاطب ہوا۔ اس بات کے ثابت کرنے میں کہ محصول اراضی کی تشخیص میں عہدہ داران بمبئی بھی بالکل انہیں امور کو پیش نظر رکھتے تھے جن کو شمالی ہند کے عہدہ داروں نے ملحوظ رکھا تھا ویبرٹ کو کچھ مشکل نہ ہوئی۔ اس مراسلت کے معائنے سے ناظرین کے دل پر جو پہلا نقش بیٹھتا ہے وہ یہ کہ اگر بمبئی میں تشخیص محصول محض قیاسات پر مبنی تھی تو

شمالی ہند میں بھی تشخیص محصول قیاسات پر مبنی تھی اور شمالی ہند کا بمبئی کو ملامت کرنا ایسا ہی تھا جیسا شیطان کا کسی گنہگار کو اس کے گناہوں پر ملامت کرنا۔ پھر بھی یہ ایک اہم اختلاف تھا کہ شمالی ہند میں کسی جاگیر یا موضع پر بہ حیثیت مجموعی محصول لگایا جاتا تھا اور محض قیاسات پر یہ محصول مبنی ہونے سے اگر اس میں غلطی ہو جاتی تھی تو مالکان اراضی یا زمیندار سب مل کر اس پر اعتراض کر سکتے تھے جس کا کچھ اثر بھی ہوتا تھا مگر بمبئی میں ہر کھیت پر علیحدہ علیحدہ محصول لگایا جاتا تھا اور اگر عہدہ دار سرکاری بندوبست میں کوئی غلطی بھی کر جاتا تھا تو غریب کاشتکار کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔

قارئین کو فوراً محسوس ہو گیا ہو گا کہ ایسے صوبے میں جہاں موروثی زمینداروں اور دیہی جماعتوں کے سے قدیم ادارے اگرچہ بے دست و پا ہی سہی مگر برقرار ہوں اور ایک ایسے صوبے میں جہاں ان قدیم اداروں کو مٹا یا یا بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہو اور ایک طرف حکومت کی مطلق العنانی اور دوسری طرف انفرادی حیثیت سے ہر کاشتکار کی بے بسی دست بگریبان کا مصداق رہے، بہت بڑا اختلاف ہے۔ سطحی نظر رکھنے والے مصنفین کی عادت ہے کہ وہ ہندوستان کے ان درمیانی مالکان اراضی کو ایک طرح کا بار زمین سمجھتے ہیں لیکن پُرمغز اصحاب فکر نے ہندوستان کے معاشی اور معاشرتی حالات پر خوب غور و فکر کرنے کے بعد جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ایک پردیسی حکومت اور ایک زراعت پیشہ قوم کے درمیان جس کا کوئی نمایندہ نہ ہو ایسی ذی اثر جماعتوں کی موجودگی سے جو سیاسی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں ان سے قطع نظر کر کے غور و فکر کرنے والے اشخاص نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ انھیں لوگوں کی رائے اور اثر سے جو اسی ملک کے باشندے اور عوام کے طبقے سے ہوتے تھے نظم و نسق بھی متاثر ہوتا ہے۔ غلطیوں کی اصلاح اور زیادتیوں کی مزاحمت ہوتی ہے نیز حکومت اور رعایا کے درمیان ایک رشتۂ اتحاد قائم ہو جاتا ہے۔ بمبئی اور مدراس کے مقابل شمالی ہند میں انتظام مالگزاری اس لیے زیادہ کامیاب اور محصول اراضی بھی کم مقدار رہا کہ وہاں ذی اثر رہنمایان قوم اور دیہی جماعتیں موجود تھیں جنھوں نے اپنا مدعا آخر منوا لیا۔ نظم و نسق پر اپنا اثر

ڈالا اور محصول کو ایک اعتدال پر لاکر ہی چھوڑا ۔ بمبئی اور مدراس میں سب سے زیادہ افسوسناک غلطی جو ہوی وہ یہ تھی کہ نظم ونسق کی بہتری کے لیے دیہی جماعتوں بالی گھاروں جاگیرداروں اور رعایا کی دوسری ذی اثر جماعتوں سے مدد لینے کی بجائے ان کو بالکل نظر انداز کردیا گیا یا سرے سے میٹ دیا گیا ۔

گولڈ اسمتھ اور ونگیٹ نے اپنے طریق کار کی تائید میں کہا کہ " مالگزاری ادا کرنے کی مشترکہ ذمہ داری اور موضع میں مشترکہ انتظام یہ دونوں باتیں دکن میں عام تھیں لیکن مشترکہ ملکیت کا پتا نہیں چلتا " اگر دیہی جماعتوں کے ذریعہ سے " موضع کا یہ مشترکہ انتظام " جو دکن میں عام تھا یونہیں محفوظ و برقرار رکھا جاتا تو انگریزی راج کو بھی اس سے بہت کچھ فائدہ ہوتا ۔ باوجود اس کے کہ سر جورج ونگیٹ جیسے بہت بڑے اور نیک آدمی کی یاد تاریخ کے ہر متعلم کے دل میں ابھی تک تازہ ہے اور اس کی بڑی وقعت کی جاتی ہے لیکن پھر بھی اس سچی بات کا اخفا نہیں کیا جاسکتا کہ دیہی جماعتوں کو برخاست کرنے اور ہر ضلع میں لکھو کھا کاشتکاروں سے فرداً فرداً لکھو کھا کھیتوں کا بندوبست کرنے میں ونگیٹ نے بہت بڑی غلطی کی ۔ مدراس کی مجلس مالگزاری نے ۱۸۱۸ء میں ایسی غلطی مدراس میں سرزد ہونے پر سخت اعتراض کیا تھا مگر محض بے سود صدر مجلس مالگزاری نے دوبارہ ۱۸۲۴ء میں اس غلطی پر اعتراض کیا مگر اس کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا ۔

اس کے پندرہ سال بعد دار العوام اور دار الامرا کی مجالس منتخبہ کے سامنے ایک بہت بڑے منتظم مملکت کی جو بمبئی کا گورنر تھا شہادت لی گئی اس گورنر کو یہ کہنے کی ہمت ہوی کہ جہاں کہیں رعیت واری نظام کی ترویج کی گئی اور دیہی جماعتوں اور درمیانی مالکان اراضی کو میٹ دیا گیا وہاں کے مزارعین ایسے ہوگئے جیسے کنگالوں کی ایک قوم ۔ یہ شخص سر جورج کلارک تھا اور اس کی شہادت ایسی زبردست اور صریح و صاف تھی کہ اس سے چند اقتباسات یہاں پیش کرنا ضروری ہے ۔

سوال ۔ انتظام اراضی کے کس نظام میں عوام کا زیادہ فائدہ ہے ۔ وہ جو خود رعیت کے ساتھ کیا جائے یا زمیندار کے ؟

جواب ۔ ان دونوں کے مفید عام اشکال جدا جدا ہیں لیکن رعیت واری

نظام ملک کے لیے سب سے زیادہ ضرر رساں ہے ....

سوال ۔ ہماری رعایا کی عام خصوصیت کیا یہ نہیں ہے کہ وہ شروع ہی سے مفلس اور کنگال ہیں ؟

جواب ۔ میرے خیال میں جہاں رعیت واری نظام ہے وہاں یہی حالت ہے ۔

مذکورۂ بالا شہادت ۱۸۵۲ء میں دارالامراء کی مجلس کے سامنے پیش ہوئی تھی اس کے دوسرے ہی سال اس گواہ نے دارالعوام کی مجلس منتخبہ کے سامنے رعیت واری نظام کی خرابیاں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیں ۔

سوال ۔ کیا آپ چند لفظوں میں رعیت واری نظام کے اصول بیان فرمائیں گے ؟

جواب ۔ اراضی کے ٹکڑے ٹکڑے جو ہر کاشتکار کے زیر قبضہ ہیں ان پر بلاتوسط کسی سرکار کا نہایت باریک بینی اور تفصیل کے ساتھ محصول لگانا جس سے یہ کاشتکار پہلے جیسے مفلس اور کنگال تھے ویسے ہی اب بھی رہیں ۔ ان کاشتکاروں اور حکومت کے درمیان کوئی سلسلۂ توسط نہیں ہے ....

سوال ۔ رعیت واری نظام کے متعلق کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ یہ نہ تو حکومت کے لیے کچھ فائدہ مند ہے اور نہ دیسیوں کے حق میں مفید ہے ؟

جواب ۔ یقیناً میرا یہی خیال ہے ۔ ان کاشتکاروں کے اوپر کوئی مالک اراضی ایسا ہے ہی نہیں جو سرمایہ پیدا کرے ۔ یہ کسان اس طبقے کے لوگ ہیں جو کسی ملک میں بھی سرمایہ دار نہیں ہوتے بلکہ یہ محض کاشتکار ہوتے ہیں ....

سوال ۔ شمالی مغربی ممالک میں مالگزاری کا کونسا نظام قائم ہے ؟

جواب ۔ وہاں مختلف حیثیت کے زمینداروں کو جنہیں بعض کے زیر قبضہ ایک موضع ہے اور بعض مشترکہ طور پر ایک ہی موضع کے صدر ہیں نئے بندوبست میں طویل المعیاد پٹے دیدیے گئے ہیں ۔

سوال ۔ کیا یہ بندوبست مسٹر برڈ کے مجوزہ اصول پر ہوا ہے ؟

جواب ۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں لیکن یہ اصول جدید نہیں ہے ۔ بلکہ مسٹر برڈ

کے زمانے سے بھی پہلے کا ہے۔ ہندوستان میں تشخیص مالگزاری کا بہت قدیم طریقہ یہی تھا۔

سوال۔ کیا آپ کی رائے میں یہ اچھی طرح چلتا رہا ہے؟

جواب۔ میرے خیال میں یہ بہت خوبی کے ساتھ چلتا ہے بشرطیکہ مواضعات کے صدر اشخاص سے مل کر تشخیص مالگزاری میں کسی زمیندار کے حقوق پامال نہ کیے جائیں۔

سوال۔ کیا فصل کے نہ ہونے پر زمیندار اپنی حسب عادت رعیت کی امداد کرتے رہتے ہیں؟

جواب۔ جی ہاں!۔

سوال۔ یہ لوگ کس طرح رعیت کی امداد کرتے ہیں؟

جواب۔ زمیندار رعیت کی مدد رقم۔ بیج۔ اناج اور بیلوں سے کرتے ہیں۔ موضع واری یا زمینداری بندوبست میں یہی فائدہ تو ہے۔

اس مجلس منتخبہ کے ارکان کابڈن اور جوزف ہیوم جیسے مشاہیر بھی تھے اور ان کے خاص خاص سوالات کا اس گواہ نے جو جواب دیا ہے اس کا پڑھنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

مسٹر کابڈن۔ آپ نے بیان کیا ہے کہ بمبئی میں رعیت واری نظام میں ایک مشکل یہ بھی تھی کہ دیسی لوگوں میں عام طور پر بد دیانتی پھیلی ہوئی تھی اور جہاں کہیں یورپی اشخاص خدمت پر نہ تھے وہاں وفادار تنظیمِ مملکت کا ملنا ناممکن تھا مگر اس سے پہلے آپ نے اپنی شہادت میں ہندوستانیوں کی صدق بیانی اور عام اخلاق اچھے ہونے کے متعلق بیان کیا تھا پھر اس پہلے اور بعد کے بیان میں کیا مطابقت ہے؟

جواب۔ مجھ کو یہ خیال نہیں ہے کہ میں نے لوگوں میں عام طور پر بد دیانتی پھیلی ہوئی ہے کہا تھا۔ قطعی میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میرے کہنے کا در اصل منشا یہ تھا کہ روپے کی قلت کے باعث اچھے لوگوں کے بجائے کم مواجب دیسی مختاروں ہی سے کام لینا پڑتا ہے اور ان پر رقم مالگزاری کی ارسال یا رعیت واری

نظام کی بالتفصیل پابندی کرنے کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

سوال۔ اگر آبادی کا ایک کثیر حصہ صدق بیان اور دیانت دار ہو تو پھر دیانت دار مختاروں کے ملنے میں کیا مشکل ہے ؟

جواب۔ آپ ایسے لوگوں کے ذمے نہایت نازک اور دشوار فرائض کر دیتے ہیں مگر ان کو اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے کافی تنخواہیں نہیں دیتے ۔۔۔۔۔۔

مسٹر ہیوم۔ آپ نے بیان کیا ہے کہ موجودہ رعیت واری نظام سے کاشتکاروں کی بدکاریوں کی سی حالت بن جاتی ہے اور کس حد تک موضع واری نظام اختیار کیا جا سکتا ہے اس کے متعلق آپ نے اپنے شکوک کا اظہار بھی کیا ہے مگر کیا آپ کوئی ایسا طریقہ بتا سکتے ہیں جس سے بمبئی کے کاشتکاروں کی اصلاح حال ہو سکتی ہے ؟

جواب۔ مجھ کو خیال نہیں پڑتا کہ میں نے موضع واری نظام کے متعلق شبہ کا اظہار پہلے کیا ہے۔ برخلاف اس کے یہ وہی نظام ہے جس کی میں نے ہر وقت نہ صرف تائید کی بلکہ ہر جگہ اسی کو اختیار بھی کیا۔

بمبئی میں رعیت واری نظام ہی جاری رہا۔ آخر کار ۱۸۴۷ء میں قواعد بندوبست ایک "مشترکہ رپورٹ" کی شکل میں جس پر ایچ۔ ای گولڈ اسمتھ۔ کپتان ونگیٹ اور کپتان ڈیوڈسن کے دستخط تھے یکجا کر دیے گئے۔ یہی ۱۸۴۷ء کی "مشترکہ رپورٹ" بمبئی کے بندوبست کا سنگ بنیاد ہے جس طرح ۱۸۴۴ء میں ٹامسن کا شائع کردہ "عہدہ داران بندوبست کے لیے ہدایات" نامی رسالہ شمالی ہند کے بندوبست کا تھا۔

اس "مشترکہ رپورٹ" میں بندوبست بمبئی کے جن اصول کی توضیح کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں :-

اوّل یہ کہ ہر کھیت پر فرداً فرداً تشخیص لگان کیا جاتا تھا۔

دوم یہ کہ طویل المیعاد تیس سالہ پٹے دیے گئے تھے۔

سوم۔ یہ کہ لگان کی تقسیم تخمینۂ پیداوار پر نہیں بلکہ قیمت زمین پر مبنی ہوتی تھی۔

"جب تک کاشتکار اپنی مقررہ مالگزاری ادا کرتا رہے خواہ ہر سال اس کے ساتھ تجدید اقرار نامہ کیوں نہ ہو اس وقت تک اس کا اپنے کھیتوں پر حق قبضہ زائل نہیں ہو سکتا۔ کاشتکار کے زیر قبضہ کُل زمین پر ایک ساتھ محصول لگانے کے بجائے ہر کھیت پر علیحدہ علیحدہ محصول لگانے میں فائدہ یہ ہے کہ حالات کے لحاظ سے جس وقت مناسب معلوم ہو کاشتکار جتنے کھیتوں سے چاہے دست بردار ہو سکتا ہے یا دوسرے کھیتوں کو جو کسی کے زیر قبضہ نہوں اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے اور اس طرح اپنے ذرائع آمدنی کے مساوی اپنی ذمہ داری میں کمی و بیشی کر سکتا ہے۔ ہماری پیمائش نے کھیتوں پر تیس سالہ میعاد کے لیے جو محصول مقرر کر دیا ہے اس سے کاشتکار کو اندرون میعاد مقررہ سال بہ سال ہر کھیت کا محصول ادا کرنے پر بلا کسی مزید شرط کے تیس سالہ پٹے کے جملہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح کسی لاحقہ ذمہ داری یا خطرے کے بغیر جس کی تلافی اس کے محدود سرمایہ اور متزلزل حالت کا لحاظ کرتے ہوئے اس سے ممکن نہ تھی کاشتکار کو تحفظ حقیت اراضی ایسا ہی حاصل ہو جاتا ہے جیسا ایک طویل المیعاد پٹے میں"۔

اراضی کی قدر کا تخمینہ کرنے کی غرض سے تمام اراضی کے نو (۹) مدارج قائم کیے گئے تھے جیسا ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوتا ہے:

قسم	قسم کی مالیت اضافی آنوں میں یعنے روپے کے سولھویں حصے میں	مٹی		
		درجہ اول جو چکنا باریک اجزا سے مرکب ہے اور رنگ میں گہری سیاہ سے گہری بھوری تک ہوتی ہے	درجہ دوم جو مقابلۃً چکنا موٹے اجزا سے مرکب ہے اور رنگ میں بھی پھیکی اور عموماً سرخ ہوتی ہے۔	درجہ سوم کنکریلی اور ریتیلی بھربھری اور رنگ میں بادامی سے بھوری تک ہوتی تھی۔
	گہرائی ہاتھوں کے مساوی ایک ہاتھ = ½ ١ فٹ	گہرائی ہاتھوں کے مساوی ایک ہاتھ = ½ ١ فٹ	گہرائی ہاتھوں کے مساوی ایک ہاتھ = ½ ١ فٹ	
١	١٦	١ ¾	٠	
٢	١٤	١ ½	١ ¾	—

۳	۱۲	۱ ۱/۴	۱ ۱/۲	☐
۴	۱۰	۱	۱ ۱/۴	☐
۵	۰	۳/۴	۱	
۶	۶	۱/۲	۳/۴	۱
۷	۴ ۱/۲	۱/۴	۱/۲	۳/۴
۸	۳	—	۱/۴	۱/۲
۹	۲	—	—	۱/۴

کھیتوں کے اقسام مقرر کر دینے کے بعد کل ضلع پر مطالبہ سرکار کی تشخیص باقی رہ جاتی تھی تاکہ اس ضلع کے کھیتوں اور مواضعات پر مطالبہ سرکار کی جملہ رقم منقسم کر دی جاسکے۔

"بندوبست کی تکمیل کے لیے تمام ضلع پر محصول کی کتنی رقم لگانی چاہیئے صرف اس کا تعین قطعی طور پر کر دینا باقی ہے۔
اُس رقم کی تشخیص ہی سب سے اہم اور سب سے مشکل کام ہے جو پیمایش کے ذمے ہے اور جس عہدہ دار کا یہ فرض منصبی ہوتا ہے اس کو علاوہ دوسری باتوں کے نہایت تمیز اور سمجھداری کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے صاف طور پر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہمارے سابقہ انتظام کی نوعیت کیا تھی اور اس کا اس ضلع پر کیا اثر ہوا۔ اس کے معلوم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سالانہ بندوبست مالگزاری کے متعلق گزشتہ جتنے برسوں کا قابلِ اعتبار مواد مل سکتا ہے اور پیمایش کے وقت مقامی لوگوں سے دریافت کرنے پر دستیاب ہوسکتا ہے اس کی چھان بین کے بعد اعداد کا ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔

"اس کے علاوہ مواضعات یا ان خطوں کی جن میں متعدد مواضع واقع ہوں خوشحالی یا انحطاط کے اسباب دریافت کرنے کے وقت اس سے بھی مدد لینے کے لیئے ہر موضع کے سالانہ بندوبست مالگزاری کی ایک علٰحدہ کیفیت مرتب کی جائے ....

"اور سب سے آخر اس اہم موضوع پر مکمل سے مکمل معلومات حاصل کرنے کی غرض سے تفصیلی کیفیتیں اور افراد اعداد مرتب کرنا چاہیے جن میں ہر قسم کی اراضی سے جو ان مواضعات کے اندرون حدود واقع ہو جن پر مالگزاری لگانے کی تجویز ہو رہی ہے خواہ ایسی زمین سرکاری ہو یا سرکار نے کسی کو دیدی ہو کن کن مدّات کے تحت کن کن ذرائع سے کیا کیا محاصل وصول ہوتے ہیں ان سب کو بتانا چاہیے۔

"اس طرح جو معلومات فراہم اور مقامی تحقیقات سے جو گزشتہ تاریخی حالات جمع کیے جائیں ان سب سے ہم اس ضلع کے سابقہ حالت کے موثر اسباب کا پتا لگا سکتے ہیں۔ ان باتوں کے علم کی بدولت اور اس ضلع کی استعداد و اراضی کا دوسرے آس پاس کے اضلاع سے مقابلہ کرنے کے بعد اب مالگزاری کی کیا رقم مشخص کر دینی چاہیئے اس کے متعلق ہم ایک اطمینان بخش نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

قارئین ان دقیق و دشوار قواعد سے فوراً محسوس کر سکتے ہیں کہ اس ضلع پر اس کے اور اس کے مواضعات کے گزشتہ تاریخ اور سابقہ حالات کے لحاظ سے سرکاری مطالبہ کی تشخیص کس قدر عہدہ داران بندوبست کی قوت تمیزی اور فیصلے پر چھوڑ دی جاتی تھی۔ اگر عہدہ دار ہمدرد ہوتا تھا تو اس کو حسب دل خواہ اعتدال پر کاربند رہنے کی اور اگر وہ ہمدرد نہ ہوتا تھا تو من مانے تشدّد کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل تھی اور لکھوکھا کسانوں کی خوش نصیبی یا بدبختی رواجی دھارے پر نہیں بلکہ مختلف عہدہ داروں کے مختلف فیصلوں پر منحصر تھی۔ مزید برآں ضلع کی سابقہ حالت کے لحاظ سے جو مالگزاری مقرر ہوگی لازمی ہے کہ خوش حالی کا زمانہ آنے کے بعد اس میں اضافہ بھی ہوگا۔ پھر ایک ایسے نظام میں جس کے تحت زرعی سرسبزی پر اس طرح روزافزوں محصول کا مضر اثر پڑ سکتا تھا کسانوں کی دوامی اصلاح حالات نا ممکن نہیں تو کیا تھی۔

تشخیص لگان کی یہ کمزوری حکومت بمبئی کی نظر سے نہیں چوک گئی تھی۔ گورنر بمبئی نے اپنی ۱۶ / نومبر ۱۸۴۳ء کی یادداشت میں لکھا تھا کہ "مجھ کو اس بات کے اعتراف کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ فی الوقت ہمارا انحصار کلیتاً ہمارے مہتموں کے فیصلوں ہی پر ہے۔ اور اس وقت تک ہماری یہی حالت رہے گی

جب تک ہمارے کمشنران مالگزاری ہمارے اور ہمارے مہتمموں کے مابین ڈاک کی طرح مراسلات پہنچانے کا ذریعہ بنے رہنے کے بجائے کچھ کام نہ کریں۔" لیکن خود کمشنران مالگزاری اس معاملے میں بے دست و پا تھے۔ بمبئی کی کونسل کے رکن آنریبل مسٹر ریڈ نے اپنی ۱۶ رمئی سنہ ۱۸۲۸ء کی یادداشت میں نہایت برمحل یہ لکھا تھا کہ "میں معزز میر مجلس کی اس رائے سے بالکل متفق ہوں کہ مہتممان پیمایش کے فیصلے پر انحصار لازمی ہے۔ درحقیقت ان امور میں انہیں پر کلیتاً انحصار کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کیونکہ میرے خیال میں کمشنران مالگزاری سے بجز مہتمموں کے کام پر ایک عام نگرانی رکھنے کے اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کام کی تفصیلی تنقیح کرنے کی چند ہی کمشنروں میں قابلیت ہوگی اور ایک بھی کمشنر ایسا نہ ہوگا جس کو اتنی فرصت ملتی ہو کہ وہ خود اس کام کو کر سکے۔"

ونگیٹ کے لیے یہ موجب ستایش ہے کہ اس نے اپنے غیر محدود اختیارات سے نہایت اعتدال فراست اور انسانیت کے ساتھ کام لیا۔ تشخیص لگان میں اگرچہ اس نے محض قیاس ہی سے کام لیا تھا اس پر بھی حتی الامکان نہایت احتیاط اور کاوش کے ساتھ اس نے اس کام کو انجام دیا اور اس کے بندوبست سے دکن کے کسانوں کو اس بدنظمی اور ظلم سے نجات ملی جو وہ برسوں سے جھیل رہے تھے۔ مدراس میں سر ٹامس منرو اور شمالی ہند میں مارٹنز کی طرح بمبئی میں سر جورج ونگیٹ کی یاد تازہ ہے اور یہ اس لیے نہیں کہ ان کا کارنامہ سنگین غلطیوں سے بالکل پاک تھا بلکہ اس لیے کہ جہاں پہلے بدنظمی تھی وہاں انتظام اور ایسا نظام قائم کرنے میں جو آج تک چلا آ رہا ہے بہ حیثیت مجموعی وہ کامیاب رہے۔

بمبئی کے انگریزی عمال و عہدہ داروں نے وقتاً فوقتاً جو محصول اراضی لگایا تھا اس کا مالی نتیجہ اعداد کے ملاحظہ ہی سے بہترین طور پر ظاہر ہوتا ہے سنہ ۱۸۱۷ء اور سنہ ۱۸۱۸ء کے درمیان پیشوا کی قلمرو کے الحاق کے بعد سے ونگیٹ کی سنہ ۱۸۳۶ء میں شروع کی ہوئی پیمایش و بندوبست تک اس صوبے میں انگریزی عملداری کے حدود میں کسی قسم کی توسیع نہ ہوئی لیکن اس کے باوجود اس فتح کے بعد ہی تھوڑی مدت میں مالگزاری میں معتد بہ اضافہ ہو گیا۔

۱۸۱۷-۱۸۱۸ء میں مالگزاری کی رقم		پونڈ تھی ۸۹۰۰۴۷
۱۸۱۸-۱۸۱۹ء " " "		۱۱۴۳۰۴۱
۱۸۱۹-۱۸۲۰ " " "		۱۰۷۸۱۶۴
۱۸۲۰-۱۸۲۱ " " "		۱۸۱۸۳۱۴

دوسرے لفظوں میں بشمول مقبوضات مفتوحہ اس صوبے کی مالگزاری پیشوا پر فتح پانے کے چار سال کے اندر اندر دو چند سے بھی کچھ زیادہ ہوگئی۔

ونگیٹ نے جو بندوبست ۱۸۳۶ء میں شروع کیا تھا وہ ۱۸۷۲ء میں جاکر کہیں تکمیل کو پہنچا اور پونا اور چند دیگر مقامات کو جن کے بندوبست زیر نظر ثانی تھے خارج کرکے سابقہ جملہ مالگزاری ۱۵۳۴۰۰۰ پونڈ جو تھی وہ اب ۲۰۳۲۰۰۰ پونڈ ہوگئی تھی یعنے اس میں ۳۲ فی صدی اضافہ ہوگیا تھا۔ مختلف اضلاع کے اعداد حسب ذیل ہیں:

ضلع	مالگزاری قبل بندوبست پونڈ	مالگزاری تحت بندوبست پونڈ
ٹھانہ	۱۶۶۲۸۷	۲۱۱۰۳۷
خاندیس	۲۱۵۹۴۶	۳۰۷۸۶۹
رتناگری	۴۶۴۴۰	۴۶۵۷۲
احمدآباد	۵۳۷۵۲	۹۰۴۷۴
خیرہ	۱۴۴۸۸۶	۱۸۸۷۵۲
سورت	۱۷۴۰۸۱	۲۴۰۱۳۴
بروچ	۸۸۹۸۴	۱۱۲۵۶۴
پنچ محال	۴۸۲۵	۸۱۵۵
کراچی	۱۹۴۰۴	۳۱۶۷۶
حیدرآباد (سندھ)	۶۳۳۳۰	۷۷۳۵۲
شکارپور	۱۲۳۹۳۱	۱۵۹۲۶۳
دھارواڑ	۱۱۳۰۳۹	۱۵۶۵۶۲

بلگام	۱۳۰۷۴۴	۱۵۷۰۲۶
کشناگری	۳۰۵۵۵	۵۸۲۸۳
ستارا	۱۴۳۶۵۶	۱۵۸۵۴۳
کنارا	۱۴۸۵۰	۲۷۷۸۸
میزان	۱۵۳۴۷۱۰	۲۰۳۲۰۵۱

پانچواں باب

مدراس میں بندوبست اراضی

سنہ ۱۷۹۲ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلے پہل بارہ محال کے اضلاع پر قبضہ ہوا تو وہاں کپتان ریڈ اور ٹامس منرو نے رعیت داری بندوبست یعنے کاشتکاروں کے ساتھ انفرادی طور پر تعیین مالگزاری کا طریقہ رائج کیا تھا اور یہی نظام رفتہ رفتہ صوبہ مدراس کے دوسرے اقطاع میں بھی پھیل گیا تھا۔ پہلی دفعہ جو مالگزاری مقرر کی گئی تھی وہ نہایت سنگین تھی۔ سرکاری مطالبہ کھیتوں کے تخمینۂ پیداوار کا نصف کر دیا گیا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ یہ مطالبہ تمام ملک کے جملہ معاشی لگان سے بھی زیادہ تھا۔ ٹامس منرو نے یہ بات خوب محسوس کی اور سنہ ۱۸۰۰ء میں مالگزاری کو گھٹا کر اس نے پیداوار کا ایک ثلث کر دینے کی تجویز پیش کی۔ حکومت مدراس نے اس تجویز کے مبنی بر انصاف ہونے کا اعتراف تو کیا مگر وہ اس لیے اس پر عمل پیرا نہ ہو سکی کہ نظمائے کمپنی بار بار زر طلب کر رہے تھے۔ چنانچہ مزید دس لاکھ پونڈ سالانہ بھیجتے رہنے کے احکام انگلستان سے اس دھمکی کے ساتھ صادر ہوئے تھے کہ عدول حکمی کی صورت میں تخفیف عملہ کا مسئلہ خود نظماء اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ اسی لیے مدراس کے کسانوں کو سرکاری مطالبے کی زیادتی سے نجات نہیں ملی۔

سنہ ۱۸۰۰ء اور سنہ ۱۸۱۰ء کے درمیان مدراس کی مجلس مالگزاری نے اس صوبے

کی دیہی جماعتوں کو تسلیم کر لینے کی پُر زور تائید کی اور صلاح دی کہ ہندوستان کے قدیم رواج کے موافق انھیں جماعتوں کے ساتھ بندوبست مالگزاری کیا جائے۔ مجلس نے تجربے سے یہ بھی ثابت کر کے دکھا دیا کہ جہاں کہیں موضع واری بندوبست عمل میں آیا تھا وہ نہایت کامیاب رہا تھا اور جس جگہ فرداً فرداً اسامیوں سے بندوبست کیا گیا تھا وہ بالکل ناکامیاب ثابت ہوا تھا۔ لیکن کمپنی کی مطلق العنان حکومت میں ایسی دیہی جماعتوں کی جو رعایا کی نمایندہ تھیں کوئی گنجایش ہی نہ تھی۔ نظما نے اس جماعت کے بلا توسط کاشتکاروں ہی سے فرداً فرداً معاملہ طے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی تاریخ سے مدراس کی قدیم دیہی جماعتوں کا انحطاط شروع ہو گیا۔

سنہ ۱۸۲۰ء سے سنہ ۱۸۲۷ء تک سر ٹامس منرو گورنر مدراس رہا تھا اور اس عرصے میں اس صوبے کے تمام اقطاع میں جہاں زمینداروں سے دوامی بندوبستِ مالگزاری نہیں ہوا تھا رعیت داری بندوبست شروع کر دیا گیا۔ منرو نے اپنی سابقہ تجویز کے موافق سرکاری مطالبے میں تخفیف کر دی اور اس کے ہمدردانہ طریقِ کار اور انتھک نگرانی سے کئی خرابیاں رفع ہو گئیں۔

لیکن اس کے باوجود سر ٹامس منرو کا مطالبہ تخفیف کے بعد بھی سنگین ثابت ہوا۔ کئی مواضعات اور کھیتوں میں پیداوار کا ایک ثلث کُل معاشی لگان کے مساوی تھا۔ عام قیمتوں اور سالانہ پیداوار کا کچھ لحاظ نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک مقررہ رقم نقد وصول کر لیجاتی تھی اور ان کے وصول کرنے کے لیے نہ تو بزرگانِ قصبہ اور نہ قصبے کی کسی مجلس کا توسط اختیار کیا جاتا تھا بلکہ یہ رقم مملکت کے چند کم مواجب مختار و کارپرداز وصول کرتے تھے جو اپنی بد دیانتی اور مظالم سے کاشتکاروں کے مصائب و تکالیف میں اضافہ کر رہے تھے۔ جب سر ٹامس منرو کو جو ہر بات کی تنظیم کرتا اور ہر بات پر نظر رکھتا تھا دست قضا نے اس منظرِ ہستی سے اٹھا لیا تو اس نظام کی مشکلیں اور زیادہ محسوس ہونے لگیں۔ تیس سال تک صوبۂ مدراس ایسے مظالم اور زرعی مصائب کی جولان گاہ بنا رہا کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں بھی کہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

مالگزاری کے کلکٹروں نے بھی عالمگیر مصیبتیں جن میں وہ گھرے ہوئے تھے چشم خود

دیکھی نہیں اور ان پر رپورٹیں لکھی نہیں جن کے چند اقتباسات ملاحظہ کرنے سے لوگوں کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ضلع کڈھپہ ۔ ۱۸۲۰ء میں کلکٹر نے مجلس مالگزاری کو لکھا تھا کہ "جس قدر آپ سننے کے لیے تیار ہیں اس سے کہیں زیادہ اب رعیت تاجروں کے پنجوں میں گرفتار ہے ۔ صرف تقاوی لیکر اراضی کی کاشت کرنے سے بڑھکر کسانوں کو مقدور نہیں بشرطیکہ کوئی غیر معمولی نقصان ان کو نہ پہنچا ہو ۔ اگر مویشی کے مرجانے یا اور وجوہ سے ان کو غیر معمولی نقصان پہنچ چکا ہو تو پھر تقاوی بغیر تلافئ مافات بالکل ناممکن ہے"

ضلع بلہاری ۔ ۱۸۴۵ء میں کلکٹر نے اطلاع دی تھی کہ "عام طور پر رعایا کی شکایت اور درخواست یہی ہے کہ اس کو کاشت کا رقبہ کم کر دینے کی اجازت دی جائے اور یہ کاشت کے نفع بخش نہ ہونے کا بین ثبوت ہے ۔ پہلے تو رعیت خاصی مالدار تھی ۔ اراضی میں سرمایہ لگانے کے قابل بھی تھی ، سرکاری مطالبہ فوراً ادا کر دیتی تھی اور ایک مناسب قیمت آنے تک پیداوار محفوظ رکھتی تھی مگر اب یہ حال ہے کہ وہی رعیت قرض میں گرفتار سنگین سود ادا کرتی رہتی ہے اور قرض خواہوں کی بالکل دست نگر بن گئی ہے ۔ اگر کلکٹر نے اپنے زیر دستوں کے ذریعہ سے ان کی مدد نہ کی ہوتی تو اس اراضی کے جس پر بہت زیادہ مالگزاری لی جاتی تھی نصف یا کم سے کم ثلث حصے سے رعایا اب تک دست بردار ہو گئی ہوتی ۔ یہاں کاشت خاطر خواہ نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ زمین جس قدر پیداوار کے قابل تھی اتنی پیداوار وہاں نہیں ہوتی تھی ۔ پٹے داروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے لیکن یہ ایک نادار طبقہ ہے جو صرف کشت کاری پر گزراوقات کر لیتا ہے اور اس میں وہ ہمت بھی نہیں ہے کہ اس کا ان سابقہ زمینداروں سے تقابل کیا جائے جو طرح طرح کی مشکلات میں گرفتار ہونے کے بعد ضلع کے فرد جمعبندی سے اب خارج ہو چکے ہیں ۔ اس طبقے کے اکثر افراد کو پہننے کے لیے نہ برابر کپڑے نصیب ہیں اور نہ پیٹ بھر کبھی کھانا ہی میسر آتا ہے اور ان کی حالت اور ہئیت کو دیکھ کر سوا اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ افلاس ہی اس کا اصل سبب ہے"

سر ہنری منٹگمری کی سنہ ۱۸۴۴ء کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ راجمندری۔ (جس کا نام بعد میں ضلع گوداوری رکھا گیا تھا) کی حالت تباہی کے قریب پہنچ چکی تھی وہاں سنہ ۱۸۳۰ء اور سنہ ۱۸۳۱ء میں قحط پڑے تھے۔ سنہ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۳۶ء اور سنہ ۱۸۳۷ء میں ہنگام نامساعد رہا تھا اور سنہ ۱۸۳۸ء اور سنہ ۱۸۳۹ء اور سنہ ۱۸۴۰ء میں ایسے موسمی حوادث وقوع پزیر ہوے تھے جو آفت سے کم نہ تھے۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں ۷۹۵۰۱۶ کی آبادی تھی۔ مگر سنہ ۱۸۴۲ء میں گھٹکر وہ ۵۲۳۸۳۶ رہ گئی تھی۔

گنتور اور مچھلی بندر۔ ان اقطاع میں سنہ ۱۸۳۳ء کا قحط جس کو قحط گنتور کہا جاتا ہے شدید ترین سمجھا جاتا تھا۔ کپتان والٹر کیمبل جس نے بچشم خود وہاں کی حالت دیکھی تھی لکھتا ہے کہ "محاصرہ کارنتھ نامی نظم میں کتوں کا انسان کی کھوپریوں کو چبا چبا کر کھانے کا جو ذکر ہے وہ بہ مقابل ان ہیبتناک واقعات کے جن کو دیکھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جن کو روزانہ صبح و شام گھوڑے پر جاتے ہوے دیکھنے کے سوا مجھے چارہ ہی نہ تھا ایک بالکل معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ دیکھنا کس قدر ہولناک ہے کہ انسان ہو کر کیسی کیسی نفرت انگیز چیزیں مجبوری کے وقت جان بچانے کے لیے زہر مار کرنی پڑتی ہیں یہ فاقہ زدہ بدبخت مرے ہوے کتے ہوں کہ گھوڑے سب چٹ کر جاتے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ قلعے سے ایک گدھا راہ بھٹک کر ان لوگوں میں چلا گیا تھا۔ بھیڑیوں کے غول کی طرح یہ لوگ اس پر گرے۔ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور وہیں ہضم کر گئے"۔ ضلع کرشنا کے گنتور کی طرف کے حصے میں ایک ثلث سے نصف تک آبادی کا صفایا ہو گیا تھا۔ اس کے دوسرے سال ہی ایک ایسی وبا پھیلی کہ ایک بھی "باصحت اور تنومند شخص کہیں دکھائی نہیں دیتا"۔

ضلع نلور۔ اناج کی قیمت کم ہونے کی وجہ سے یہاں کی رعیت مفلس ہو گئی تھی۔ کاشت کا تمام تر رقبہ سنہ ۱۸۰۱ء میں ۲۴۴۳۱۹ ایکڑ جو تھا وہ بڑھکر سنہ ۱۸۵۰ء میں ۱۳۸۹۸۰۲ ایکڑ ہو گیا تھا لیکن عام قیمتوں کے گھٹ جانے سے محصول کا بار بڑھ گیا تھا اور اسی لیے باغات کی اراضی کی کاشت موقوف ہو گئی تھی۔

شمالی ارکاٹ۔ کلکٹر نے اطلاع دی تھی کہ "رعیت کی حالت جیسی

اس صدی کے ابتداء میں تھی اب اس سے بھی بدتر ہے ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی حالت بری ہے اور قابل اصلاح ضرور ہے۔ ان میں سے اکثر بے حد مفلس ہیں ان کی غذا نہ تو اچھی ہوتی ہے اور نہ کافی ان کے کپڑے بھی غریبانہ ہی ہیں اور تن ڈھانکنے کے برابر نہیں ہوتے ان کے مسکن معمولی جھونپڑیاں ہیں اور ان سب پر طرہ یہ نری جہالت میں مبتلا ہیں۔"

جنوبی ارکاٹ۔ کلکٹر کی اطلاع کے موافق آبادی اور محنت کی اجرت میں یہاں اضافہ ہوا تھا اور گاڑی گھوڑا کپڑے۔ مکانات رعایا کی ترقی پر زبان حال سے شاہد تھے۔ مگر سنگین اور غیر مساوی لگان کے باعث یہاں زراعت بہت پیچھے تھی اور دو ثلث قابل کاشت زمین افتادہ تھی۔

ضلع تنجور۔ اس ضلع کے ذرائع آبپاشی اور ذرائع آمد و رفت میں ترقی ہونے کی وجہ سے بہ مقابل دوسرے اضلاع کے یہاں زرعی حالت کم خراب تھی۔

ضلع کوئمبتور۔ کلکٹر نے ۱۸۵۵ء میں یہ لکھا تھا کہ گزشتہ دس ہنگام میں ۴ خراب تھے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مالگزاری کی رقم گھٹ گئی۔ بمبئی سے موٹے موٹے کپڑے کے تھانوں کی جو تجارت قائم تھی اس میں کچھ اضافہ ہوا تھا مگر مہین مہین پارچوں کی تجارت تو انگریز صناعوں نے غارت کر دی۔ پے در پے خرابی موسم کی وجہ سے غلے کی قیمت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

اضلاع سالم و مدورا و تناولی۔ سوتی پارچوں کی برآمد میں جو کوئمبتور سالم۔ مدورا اور تناولی میں بنتے تھے بہت کچھ بیشی ہو گئی تھی۔ کاشت میں بیشی ہونے کے ساتھ ساتھ محنت کی اجرت میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ کلکٹر نے یہ بیان کیا تھا کہ سستی قیمتوں کی وجہ سے اشیائے تعیش و تکلف کا صرف بڑھ گیا تھا۔

مدراس کی رعیت کی عام حالت۔ ان مختلف اضلاع کے حالات معلوم کرنے کے بعد ہم مدراس کے کاشتکاروں کی عام حالت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن کو اس زمانے کے ایک مشہور مدراس کے عہدہ دار نے بیان کیا ہے۔ بورڈ کن بہ حیثیت کلکٹر شمالی ارکاٹ اور دوسرے مقامات میں رہ چکا تھا اور لوگوں کے

حالات سے کما حقہٗ واقفیت رکھتا تھا۔ سر آرتھر کاٹن اور دیگر ممتاز اشخاص کے ساتھ تعمیرات عامہ کے ماموریہ کی کمیٹی پر اُس کا بھی انتخاب کیا گیا تھا۔ اس ماموریہ نے سنہ ۱۸۵۲ء میں اپنی قابلِ قدر رپورٹ پیش کر دی تھی۔ بورڈلن نے سنہ ۱۸۵۳ء میں مدراس کی رعیت کے حالات نہایت ہی سنجیدہ اور معقول طور پر قلمبند کیے ہیں جن میں نام کو بھی مبالغہ نہیں اور کاشتکاروں کے لاعلاج افلاس کی دردناک تفصیل اس میں درج کی ہے۔

چند ہی کاشتکار ایسے تھے جن سے مالگزاری کم لی جاتی تھی یا جن کی اراضی مالگزاری سے مستثنیٰ تھی یا جو دیگر مفید مطلب حالات کی بنا پر مالدار سمجھے جاتے تھے اور تیس (۳۰) چالیس (۴۰) شلنگ کی ماہانہ آمدنی پر خوش باش کہلاتے تھے۔ اس طبقے میں بھی تین پونڈ سے لیکر پانچ پونڈ تک کی آمدنی الشاذ کالمعدوم کا مصداق تھی۔

کاشتکاروں کا ایک غلبۂ کثیر ہمیشہ افلاس زدہ اور عموماً مقروض رہتا تھا رعیت کے طبقے کا ہر فرد بمشکل گزر اوقات کرتا ہے روپیہ پیسہ اُس کی نگاہ شاذ ہی پڑتی ہے بجز اس کے کہ سرکار کو قسط ادا کرنے کے لیے وہ اپنی چٹھی پر ساہوکار سے قرض لے۔ گاؤں کے باہر مبادلے کی زیادہ نوبت ہی نہیں آتی۔ اور جو کچھ بھی مبادلہ ہوتا ہے وہ ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے ہل کے جانور نہایت خراب ہوتے ہیں اور ان کی قیمت فی راس ساڑھے تین روپے سے لیکر چھ روپے تک ہوتی ہے اور اس پر بھی یہ جانور اس کی ملک ایسے نہیں ہوتے کہ انکی قیمت اس نے ابھی ادا نہیں کی ہے۔ اس کے ناقص اور بدشکل ہل کی قیمت جبکہ وہ بالکل نیا ہو دو یا تین شلنگ سے زیادہ نہیں اور اس کے چند زرعی اوزار اسی طرح کے ناقص و ناکارہ ہوتے ہیں۔ اس کا مسکن ایک جھونپڑی ہے جس کی دیواریں مٹی کی اور چھت پھوس کی ہوتی ہے اور مذکور بالصدر رعیت کے مکانوں سے ان جھونپڑوں کی حالت زیادہ خراب و خستہ تنگ و تاریک ہوتی ہے۔ اس میں سامان آسائش کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ اُس کی اور اس کے ارکانِ خاندان کی غذا کچھ تو دلیا ہوتی ہے اور کچھ چاول جنمیں برائے نام مسالہ پڑا ہوتا ہے۔ عام طور پر کھانے اور پکانے کے مٹی کے برتن بدنما اور بھدے ہوتے ہیں جن پر روغن نہیں ہوتا اور وہ اچھے انگریزی

سفال یا اینٹ سے زیادہ بھدے نظر آتے ہیں۔ ایسا نہ تھا کہ اس طبقے میں کسی کے پاس پیتلی ظروف بالکل نہ تھے لیکن وہ شاذ ہوتے تھے۔

رعیت میں نیچے کے درجے کے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے قبضے میں زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے اور یہ لوگ مویشی مستعار لے کر اس ٹکڑے کی کاشت کر لیتے ہیں لیکن ان کا اصل پیشہ محنت مزدوری ہی ہے اور وہ یا تو جلانے کی لکڑیاں کاٹ کر آس پاس کے قصبات میں بیچ لیتے ہیں یا کھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں۔

"محض مزدور پیشہ طبقے کے لوگ ان سے بھی نیچے درجے کے ہوتے ہیں اور در حقیقت ان کی حالت بھی ان سے بدتر ہوتی ہے مگر کوئی ما بہ الامتیاز بات ان میں نہیں ہوتی۔ زراعت کا کام کاج کرنے والے مزدور کی آمدنی ہر چیز کو شامل کر کے ۲۰ روپے سالانہ سے بڑھ کر نہ تھی اور یہ بھی نقد نہیں بلکہ اشیا کی شکل میں ہوتی تھی۔

"اس آمدنی کی بڑی سے بڑی شرح ۲۰ روپے سالانہ ہی لی جائے تو بھی مذکورالصدر معیار سے انگلستان میں اس کی حقیقی قدر دس پونڈ سالانہ کے برابر تھی۔

"کھیتوں میں کام کرنے والے انگریز مزدور کی اوسط آمدنی فصل میں اضافہ یافت وغیرہ ملا کر ۲۰ پونڈ سالانہ سے کم نہ ہوتی تھی۔ اس طرح ظاہر ہے کہ کھیتوں کے مزدور کی (جس کو مسلسل کام ملتا رہتا ہے) حقیقی اجرت یعنے اس کی مقدور برابر زندگی کی ضروریں اور سہولتیں انگلستان کے مقابل ہندوستان میں ایک ثلث سے کسی قدر زیادہ اس کو حاصل ہیں۔"

رعیت واری نظام کی اصل کارروائی پر جس میں ہر ضلع کے کلکٹر کا فریضہ تھا کہ وہ اپنے ضلع میں ایک لاکھ اسامیوں سے مالگزاری کی ناممکن الوصول رقم وصول کرے ایک اور ممتاز عہدہ دار کی شہادت ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ جورج کیمبل نے جو بعد کو "سر" کے خطاب کے ساتھ بنگالے کا لفٹننٹ گورنر اور اس کے بعد رکن پارلیمنٹ مقرر ہوا تھا ۱۸۵۲ء میں مدراس کے اس نظام کے متعلق حسب ذیل بیان کیا ہے:

"ذرا خیال تو کیجیے کہ ایک کلکٹر اور ڈیڑھ لاکھ اسامیوں سے جن میں ایک بھی پٹہ دار نہ ہو اور جہاں ہر کاشت کار اپنی کاشت اور فصل کے موافق اور اپنے مویشی بھیڑ اور اولاد کی تعداد کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ مالگزاری ادا کرتا ہو جس میں اگرچہ تخفیف کا بھی امکان ہو مگر صرف ایسی صورت میں جبکہ وہ اس کی ضرورت معقول طور پر ثابت کر دے معاملات طے کرے۔ انگلستان یا دوسرا کوئی ملک کیوں نہ ہو وہاں اگر ایسا نظام ہو تو پھر اس نظام کے تحت ایک طرف تو زرعی مصائب اور دوسرے طرف ازدیاد اولاد کی بنا پر کیا ہی تہلکہ نہ مچے گا! اس وقت کیا کوئی اسامی ایسا بھی ہوگا جو یہ کہے کہ اس کی اراضی میں کچھ پیداوار واقعی ہوی ہے یا اس کے مویشی کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے یا اس کے اولاد ہوی ہی نہیں اگر کلکٹر عیب داں ہو یا اس نے عمر نوح اسی ضلع میں گزاری ہو تو بھی وہ اس فریضے کی انجام دہی کے قابل نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اس کے وہ تو بندہ بشر ہے اور اس پر پردیسی جس کا ہمیشہ یہاں سے وہاں تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ بڑی تعجب کی بات ہوگی کہ اس کے ذیلی دیسی کار پرداز جو چاہے نہ کر سکیں یا اقتدار رکھ کر اس کا بے جا استعمال نہ کریں۔ بنا براں عام طور پر یہ امر مسلم ہے کہ اس تمام نظام کی بدعملی بالخصوص مالگزاری کی معافیات کی بدنظمی بہت ہی بدنما ہے۔ ہر قسم کی ہیر پھیر اور بے انتہا سازشیں ہوتی رہتی ہیں اور اس پر جاسوسوں کی مخبریوں پر کلکٹر مدراس کے اعتماد کرنے سے رہی سہی اصلاح حال بھی کچھ نہیں ہوتی"

اس حکمت عملی کے یہ ابتدائی نتائج تھے جس میں دیہی جماعتیں نظر انداز کر دی گئی تھیں اور ہر چھوٹی چھوٹی اسامی سے ہی براہ راست ایک ناممکن الوصول رقم مالگزاری کا وصول کرنا ایک کلیۃ قرار دیا گیا تھا۔ نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس صوبے میں شامت کے مارے کاشتکاروں سے مقررہ مالگزاری کے بروقت وصول کرنے کے لیے ان کو طرح طرح کی اذیتیں دینے کا طریقہ عام طور پر رائج تھا۔ اس زہر آلود طریق عمل کی خبر ہوتے ہوتے انگلستان تک پہنچی اور ۱۸۵۳ء میں مسٹر بلیکٹ نے جو شہر نیو کاسل کی طرف سے پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا تھا۔ مدراس کے نظام اراضی کی تحقیقات کے لیے انعقاد ماموریہ کی تحریک پر پارلیمنٹی بحث کی ابتدا کی۔ اس نے بیان کیا کہ اس

نظام سے بدتر کوئی نظام وضع نہیں کیا جا سکتا تھا اور دعوے کے ساتھ کہا کہ مطالبہ مالگزاری اخذ بیجا سے کم نہ تھا۔ کیونکہ وہ رعیت کو اذیت پہنچائے بغیر وصول ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ جان برائیٹ نے بھی نہایت مڈرین سے اس مباحثے میں شرکت کی اور مدراس کے کاشتکاروں کی حالت اور ان کے ساتھ جو برتاؤ ہوتا تھا اس کے بیان کرنے میں وہ بلاغت دکھائی کہ لوگوں کو اس کی تقریر پر سن کر طیش آگیا۔

یوں تو حکومت ہند اصلاح کی راہ میں قدم رکھنے سے جھجکتی اور تساہل سے کام لیتی تھی مگر اس پارلیمنٹی مباحثے کے بعد کچھ نہ کچھ کرنے پر وہ بھی مجبور ہو گئی۔ لوگوں کی شہادت قلمبند کرنے کے لیے ایک ماموریہ مقرر کیا گیا اور اس ماموریہ کو اپنا کٹھن کام شروع کرنے کا مجاز کرنے کے لیے ایک قانون بھی نافذ کر دیا گیا۔ ایلیئٹ جو مدراس کی عدالت خفیفہ کا جج تھا اور نارٹن نامی مدراس کا ایک بیرسٹر اور اسٹوکس جو رعیت واری نظام کا بڑا ہی طرف دار تھا، تینوں کمشنر مقرر ہوئے جب کمشنر ایسے ہوں تو ان کی رپورٹ بھی ویسی ہی پنی تلی ہو گی۔ ان کے نزدیک یہ تو ثابت تھا کہ اس صوبے میں مالگزاری وصول کرنے کے لیے لوگوں کو اذیتیں دی جاتی تھیں اور اس پر لوگ کہیں داد و فریاد نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان کا شنوا ہی کوئی نہ تھا لیکن انھوں نے سرکار کے یورپی عہدہ داروں کو اس جرم میں لپٹنے سے احتراز کیا اور اس بات کے باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں پائی کہ "عوام کو یہ ہی خیال ہو گیا تھا کہ سرکار کے یورپی عہدہ دار اس برے برتاؤ سے جو رعایا کے ساتھ ہوتا تھا چشم پوشی کرتے ہیں یا اس کو روا رکھتے ہیں۔"

لوگوں کو جو اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں وہ حسب ذیل اقسام کی تھیں: آدمی کو تپتی ہوئی دھوپ میں کھڑا کرنا۔ کھانا کھانے یا حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے نہ دینا۔ چپراسی کو اس پر متعین کرنا۔ "کٹی انڈل" کا استعمال یعنے آدمی کو خمیدہ کر کے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دینا۔ انگلیوں کو قینچی بنا کر دبانا۔ ادھر سے ادھر دوڑا کر اس کے چٹکیاں لیتے جانا۔ طمانچے لگانا اور تازیانہ یا گھونسے مارنا۔ گوشمالی دینا۔ گھٹنوں میں روڑے دبکر اکڑوں بٹھانا۔ نیچ قوم کے کسی شخص کو اس کی پیٹھ پر سوار کرانا (۲) نادہند آدمیوں کے سروں کو لے کر ایک دوسرے

کے ساتھ ٹکرانا یا دونوں کے چونڈے باندھ دینا۔ پاؤں کاٹھ میں ٹھوکنا۔ گدھے یا بھینس کی دم سے سر کے بال باندھ دینا۔ گردن میں ہڈیوں کا یا اس سے بھی ذلیل نفرت انگیز چیزوں کا ہار بنا کر پہنانا اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ سخت سرزنش کرنا اور سزا دینا۔

اس تحقیقات کے اثنا میں ایک بات جو بالکل صاف طور پر معلوم ہوئی یہ تھی کہ جہاں زمین پر بہت سنگین محصول لگایا گیا تھا وہاں لوگوں کو اکثر اذیتیں دی جاتی تھیں۔ ماموریہ نے لکھا تھا کہ "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کنڑا اور ملیبار میں عام طور محصول اراضی ہلکا ہے لوگ بھی خوش حال ہیں اور آسانی ہی سے نہیں بلکہ خوشی خوشی مالگزاری ادا کرتے ہیں اور اس بنا پر وہاں ایک کش مکش سی رہتی ہے اور اس لیے نہیں کہ کس کس پر سرکاری مطالبہ ادا کرنا لازمی ہے بلکہ اس لیے کہ دیکھیں کون یہ مطالبہ سے پہلے ادا کرتا ہے اراضی کی وہاں قدر ہے اسی لیے وہ قابل فروخت بن گئی ہے بنجر زمین کے بٹوارے پر ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ وہ مجھی کو ملے۔ ایسی حالت میں اگر ان سرسبز مقامات کے یورپی باشندے بلا استثنا یہ کہیں کہ اغراض مالگزاری کے لیے ایذا رسانی سے یہاں کے لوگ مقابلۃً ناآشنا ہیں تو اس پر کس کو تعجب ہو سکتا ہے"

بورڈلن نامی شمالی ارکاٹ کے کلکٹر نے اپنی یہ رائے قلم بند کی تھی کہ اغراض مالگزاری کے لیے ایذا رسانی کا طریقہ اب تک بالکل موقوف ہو گیا ہوتا اگر ان صوبوں میں زمین پر حد سے زیادہ مطالبہ سرکار نے نہ کیا ہوتا یا نظام مالگزاری میں وہ چند مخصوص واقعات نہ ہوئے ہوتے جو ہوئے تھے۔ اگر مالگزاری اعتدال پر مبنی ہوتی تو اراضی بھی قابل قدر ملک متصور ہوتی اور ہر شخص احتیاط کرتا کہ کہیں وہ ہاتھ سے نہ چلی جائے۔ تنگ دستی کے زمانہ میں بھی خود زمین اس کے پاس ایک ذریعہ تھی جس سے وہ مطالبہ سرکار بآسانی ادا کر سکتا تھا۔ مزید برآں اگر محصول اراضی اعتدال پر مبنی ہوتا تو خود اس کا قوی اثر لوگوں کی کردار کو فروغ پہنچانے کے لیے کافی تھا کیونکہ جب لوگ اپنے لیے املاک پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں تو ان میں خودداری پیدا ہو جاتی ہے اور عوام میں احترام کس طرح قائم رکھنا چاہیے اس کا ڈھنگ بھی

بھی نہیں آجاتا ہے جس کے بعد صاحب ملک و جائداد کسی صورت سے ذاتی تذلیل و تحقیر گوارا نہیں کر سکتے۔"

رعیت واری نظام کی برائیوں اور بے انداز محصول اراضی لگا دینے کی خرابیوں سے جیسی مدراس میں پھیلی ہوئی تھیں حکومت ہند خوب واقف تھی چونکہ شمالی ہند کے نظام کے مقابلے میں یہ نظام اتنا اچھا نہ تھا اسی لیے اس پر اعتراضات بھی ہوئے تھے۔ جیسا پچھلے باب میں بیان کیا گیا ہے صدر مجلس مالگزاری نے گورنر جنرل ہند کی خدمت میں ایک پُرزور مراسلہ بھیجا جس میں اس نے مدراس کے نظام پر نکتہ چینی کی تھی اور بتایا تھا کہ سرکار کا ہر کم مواجب کارپرداز کیا کیا جعلسازیاں اور مظالم نہیں کرتا ساتھ ہی ساتھ مجلس نے ہر کاشت کار کے ذرائع آمدنی کے متعلق دریافت کرنے کے طریقے کو جو عدالتی تحقیقات سے کم لوگوں کو دق کرنے والا نہ تھا مذموم قرار دیا تھا۔ اور یہ کہا تھا کہ جہاں سخت افلاس اور بے چارگی اسفل درجہ کی موجود تھی وہیں یہ نظام بھی تھا۔ "اس سے ہر شخص خود اپنی نظروں میں ذلیل و خوار ہوتا ہے اور ہمیشہ کے لیے اس کی ایک طفلانہ حیثیت بن جاتی ہے نہ تو اپنے بل آپ کھڑے رہنے والوں کی مردانہ آن بان اس میں ہوتی ہے اور نہ اپنے سے کسی بڑے آدمی کے لطف و کرم اور غیظ و غضب سے ایک مستغنی شخص کی سی تمکنت و بردباری اس میں پائی جاتی ہے۔" لیکن حکومت مدراس نے اپنے بدترین انتظام مالگزاری کی اصلاح کے لیے نہ تو صدر مجلس کی ایک سنی اور نہ کلکٹر نے ان اضلاع کی مسلسل بڑی اطلاعوں پر کچھ دھیان کیا۔

تعجب تو اس پر ہے کہ دوسرے صوبوں میں جب برڈ اور ونگیٹ جیسے مرد میدان بڑی بڑی خرابیوں کی بیخ کنی کر رہے تھے اس وقت مدراس کے حکام کوئی بڑی اصلاحی تجاویز یا نقائص کو دور کرنے والی تدابیر یا لوگوں کے حالات کو ترقی دینے کی کوئی مدبرانہ حکمت عملی اختیار کرنے کی بجائے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ صوبہ مدراس کا لقب ہمیشہ سے "سیاہ بخت" رہا ہے مگر پہلے کسی زمانے میں بھی وہ اس مذمت کا اس درجہ مستحق نہ تھا جیسا انیسویں صدی عیسوی کے اوّل نصف حصے میں وہ نظر آتا تھا۔ ہندوستان میں ہر جگہ ضیائے نور بتدریج پھیل رہی تھی 66

مگر ساحل کرومنڈل پر جو گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں ان کی تاریکی تک اس کی شعاع نہ پہنچ سکی۔ ہم تک سرکاری اسناد کا ایک دفتر کا دفتر پہنچا ہے۔ لیکن اس میں مدراس کے اصلاح حال کی تدبیروں اور منصوبوں کو ہماری نظریں ڈھونڈتی رہیں مگر لاحاصل !

اس وقت بھی مدراس کے عہدہ دار اپنے ہی نظام پر نہ صرف کاربند تھے بلکہ کسی وجہ سے محصول کی نادہندگی پر دوامی بندوبست شدہ جاگیریں نیلام کرکے اس نظام کے حلقۂ عمل میں وسعت پیدا کر رہے تھے انیسویں [19] صدی عیسوی کے وسط میں اس حکمت عملی کی جس مستعدی کے ساتھ پابندی کی گئی تھی اس کو ایک عہدہ دار وقت نے یوں بیان کیا ہے "کسی رعیت داری کلکٹر سے اس کے مکان پر ملیے اور اس کے مہمان نواز دسترخوان پر اس سے گفتگو کیجیے تو وہ تسلیم کرلے گا کہ فلاں بڑی زمینداری جو ابھی ابھی نیلام کردی گئی ہے وہ محض اس کے انتظام کی ہوشیاری اور چالاکی کا نتیجہ ہے اور وہ یہ کہ زمیندار کو جان بوجھ کر کلکٹر نے ایسا پھانسا کہ رہائی کی کوئی صورت ہی نہ رہی اول تو اراضی کو نیلام کرنا ہی لازم نہ تھا لیکن بجائے نیلام کو موقوف کرنے کے اراضی کو بڑی بیدردی کے ساتھ نیلام کردیا گیا" اس شخص [1] نے متعدد ایسی مثالیں بھی دی ہیں جن کو پڑھنے ہی سے اب تکلیف ہوتی ہے۔

---

[1] "مدراس ـ نظم ونسق دیوانی" مولفۂ پی۔ بی۔ اسمالٹ۔ لندن ۱۸۵۸ء عیسوی ضلع تنیاولی میں جو کمپنی کی قدیم جائداد کا مالک اپنے بقایا کے تصفیے کے لیے وہاں کے کلکٹر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کو غدار اور خطرناک شخص قرار دیکر حراست میں لے لیا گیا۔ اور کوئی قانونی جرم اس پر عائد کیے بغیر اس کو ایک سیاسی مجرم کی حیثیت سے قید میں رکھا گیا اور اس کی جائداد بھی ضبط کرلی گئی۔ ضلع نلور میں ایک دیگری نے مسلمان جاگیردار پر خواہ مخواہ سرکار کی بدخواہی اور بغاوت کا الزام لگاکر بلا کسی عدالتی تحقیقات کے اس کو اسی طرح قید کرلیا گیا اور اس کی جاگیر بھی ضبط کرلی گئی۔ ضلع گنتور میں واسی ریڈی کے مقبوضات جن کی سالانہ آمدنی ساٹھ ہزار پونڈ تھی وصول بقایا کے لیے پانسو پونڈ میں نیلام کر دیے گئے حالانکہ یہ اس زمانے کا بقایا تھا جب کہ خود سرکاری عہدہ داروں نے بحیثیت ٹرسٹی (بقیہ بر صفحہ ۸۵)

رعیت واری نظام کا اصل بانی تو ٹامس منرو تھا مگر اس کے حاشیہ خیال میں بھی وہ طریقے نہیں آئے تھے جو بعد میں اس نظام کے تحت زیر عمل لائے گئے۔ اس نے ۱۸۱۲ء میں دار العوام کے سامنے یہ بیان کیا تھا کہ "رعیت واری نظام کا اصل اصول ملک کی تمام اراضی پر محصول مقرر کر دینا ہی ہے۔ یہ محصول دوامًا مقرر کر دیا جاتا ہے۔ ہر فرد رعیت جو اپنی اراضی کا مالک بھی ہے اور کاشتکار بھی اس بات کا مجاز ہے کہ مقررہ مالگزاری پر جب تک چاہے اپنی زمین پر قبضہ رکھے اور آیندہ بھی رقم مالگزاری میں بغیر کسی اضافے کے وہ اپنی زمین پر ہمیشہ قبضہ قائم رکھ سکتا ہے۔"

لیکن یہ مالگزاری بہت بڑھا چڑھا کر لگا دی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطالبۂ سرکار ہنگام کے اختلافات اور لوگوں کے تغیر حالات کے مطابق بڑھتا گھٹتا رہا۔ اس طرح صوبے کی سو سالہ تاریخ اس محصول اراضی کے اتار چڑھاؤ کی تاریخ ہے یعنے حکمنامے پر حکمنامے جاری ہوتے تھے کہ محصول اراضی کل وہ تھا آج یہ کر دیا گیا۔ مصائب یا قحط کے آثار نمایاں ہوں تو اس میں تخفیف ہو جاتی تھی۔ اور خوش حالی کی پہلی علامت نظر آنے لگتی تو اضافہ ہو جاتا تھا۔ موجودہ عہد کی تاریخ میں ایسے انتظام کی ایک بھی مثال نہیں ملے گی جہاں اراضی پر مالگزاری عائد کرنے کا ایک کا ایک ایسا نظام قائم ہو جس کے تحت سال بسال ملک کے انتہائی مقدور تک مالگزاری وصول کر لی جائے۔ اور اسی طرح ایک بڑی محنتی اور متمدن آبادی کیلیے اصلاح حال یا زرعی دولت کی تحصیل بالکل ناممکن بن جائے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے منشور کی مکرر تجدید سے پہلے ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۳ء کی پارلیمنٹی تحقیقات میں اس نظام کی خرابیوں کی خوب پردہ دری ہوی اسی تحقیقات کے سلسلے میں مدراس کے حکام کا بھی بیان لیا گیا۔ اور ان عہدہ داروں نے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ)۔ اس جاگیر کا انتظام کیسا تھا ضلع مچھلی پٹن میں نیڈاوول کی جاگیر جس کی سالانہ آمدنی تین ہزار پونڈ تھی بارہ سو پونڈ میں نیلام کر دی گئی۔ ضلع وزیگاپٹن میں گولکنڈہ کی قدیم زمینداری جس کی سالانہ آمدنی ہزار پونڈ تھی صرف دس پونڈ میں نیلام کر دی گئی۔ اس طرح ایک ایک کرکے اور جاگیریں بھی نیلام کر دی گئیں پھر ان زمینات میں رعیت واری نظام کی ترویج آسان ہو گئی۔

بے باکانہ سب کچھ کہدیا۔

میلکم لیون نے جس نے ہندوستان میں بیس سال تک کلکٹر اور جج اور رکن کونسل کی حیثیت سے مختلف خدمتیں انجام دی تھیں دارالعوام کی مجلس منتخبہ کے سامنے بیان کیا کہ "میرے خیال میں نظام مالگزاری سے ملک کے اخلاق کا بہت بڑا تعلق ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ "مدراس میں ابھی نظام مالگزاری ایسے موجود ہیں جن سے ایک طرف تو ملک کے اخلاق کی بیخ کنی اور دوسری طرف رعایا کے افلاس میں اضافہ ہونے کا احتمال ہے۔" اس نے یہ بھی کہا کہ "تحصیلدار تحقیقات کے لیے ادھر اُدھر دورہ کرتے رہتے ہیں اور انھیں کے ہاتھ میں اس تمام رقم مالگزاری کا تعین ہے جو سرکار رعیت واری اضلاع سے وصول کرتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں 79
کہیں تحصیلدار پہنچتے ہیں اس گاؤں کی رعیت سب سے پہلے تحصیلداروں کو رشوت دیکر اس لیے اپنا کرلیتی ہے کہ مالگزاری ان پر کم باندھی جائے۔"

جیمز ولیم بی ڈائکس نے جو ضلع سالم میں مالگزاری کا کام کرچکا تھا دارالعوام کے سامنے بیان کیا کہ اس صوبے میں اس سرے سے اس سرے تک رعیت واری نظام میں حسب تفصیل ذیل نقائص موجود تھے۔

(۱) محصول لگانے کی بے قاعدگی یعنے کاشت کاروں کی اراضی میں اصلاح کی صورت پیدا ہوتے ہی لگان میں اضافہ کردینا۔ (۲) ملکیت اراضی کا تذبذب اور (۳) قواعد مالگزاری سے جاہل ناخواندہ کاشتکاروں کی ناواقفیت۔

مدراس کے عمال نے ۱۸۵۵ء میں بمجبوری اصلاح کی وہی تدابیر اختیار کیں جن کو شمالی ہند میں ۱۸۳۳ء میں اور بمبئی میں ۱۸۳۵ء میں اختیار کیا گیا تھا۔ ایک وسیع پیمانے پر پیمایش اور بندوبست کرنے کا تہیہ کیا گیا اور حکومت مدراس نے اپنے ۱۸۵۵ء کے مشہور حکم میں اس بندوبست سے خوشگوار ترین نتائج مرتب ہونے کی توقع ظاہر کی۔

"اگر صحیح طور پر پیمایش کی جائے اور احتیاط کے ساتھ بندوبست مالگزاری عمل میں آئے تو سب خرابیاں دور ہو جائینگی۔ ہر شخص کو کتنا لگان ادا کرنا چاہیے اس کا تعین ہو جائے گا۔ عام کلیہ یہی بن جائے گا اور معاشیات کا مسئلہ ہی پھر

باقی نہیں رہے گا۔ کہ اس کے لیے سازشیں کی جائیں اور لوگوں کو رشوتیں
دی جائیں۔ اس طرح ایک طرف لجاجت اور عاجزی کرنے اور رشوت
دینے کا اور دوسرے طرف رشوت ستانی اور بددیانتی کا بہت کچھ انسداد
ہو جائے گا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسے نظام کے تحت موجودہ مالگزاری
سے زیادہ رقم رعایا کو بہ نسبت پہلے کے کم زحمت دیکر وصول ہو سکتی ہے۔ نہ صرف
رعیت کا پیسہ جو عہدہ داران سرکاری کو رشوت دینے میں صرف ہوتا ہے
رعیت کو بچ جائے گا۔ بلکہ مالگزاری کی مساوی تقسیم سے ان لوگوں کو بھی
محصول کے مزید بار سے نجات مل جائے گی جو اس وقت بے انتہا رقم ادا کر رہے
ہیں۔ اور وہ لوگ بھی مالگزاری کا ایک واجبی حصہ ادا کرنے لگیں گے جو ناواجبی طور
پر اس وقت تک اس سے گریز کرتے رہے ہیں۔ فقط یہی نہیں بلکہ اس کا بھی یقین
ہے کہ اگر محصول مبنی بر اعتدال اور معینہ ہی رہے تو لوگ جلد جلد اراضی زیر قبضہ 80
لینے لگیں گے۔ فی الوقت اراضی پر بالواسطہ اور بلاواسطہ بار سنگین عائد ہونے
کی وجہ سے کاشت بے شک دبی ہوئی سی ہے لیکن جب یہ بوجھ ہلکا ہو جائے گا تو
نہ صرف اصلی زراعت پیشہ طبقے اور زمینوں کو اپنے زیر قبضہ لے لیں گے بلکہ تاجر طبقے
کے اکثر اشخاص بھی اپنی کمائی زراعت میں لگائیں گے۔

مزید برآں یہ بات یقینی ہے کہ بے انتہا مالگزاری لینے اور صحیح حسابات نہ
رکھنے سے بڑے پیمانے پر جعل سازی اور کاشت کے چھپانے کا موقع رعیت کو مل
جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسی ایسی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے جس سے ایک وسیع پیمانے
پر ان کے وقوع کا ثبوت ملتا ہے۔ اور تمام عہدہ داران مالگزاری کو معلوم ہے
کہ عام طور پر یہی ہوتا ہے مگر ذیلی اہل کار رشوت لے کر اس سے چشم پوشی کر جاتے
ہیں جس سے اصل حال مخفی رہتا ہے اور منکشف نہیں ہونے پاتا۔

مالگزاری کی تخفیف کے ساتھ ہی اس کی ادائی سے لوگوں کا دغابازی
سے گریز کرنا کم ہو جائے گا۔ کیونکہ چشم پوشی کے لیے اہل کار کو رشوت دینے کی
ضرورت بھی کم ہو جائے گی اور صحیح طور پر پیمائش اور حسابات پاک وصاف ہو جانے
کے بعد ایسی جعلسازیاں ان کے لیے مشکل اور خطرناک ہو جائینگی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اس قدر اراضی کسی کے زیر قبضہ نہ ہونے سے یوں ہی پڑی رہے، صلح پسند اور جفاکش رعایا کو پیٹ بھر کھانا اور پیٹ پالنے کے برابر مزدوری نہ ملنے پر گھر بار چھوڑنے کی سخت مخالفت کے باوجود محنت مزدوری کے لیے سمندر پار جانا پڑے اور ہر سال سڑکوں اور ذرائع آمد و رفت میں توسیع اور ترقی بھی ہوا کرے تو پھر ان حالات میں یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر محصول اراضی میں اتنی تخفیف کردی جائے جس سے زراعت نفع بخش ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فی الفور زراعت میں بہت بڑی توسیع ہو جائے گی۔ ان توقعات کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ بڑے بڑے خطوں پر جو محصول اب ادا نہیں ہو رہا ہے وہاں ایسے اسباب پیدا ہو جائینگے کہ ان پر مالگزاری کا واجبی مطالبہ قابل عمل بن جائے گا۔ سب سے آخر یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ مجوزہ طریقوں پر کاربند ہونے کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ اس بات کی بہ مشکل توقع کی جاسکتی ہے کہ اس وسیع صوبے کی پیمائش اور بندوبست پندرہ ۱۵ یا بیس ۲۰ سال سے کم مدت میں تکمیل پائے گا۔ اسی طرح ہر سال مالگزاری کے صرف $\frac{1}{15}$ یا $\frac{1}{20}$ حصے کے متعلق معاملہ طے ہوا کرے گا۔ اور ایسے وسائل ان نئے طریقوں کی وجہ سے پیدا ہو جائیں گے۔ جن سے کمئی محاصل کی تلافی ہو جائے گی۔ 81
مجموعی حیثیت سے اس صوبے کی خراب و خستہ حالت کا لحاظ کرتے ہوئے اس بات کی پوری پوری توقع رکھنا درست معلوم ہوتا ہے کہ ان تدابیر کا نتیجہ سرکار مالگزاری میں کسی قسم کا خسارہ ہونے کی بجائے اس میں اضافہ ہی ہوگا اور محصول دہندگان ملک اور عوام الناس کو کثیر فائدہ پہنچے گا۔ ذرائع مالگزاری بھی موجودہ ذرائع کے مقابل دو چند بلکہ سہ چند ہو جائیں گے۔ اور اسی تناسب سے سہولت کے ساتھ اور کسی کو عسرت میں گرفتار کیے بغیر مطالبۂ سرکار وصول ہو جائے گا۔"

ہم نے یہ طول طویل اقتباس اس لیے پیش کیا ہے اسی اشتہاد سے مدراس کے انتظام مالگزاری کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۵۵ء

کی مجوزہ پیمایش و بندوبست کے نتائج ہم بعد کے کسی باب میں بیان کریں گے

چھٹا باب

پنجاب میں بندوبست اراضی

سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد لارڈ ہارڈنگ نے ۱۸۴۶ء میں پنجاب کا کچھ حصہ انگریزی عملداری میں شامل کر لیا تھا مگر سکھوں کی دوسری جنگ کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا باقی حصہ بھی اپنے زیر تسلط کر لیا۔ اس صوبے کی حالت سکھوں کے سابقہ عہد حکومت نیز انگریزوں کی حکمرانی میں کیا تھی اس کا صاف صاف بیان پنجاب کے نظم ونسق کی پہلی رپورٹ میں جو ۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی تھی درج ہے۔

رنجیت سنگھ کے عہد میں جس نے اس صوبے کو ایسا مستحکم اور قوی بنا دیا تھا کہ وہ ایک طاقتور سلطنت کے برابر ہو گیا تھا صرف وہی اشخاص جو جراءت اور اعلیٰ قابلیت کی بناء پر ممتاز و سربرآوردہ تھے اور عدالتی اور مالی اعلیٰ اختیارات کے ساتھ محصول مالگزاری کے لیے دور دور از مقامات پر بھیجے جاتے تھے انھیں لوگوں میں ایک جنرل اویٹبل بھی تھا جس نے اپنے پنجۂ آہنی کے زور سے پشاور کو سرنگوں کر رکھا تھا۔ اور دوسرا سورما ہری سنگھ تھا جس نے ہزارہ نامی کوہی قبیلے کے سرکش و تند خو لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف مطیع و منقاد بنا رکھا تھا۔ لاہور کے قریب نیز اضلاع میں مالگزاری وصول کرنے پر "کاردار" یعنے کارپرداز مقرر تھے۔ اور ان کی اہم ترین کارروائیوں پر لاہور کی وزارت نگرانی کرتی تھی۔

یہاں کوئی قانون اب تک منضبط نہیں ہوا تھا اور عدل و انصاف بالکل انتظامی اور سیدھے سادھے طریقے پر ہوتا تھا۔" خانگی ملکیت اراضی کاشتکاروں اور مالکان اراضی کے حقوق اضافی اور دیہی جماعتوں کی اجتماعی حیثیت غرض یہ سب کچھ تسلیم کی جاتی تھی۔ مقامی حکام کے زیر ہدایت خانگی ثالثی سے اکثر کام لیا جاتا تھا۔ حقیقی اور شخصی جائداد کے مشکل ترین مسائل کا تصفیہ بھی یہی پنچایتیں کرتی تھیں ...... مہاراجہ بھی ہمیشہ اپنی قلمرو کا دورہ کرتا تھا۔ اس کی سواری جب باہر نکلتی تھی تو وہ سب کی فریاد سنتا تھا اور جس صوبے میں وہاں کے صوبہ دار کے متعلق بہت زیادہ شکایتیں پیش ہوتی تھیں تو اس پر عتاب کرتا تھا۔ اپنے دربار میں بھی وہ شخصی استغاثے کی سماعت کرتا تھا۔"

یہاں محصولات بہت سنگین تھے "لیکن بعض امور کے لحاظ سے یہ کہا جاسکتا تھا کہ اگر ایک ہاتھ سے سرکار لیتی تھی تو دوسرے ہاتھ سے دیتی بھی تھی۔ سرکار کے دائرۂ ملازمت میں بے شمار لوگ داخل تھے۔ فوج میں بھرتی ہونے کے لیے گاؤں گاؤں سے لوگ آتے تھے اور نوکری میں اپنی کمائی جو کچھ پس انداز کرسکتے تھے وہ اپنے اپنے گھروں کو بھیجدیتے تھے۔ متعدد مواضعات میں جن پر بہت سنگین محصول اراضی لگادیا جاتا تھا کم سے کم اس محصول کا نصف یہ لوگ اپنی فوجی آمدنی سے ادا کرتے تھے اور اس طرح زر برابر دست بدست پھرتا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں محصول اراضی اصولاً خام پیداوار کا نصف تو تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ عملی طور پر درحقیقت اوسطاً خام پیداوار کے دوخمس سے لیکر ایک ثلث تک ہوتا تھا۔" ان سب صوبوں میں جن کو سکھوں نے کلیتاً فتح کر لیا تھا اور جہاں کاشت بھی معقول ہوتی تھی محصول اراضی کا یہی تناسب قائم تھا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بہ استثناء اس صوبے کے جو دیوان ملراج کی زیر حکومت تھا دریائے سندھ کے اس کنارے پر تمام مقبوضات میں محصول کا یہی تناسب نافذالعمل تھا۔ البتہ دریائے سندھ کے اس پار مالگزاری کا یہ نظام لوگوں پر اس قدر باران وجوہ سے نہ تھا کہ یہ خطہ مستقر کی نگرانی سے بہت دور تھا اور وہاں کے لوگوں میں زیادہ صبر و برداشت کا مادہ نہ تھا نیز املاک

کی حالت وہاں غیر محفوظ تھی اور آبادی کم تھی"۔
محصول اراضی جیسا کچھ تھا نقد نہیں بلکہ بہ شکل جنس وصول کیا جاتا تھا۔ اور
اس لیے اچھے اور برے دونوں ہنگام میں کھیتوں کی پیداوار کے ساتھ اس کا تناسب
یکساں رہتا تھا۔ ایسے نظام کے تحت جب کسی سال ہنگام خراب ہو تو یہ لازم نہ تھا
کہ کاشتکار ایک معینہ اور غیر متغیر رقم ہی ادا کریں۔ یا ان ایام میں جبکہ عام قیمتیں گری
ہوئی ہوں وہی مالگزاری ادا کریں جو عام قیمتیں بڑی رہنے کے وقت معین کی
گئی تھی۔
۱۸۴۶ء کے دوسرے معاہدے کی رو سے جس کی تکمیل اسی سال دسمبر میں ہوئی
پنجاب کے دیوانی اور فوجی معاملات ایک انگریز رزیڈنٹ کی زیر نگرانی کر دیے گئے
اور "ہنری لارنس" وہاں کا پہلا رزیڈنٹ مقرر ہوا۔ ہندوستان کی اس عہد کی تاریخ 84
میں گو وہ زمانہ قابل منتظمین مملکت اور بہادر سپاہیوں کے لیے مشہور تھا، کسی کا نام
ایسا روشن نہیں جیسے "صلح کار" ہنری لارنس کا نام ہے۔ اس کی ولادت ۱۸۰۶ء
میں ہوئی۔ اس نے ۱۸۲۵ء کی پہلی جنگ برما میں شرکت کی۔ پشاور میں سکھوں کے سرداروں
پر اچھی نگرانی رکھی اور ۱۸۴۲ء میں افغانستان پر چڑھائی کرنے میں پولک کی کمک کی۔
اس نے جنگ سبراؤں میں حصہ لیا جس پر ۱۸۴۶ء میں سکھوں کی پہلی جنگ ختم ہوئی
تھی۔ اس وقت ہندوستان میں ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جس کو سکھوں کے حالات
سے ہنری لارنس سے زیادہ واقفیت تھی۔ یا جس کا اثر سکھوں پر لارنس سے بڑھ کر
تھا۔ کوئی ایسا بھی نہ تھا جس کو لارنس سے زیادہ سکھوں کی خوبیوں کا احترام ملحوظ یا
سکھوں کی حیثیت و وقار اور خود مختاری برقرار رکھنے کی سچی خواہش دل میں جگہ کیے ہوئی
تھی۔ بہ حیثیت رزیڈنٹ کے ہنری لارنس عملی طور پر پنجاب کا حکمران تھا۔ اس نے اپنی
سب اصلاحی تجاویز نیابتی مجلس کے ذریعے سے جو آٹھ سرداروں پر مشتمل تھی منظور کرائیں۔
ان اصلاحوں میں ایک اصلاح البتہ رعایا کے حق میں کلیتاً مفید نہیں تھی۔ وہ یہ کہ قدیم
نظام کے بجائے جس کے تحت محصول اراضی بہ شکل جنس وصول ہوتا تھا۔ انگریزوں کا
جدید انتظام اس نے قائم کر دیا۔ جس کے تحت مالگزاری نقدی کی شکل میں وصول
ہونے لگی۔ مطالبہ سرکار میں برائے نام تخفیف تو ہو گئی مگر سرسری بندوبست اور زر کی

شکل میں تعین محصول سے جیسا انگریزی سرکار کے عہدہ دار کرتے تھے کاشتکاروں کے کندھوں کا بوجھ ذرا بھی ہلکا نہ ہوا۔ البتہ اور باتوں میں لارنس زیادہ کامیاب رہا۔ سکھوں کے اداروں سے اس کا ربط ضبط قائم تھا۔ مختلف مواضعات سے پچاس چودھری منتخب کیے گیے۔ جنھوں نے سردار لہنا سنگھ کی نگرانی میں ایک سیدھا سادہ قانون منضبط کیا جو سکھوں کے رواج پر مبنی تھا۔ تشدد آمیز محصولات اور سرکاری اجارے سب مسدود کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ ہنری لارنس نے اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے لائق فائق کارکن عہدہ داروں کا انتخاب کیا۔ جن کو اس صوبے کے مختلف اقطاع میں نظم ونسق کا نگران کار بنایا گیا۔ سردار اور روسا، مالکان اراضی اور عوام الناس اس کے انتظام مملکت کی قدر جانتے تھے اور اس صلح کار اعظم کی حکمرانی کے آگے سر تسلیم خم کرتے تھے۔

بدنصیبی سے جن دو شخصوں نے پنجاب میں امن قائم کیا انھوں نے تھوڑی
85 ہی مدت میں ہندوستان کو خیرباد کہا۔ ہنری لارنس کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی اس لیے اس نے ۱۸۴۷ء میں بہ مجبوری ہندوستان سے وطن کی طرف مراجعت کی۔ اور لارڈ ہارڈنگ نے ۱۸۴۸ء کی ابتدا میں لارڈ ڈلہوزی کو زمام حکومت تفویض کر دی۔ اس کے بعد ہی ہنگامہ وفساد شروع ہوے جن کی بڑھتے بڑھتے سکھوں کی دوسری جنگ تک نوبت پہنچ گئی۔ اس کی تفصیل کسی دوسرے باب میں بیان ہو چکی ہے۔

ہنری لارنس جس کو ممتاز خدمات کے صلے میں "سر" کا خطاب حال میں ملا تھا، اس ہنگامے کی خبر سنتے ہی بعجلت تمام ہندوستان واپس آیا۔ اور جنوری ۱۸۴۹ء میں میدان چلیان والا میں جو گھمسان کی لڑائی ہوی تھی اس میں لارڈ گوف کے دوش بدوش یہ بھی کھڑا ہو گیا۔ فروری میں دوسری جنگ گجرات میں ہوی جس کے بعد سکھوں کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور پھر پنجاب کا فیصلہ ہو گیا۔ ہنری لارنس نے انگریزوں کے پنجاب کو الحاق کر لینے کی مخالفت کی مگر اس کے بھائی جان لارنس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ اس الحاق کا حامی تھا۔[1]

۱؎ عام طور پر یہی خیال پھیلا ہوا ہے لیکن اس واقعہ کے اٹھارہ سال بعد خود جان لارنس نے

غرض ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء میں اعلان کر دیا گیا کہ پنجاب کی فرمان روائی اب ملکہ انگلستان پر منتقل ہو چکی ہے۔

جیسے ہی سر ہنری لارنس نے یہ فیصلہ سنا اس نے اپنا استعفا دیدیا۔ یہ کچھ تو اس وجہ سے تھا کہ اس الحاق کے برملا خلاف انصاف ہونے کے متعلق اس نے اپنا خیال پہلے ہی ظاہر کر دیا تھا اور زیادہ تر اس عقیدے کی بنا پر بھی کہ اب جو انتظامات ہونے والے تھے وہ مفتوح قوم کے حق میں موجب سختی ہوں گے۔ لیکن لارڈ ڈلہوزی اس صلح کار کی قدر و قیمت سے خوب واقف تھا اس لیے اس نے سر ہنری کو جانے نہیں دیا۔ ڈلہوزی نے اپنے معتمدِ خاص کے ذریعہ سے اس کو کہلا بھیجا کہ وہ پنجاب میں اپنی موجودہ اعلیٰ خدمت ہی انجام دیتا رہے۔ "اور کچھ نہ سہی تو اس خاص غرض ہی سے سہی کہ اپنے مقصد عظیم کے حصول کا یعنے اس کا کہ مفتوحین کا نہ صرف از روئے انصاف لحاظ کیا جائے بلکہ اس سے بھی زیادہ ان کے خواہشات کی پاسداری ہو۔ اس کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔ وہی ایک شخص ہے جو اس وقت اس خوددار اور بہادر غنیم کے اس طرح اطاعت قبول کر لینے کے ناگزیر صدمے اور کوفت کو ان کے دلوں سے دور کر سکتا ہے اور دوسرا ایسا کوئی نہیں جو ان کے سرداروں اور رہنمایان قوم سے اس طرح بے تکلف خلا ملا رکھتا ہو یا ان کی شرافت نفس کا ایسا ہی قدردان ہو جیسا سر ہنری تھا۔"

جب اس استدلال کے ساتھ یہ استدعا کی گئی تو پھر سر ہنری کو مان لینے کے 87
سوا چارہ ہی نہ تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کے انتظام مملکت کے لیے ایک مجلس قائم کی جو تین (۳) اشخاص پر مشتمل تھی۔ سر ہنری لارنس اس کا میر مجلس تھا اور اس کا بھائی جان لارنس اور چارلس منسیل اور چند روز کے بعد چارلس منسیل کے بجائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اس سے انکار کیا اور وزیر ہند سر اسٹیفرڈ نارتھ کوٹ کو لکھا کہ "میں پوری صداقت کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ الحاق کی کسی وسیع العمل تجویز سے مجھکو کبھی کچھ تعلق نہیں رہا ہے۔ بجز ایک پنجاب کے الحاق کے اور وہاں بھی مجھکو صرف اس منصوبے کے سرانجام سے تعلق تھا۔ لیکن الحاق کی حکمت عملی سے مجھکو کچھ سروکار نہ تھا۔" مراسلہ مورخہ ۲۰ جون ۱۸۶۷ء (سوانح عمری لارڈ لارنس مولفہ بوزورتھ اسمتھ ۱۸۸۵ء) جلد دوم ص ۳۸۵)

رابرٹ منٹگمری اس کے ارکان مقرر ہوے۔ سر ہنری کو سیاسی امور انجام دینا تھا۔ جان لارنس کی زیر نگرانی دیوانی اور مالگزاری کا نظم ونسق تھا اور منسیل اور اس کے جانشین منٹگمری کے زیر اہتمام عدالتی کاروبار تھا۔

یہ مجلس یکدل ویکجہت ہوکر کام نہ کرسکی۔ ہنری لارنس اپنی فیاض طبعی سے ہر وقت کوشاں تھا کہ انگریزوں کے اس نوحاصلہ صوبے میں ان سرداروں کا جو اب ادبار میں گرفتار تھے پہلے کی طرح اعلیٰ رتبہ قائم رہے اور جیسے سابق میں ملک کے امرا میں ان کا شمار ہوتا تھا اب بھی ہو۔ جان لارنس نے اس بارے میں لارڈ ڈلہوزی کی طرح کسی قدر تنگ خیالی سے کام لیا اور اس کی رائے میں یہ سردار "گزارے" سے بڑھ کر کسی بات کے مستحق نہ تھے اور ان کو یا کسی کو رعایا اور پردیسی حکمرانوں کے درمیان مداخلت کا حق نہ تھا۔ ہنری لارنس کی مسلسل کوشش یہی تھی کہ قوم کے ان ذی اثر فطری رہنماؤں کو تسلیم کرلیا جائے۔ برخلاف اس کے جان لارنس جس کے زیر تفویض انتظام مالگزاری تھا اس بات کا خواہاں تھا کہ جو کچھ محصولِ اراضی کاشتکار ادا کرتے ہیں اس پر خوب گرفت رکھی جائے اور ان قدیم سرداروں کو مان لینے میں اس کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ سرکار کا حق مالگزاری مارا جاتا ہے۔

یہ دو بھائی جو ایک دوسرے کا بہت کچھ ذاتی لحاظ کرتے تھے سرکاری معاملات میں ایک دوسرے سے بالکل کشیدہ ہوگئے جس سے سرکاری کام میں حرج ہونے لگا۔ جان لارنس نے گورنر جنرل کے معتمد خاص کو لکھا کہ "میں اور میرے بھائی ہم دونوں مل کر پہلے سے بہتر کام نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں کشیدگی اور بڑھ گئی ہے۔ شاذ ہی ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ شاذ ہم سرکاری معاملات پر کبھی گفتگو کرتے ہیں...... میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ اگر اس قماش کے دو آدمی ایک جگہ جمع ہوجائیں جو ارادے کے قوی بھی ہوں اور خیالات میں متضاد بھی اور جن کے عادت واطوار اور طریقِ کار میں بین تفاوت ہو تو پھر سب سے زیادہ خرابی اور بگاڑ کی بات ہوگی"۔

ایک ساتھ دونوں بھائیوں نے استعفا پیش کردیا۔ اس پر لارڈ ڈلہوزی کے لیے ان دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ناگزیر ہو گیا۔ مگر اس نے انتخاب میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ مجلس نظم و نسق برخاست کر کے اس نے جان لارنس کو پنجاب کا چیف کمشنر بنا دیا اور سر ہنری لارنس کو تبادلے کے ساتھ راجپوتانے میں نائب سرکار کی کم ذمہ دارانہ اور کم حیثیت خدمت دیدی۔

لارڈ ڈلہوزی نے یہ فیصلہ کیا صادر کیا گویا پنجاب پر ایک بجلی گرادی۔ "یہ خبر سن کر ہر ایک کی صورت غمزدہ سی ہو گئی۔ پیر و جوان۔ مالدار و مفلس۔ سررشتۂ فوج اور دیوانی کے ملازم۔ اہل قلم و اہل سیف۔ انگریز اور دیسی لوگ غرض بلا استثناء ہر شخص یہی محسوس کر رہا تھا کہ اس کا ایک دوست و بہی خواہ ہمیشہ کے لیے اس کو داغ مفارقت دے کر جا رہا ہے۔ قوی دل مرد (جن میں ہربرٹ ایڈورڈز بھی نظر آتا تھا) بچوں کی طرح ڈھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے جب وداع کا وقت آ پہنچا اور جب ہنری لارنس نے اپنی بیوی اور بہن سمیت سنہ ۱۸۵۳ء ۲۰ جنوری کو لاہور اور پنجاب کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا تو دیسی سرداروں کی ایک لمبی قطار شہر سے باہر بہت دور تک اس کے جلو میں نظر آتی تھی۔ ان میں سے بعض پانچ بعض دس اور بعض بیس پچیس میل تک اس کے ہمرکاب گئے۔ یہ لوگ اپنے اپنے غریبانہ حوصلے کے موافق نہایت خلوص کے ساتھ رنج و غم۔ تشکر و تحسین کا اظہار کر رہے تھے کیونکہ ان کو ہنری لارنس سے جس کا نیر اقبال کم سے کم پنجاب میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا تھا۔ اب تو کچھ توقع نہ رہی تھی کہ ظاہرداری کے لیے اس طرح کریں۔ یہ جلوس لاہور سے امرتسر تک لمبا تھا اور ایسا تھا کہ گویا کسی کا جنازہ نکلا ہے۔ رابرٹ نے پیر جو اس زمانے میں لارڈ نے پیر مگڈالہ کے خطاب سے ممتاز تھا سب سے آخر اس سے رخصت ہوا کیونکہ ہنری لارنس اس کو بھائی سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ نے پیر دل شکستہ لاہور کی طرف چلنے کھڑا ہوا تو ہنری لارنس نے اپنی بہن سے مخاطب ہو کر کہا کہ "بہن نے پیر کو پیار کرو۔ یہ میرا بہترین اور عزیزترین دوست ہے۔" ہنری لارنس جب امرتسر پہنچا تو چارلس ساندرز نامی ڈپٹی کمشنر کے گھر پر سوگواروں کی ایک نئی جماعت کھڑی تھی اور یہاں پھر اظہار

رنج و ماتم کیا گیا مگر قیصر سے وہ راجپوتانے روانہ ہو گیا۔"

اس قصے میں ہم سرہنری لارنس کا نام پھر سنیں گے۔ ۲۲ جولائی ۱۸۵۷ء میں جبکہ انگریزی سرکار کو شمالی ہند میں ایک بہت بڑی بغاوت کا دغدغہ لگا ہوا تھا اور کسی روز بھی لارڈ کیننگ کی وفات یا استعفا کی خبر آنے والی تھی جس سے ہندوستان میں کوئی رہنمائے حکومت باقی نہیں رہتا تھا۔ اس وقت خلوئے جائز کے امکان کے خیال سے مجلس نظمائے نے کسی کو گورنر جنرل کی خدمت پر پیش از پیش نامزد کرنا مناسب سمجھا تھا چنانچہ نظمائے نے اس خدمت کے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جس نے میدان جنگ میں آپ کو ایک بہادر سپاہی اور صلح کے زمانے میں ایک ہمدرد منتظم مملکت ثابت کر دکھایا تھا۔ بنابراں یہ تجویز منظور ہوئی کہ "وائیکونٹ کیننگ کی وفات یا استعفا یا مراجعت وطن پر اس کے جانشین کے انگلستان سے آنے تک سرہنری منٹگمری لارنس کے۔ سی۔ بی گورنر جنرل ہند کے عہدہ پر مامور کیا جائے۔" لیکن یہ اعزاز بعد از وقت تھا کیونکہ سرہنری لارنس ۴ جولائی کو لکھنو میں مارا گیا۔ سرہنری اس ایک مشہور انگریز کو چھوڑ کر جس کی قائم مقامی کے لیے اس کا انتخاب کیا گیا تھا ہندوستان بھر میں اس زمانے کے سب انگریزوں میں فیاض ترین منتظم مملکت تھا۔

اس شخصی دلچسپی سے قطع نظر کر کے جو ہنری لارنس کے سوانحہ زندگی سے وابستہ ہے اس کی حکمت علی عامہ بھی خود ایسی تھی جو ہندوستان کے منتظمین مملکت کے لیے ہمیشہ دلچسپی کا باعث ہو گی۔ وہ ایک خاص خیال کے منتظمین مملکت کا جن کے بانی گزشتہ پشت میں الفنسٹن اور بنٹنک تھے مگر جن کا نام و نشان آکلینڈ اور ڈلہوزی کی شہنشاہی پسندی کے زیر اثر اب مٹ رہا ہے اپنے وقت کا نمائندہ تھا۔ جنرل مکلاؤڈ انس کہتا ہے کہ "اس خاص خیال کے اشخاص دیسیوں کے احساسات روایات اور تخیلات کا خاص لحاظ کرنے اور دیسی ریاستوں کے حقوق کو واجبی طور پر تسلیم کر لینے کا مطالبہ کرتے تھے اور قوم کے فطری رہنماؤں کے ساتھ ہمیشہ عاقلانہ اور فیاضانہ برتاؤ کرنے کی صلاح دیتے تھے۔"

لارڈ ڈلہوزی تو خاص اس خیال کے لوگوں کو نہ کبھی سمجھ ہی سکا اور نہ اس نے

ان کی قدر رہی کی۔ بس وہ شہنشاہی پسند تھا اور آخر تک وہی رہا۔ اس کی رائے میں ہندوستانیوں کے لیے بہترین نظم ونسق پر دیسی حکمرانوں کا بلا توسط کسے براہ راست انتظام مملکت کرنا ہی تھا۔ یہ درمیانی روسا و سرداراور رہنمائے قوم سب انتظام مملکت میں حائل اور اصلاح کے سنگ راہ تھے۔ بیشک اس نے بھی وہی غلطی کی جو ہندوستان میں متعدد بار انگریز حکمرانوں نے کی تھی۔ وہ یہ کہ قدیم اداروں اور سن رسیدہ و تجربہ کار رہنمایان قوم کو نظر انداز کردیا۔ اور ان کے بجائے اس نے انگریز عہدہ داروں کی شخصی حکومت بلا واسطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ سرہنری لارنس کو پنجاب سے کیا نکالا کہ اس کی حکمت عملی کی بیخ کنی کردی۔ قوم کے فطری رہنماؤں کا صفایا کردیا۔ اور جب صرف کاشتکاروں کی قوم باقی رہ گئی تو اس کو بھی براہ راست حکومت کے تحت کرلیا۔ اس بات کو پچاس سال گزر گئے ہیں مگر اس مدت میں یہ حکمت عملی تجربے سے نہ تو عاقلانہ ثابت ہوئی اور نہ اس سے نظم ونسق ہی کچھ اچھا چل سکا ہے۔

قومی ادارے قومی ضرورتوں کا نتیجہ اور گویا ان کی زبان اظہار ہیں۔ ہندوستانیوں نے دیہی جماعتوں کو ترقی دی تھی۔ اور کہیں پالی گاروں زمینداروں جاگیرداروں اور کہیں تعلقداروں سرداروں اور پنچایتوں کے تحت رہنا اس لیے قبول کرلیا تھا کہ ان کی رعایا کو ضرورت تھی۔ دراصل ہندوستانیوں کی معاشرتی تنظیم ان کی معاشرتی ضرورتوں پر مبنی تھی۔ اور لوگ اپنے فطری رہنماؤں کے زیر سایہ اور دیہی جماعتوں کے حلقۂ اثر میں زیادہ خوش تھے۔ اور یہی سمجھتے تھے کہ اس طرح رہنے میں ان کے حقوق زیادہ محفوظ ہیں۔ پھر ایسے انتظامات میں رخنہ ڈالنا کسی حکمران کے لیے بھی عقلمندی کی بات نہ تھی۔ بالخصوص ہر دیسی حکمرانوں کے لیے تو رعایا کے منتظمہ اداروں کو نظر انداز کردینا سراسر ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھا۔

اس طرح قومی احتیاج تو پیدا کردی گئی مگر اس کی تکمیل کی اب تک کوئی صورت نہیں پیدا کی گئی۔ قدیم دیہی جماعتوں کی جگہ کوئی مناسب طور پر حکومت خودمختاری رکھنے والے ادارے قائم نہیں کیے گئے۔ ان حالات میں قوم کے

فطری رہنما مدراس بمبئی اور پنجاب میں اپنی قومی خواہشات اور قومی خیالات کی معقول طور پر کیا خاک ترجمانی کر سکتے تھے ۔ چنانچہ ان صوبوں کی حکومتیں بمقابل حکومت بنگالہ کے جہاں لارڈ کارنوالس کی مہربانی سے شیرازۂ معاشرت پریشان ہوتے ہوتے رہ گیا تھا رائے عامہ سے کم متاثر ہیں اور کم استفادہ کرتی ہیں مثلاً دیہی جماعتوں اور درمیانی بہر آوردہ اشخاص اور سرداروں کی غیر موجودگی میں بمبئی اور مدراس دونوں جگہ تشخیص لگان میں سختی اور زیادتی سے کام لیا گیا تھا ۔ پنجاب میں جہاں نصف صدی سے پہلے قوم کے رہنماؤں کو ناعاقبت اندیشی سے نظر انداز کر دیا گیا تھا کاشتکاران اراضی جن کو یوں ہیں مالکان اراضی کا بھی لقب دیدیا گیا تھا کچھ ایسے خوش حال نظر نہیں آتے تھے اور اب وہ وقت آپہنچا تھا کہ حکومت ان لوگوں کو ایک خاص طبقے کے رہنماؤں سے یعنی سٹہ کھیلنے والوں صرافوں اور ساہوکاروں سے جن سے بدتر اشرافیہ کسی ملک میں ہو نہیں سکتی بچانے کی کوشش کرے ۔

یہ ایک سیدھی اور سچی بات ہے کہ جیسا ایشیا میں ویسا یورپ میں اقوام کے تحفظ حقوق اور فلاح و بہبود کے لیے کسی نہ کسی طرح کی نمایندگی قوم اور کسی نہ کسی قسم کی حکومت خود اختیاری کا ہونا ضروری ہے ۔ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کے جو اشکال موجود تھے ان سے انگریز واقف نہ سہی لیکن ان سے سب قومی اغراض پورے ضرور ہوتے تھے ۔ البتہ ان میں ترقی و اصلاح بھی ضروری تھی پھر بھی کیا اچھا ہوتا کہ انھیں کا نشو ونما کیا جاتا مگر اس کے بجائے سرے سے ان کو میٹ دینے سے قومی زندگی کا صفحے کا صفحہ ہی سادہ رہ گیا ۔ کبھی نازک وقت آپڑتا ہے تو ان اداروں کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر اس وقت انگریزی راج کی کمک کے لیے کوئی نہیں رہتا اور خود شہنشاہیت پسندی کی قومی بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے ۔ جنرل مکلاؤ ڈاینس اپنی کتاب میں جس سے ایک اقتباس اس کے پہلے پیش ہو چکا ہے بیان کرتا ہے کہ غدر کے تاریک زمانے میں ستلج کے اس کنارے پر بود باش رکھنے والے سکھوں اور ملتان کے مسلمانوں کی طرح سرحدی مسلمانوں نے بھی اپنے اپنے سرداروں کی خاص ہدایت و رہنمائی میں

انگریزوں کی نہایت قابل قدر امداد کی تھی اور ان لوگوں نے اپنی طرف سے طاقتور فوجیں بھی بھیجی تھیں۔ برخلاف اس کے پنجاب کے سکھوں کا کوئی سردار نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے دہلی کی فتح تک تو کوئی مدد نہیں کی۔ ہندوستان کے منتظمین مملکت اس احتیاج کو یعنے پردیسیوں کے نظم و نسق کو ہر دلعزیز بنانے اور لوگوں پر حکومت کا رفیق کار بننے کے لیے اچھا اثر ڈالنے کی ضرورت محض جنگ کے زمانے ہی میں نہیں بلکہ صلح و امن کے زمانے میں بھی محسوس کرتے ہیں۔

بہر حال جان لارنس لارڈ ڈلہوزی کی حکمت عملی پر کاربند رہا۔ اس نے "نکلسن کو لکھا مالگزاری مقداریں مقرر کیجیے جس سے قابض زمین کے لیے ایک واجبی اور معقول گنجائش رہ جائے تاکہ وہ کاشت میں اضافہ کر سکے اور اس طرح سرکاری محاصل ہنگام کی خرابی اور دست برد سے متاثر نہ ہونے پائے۔ درمیانی اشخاص سے ہر وقت کنارہ کشی کیجیے۔ یہ لوگ ہر جگہ ملک کے لیے وبال و آفت جان ہیں۔"

لیکن مالگزاری کبھی کم مقداریں نہیں لی گئی۔ اور جیسا ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ہوا یہاں بھی ہوا یعنے انگریزوں کا قبضہ ہونے کے ساتھ ہی مالگزاری میں اضافہ کر دیا گیا چنانچہ ۱۸۴۷ء و ۱۸۴۹ء کے درمیان پنجاب کی مالگزاری جو ۸۲۰۰۰۰ پونڈ تھی اس صوبے کو انگریزوں کے الحاق کرنے کے تین سال کے اندر اندر بڑھ کر وہ ۱۰۶۰۰۰۰ پونڈ ہو گئی۔ عام قیمتیں گھٹ جانے سے بھی کاشتکاروں کی مصیبت میں اضافہ ہو گیا تھا کیوں کہ ان کو اب یہ رقم نقدی کی شکل میں ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس کے متعلق ۱۸۵۱ء میں زراعت پیشہ لوگوں نے عام طور پر شکایتیں شروع کیں اور واویلا مچایا۔ " عام طور پر زراعت پیشہ طبقے کا مطالبہ یہی تھا کہ اجناس کی شکل میں مالگزاری ادا کرانے کے طریقے کو دوبارہ رائج کیا جائے۔ اور ہنگام میں فصل کی تقسیم کی جائے یا اس کا تخمینۂ قیمت کر لیا جائے۔ مجلس نے اس مطالبے کی مزاحمت کی لیکن اس بات کی ہدایت کر دی کہ جہاں مناسب معلوم ہو عند الضرورت مالگزاری وصول کرنا ملتوی کر دیا جائے۔"

پنجاب کے مختلف مقامات کے متعلق ذیل کے اعداد پیش کیے جاتے رہیں۔

جن کو نظم ونسق کی پہلی رپورٹ[1] سے اخذ کیا گیا ہے :

پنجاب کے نظم ونسق کی پہلی رپورٹ جس سے ہم نے پچھلے صفحات میں متعدد اقتباسات پیش کیے ہیں سر رچرڈ ٹمپل کے سے کامل فن اور مشاق شخص کی لکھی ہوئی ہے ٹمپل ہندوستان میں قلم کا دھنی مشہور تھا۔ جان لارنس اگرچہ نہایت جفاکش وکارگزار اور بہت بڑا منتظم شخص تھا لیکن اس کے طرز تحریر میں کچھ آب وتاب نہ تھی اور وہ خود اس خامی کو محسوس کرتا تھا ۱۸۵۱ء میں جب لارنس پہلی دفعہ شملے میں رچرڈ ٹمپل سے ملا اور اس کی لکھی ہوئی بندوبست کی رپورٹیں پڑھیں تو اس کو وہ بہت پسند آئیں۔ لارنس نے اپنے احباب سے تذکرہ کیا کہ " ہم اپنا معتمد بنانے کے لئے جس شخص کی تلاش میں تھے وہ شخص تو خود یہاں موجود ہے۔ وہ میرے منشاء کو خوب سمجھتا ہے اور اس کو بہترین شکل میں پیش کر سکتا ہے!" اس پر فوراً پنجاب کے نظم ونسق کی رپورٹ لکھنے پر ٹمپل مامور کیا گیا۔ اس رپورٹ کے کچھ حصے کا مسودہ ہنری لارنس اور جان لارنس نے لکھا تھا لیکن نو مامور معتمد نے اس رپورٹ کو از سر نو مرتب کیا۔ یہ رپورٹ ہندوستان کی اور رپورٹوں کے مقابل مایقرا اور دلچسپ ہونے کی وجہ سے ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ ۱۸۵۳ء میں جب ٹمپل انگلستان سے ہندوستان واپس آیا تو اس وقت جان لارنس پنجاب کا چیف کمشنر تھا۔ لارنس نے ٹمپل سے کہا کہ " مجھکو یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ آپ کو آپ کے موزوں خدمت مل گئی ہے۔ مجھ کو آپ سے رائے لینے میں خوشی ہوتی ہے اور میں آپ کی تحریری قابلیت سے بھی بہت خوش ہوں لیکن ہمیشہ یہ ملحوظ رہے کہ جو کچھ حکمتِ عملی یا رائے ضبط تحریر میں آئے گی وہ میری اپنی حکمت عملی اور رائے ہوگی نہ کہ آپ کی۔ آپ کا بھی زمانہ آئے گا لیکن یہ میرا زمانہ ہے۔ اور ہر بات کا وقت مقرر ہوتا ہے۔" (سوانح عمری لارڈ لارنس مولفہ بوزورتھ اسمتھ)

پرگنہ	ضلع	رقم مالگزاری ۱۸۵۰ء - ۱۸۵۱ء	رقم مالگزاری ۱۸۵۱ء - ۱۸۵۲ء
لاہور	لاہور	۳۸۰۶۰	۴۰۶۱۴
	امرت سر	۸۶۸۷۲	۱۰۲۴۷۳
	دیناگر	۸۹۹۲۷	۹۴۰۴۱
	وزیرآباد	۱۰۸۳۳۸	۱۱۴۰۱۸
	شیخ پورہ	۳۱۹۱۶	۳۸۳۲۲
جہیلم	گجرات	۵۹۳۸۲	۵۹۸۵۹
	جہیلم	۶۹۵۴۸	۷۲۰۹۱
	راولپنڈی	۸۲۴۸۱	۸۲۰۵۶
	شاہپور	۴۱۲۳۱	۳۴۳۸۱
لیئا	لیئا	۴۸۴۴۴	۵۴۲۵۷
	خون گڑہ	۴۹۵۳۴	۴۸۴۶۳
	ڈیرۂ غازی خاں	۲۵۵۷۴	۴۷۲۸۰
	ڈیرۂ اسمٰعیل خاں	۴۸۹۶۸	۵۰۶۵۶
ملتان	ملتان	۵۶۴۳۰	۶۰۳۵۹
	جھنگ	۲۷۸۷۸	۳۴۹۶۲
	پاک پٹن	۲۵۷۵۷	۳۸۳۱۲
	پشاور	۸۹۳۰۷	۷۱۹۲۹
	حرزہ	۱۸۸۵۴	۱۶۸۱۵
	میزان	۱۰۱۸۵۰۲	۱۰۶۰۹۸۹

انتظام مالگزاری میں جان لارنس کا اصل اصول یہ تھا کہ "اراضی پر مالگزاری کم مقدار میں لیجائے" اور اس نے بہت جلد یہ محسوس کرلیا کہ خام پیداوار کے ایک ثلث کا مطالبہ، اور وہ بھی زر کی شکل میں کسانوں کے حق میں ظلم تھا۔ اسکے چند ہی سال میں پنجاب کے حکام مجاز نے اس غلطی کی اصلاح کردی، چنانچہ پنجاب کے محصول اراضی میں تخفیف کردی گئی اور وہ پہلے خام پیداوار کا ایک ربع مقرر کیا گیا تھا بعد کو چھٹا حصہ کردیا گیا۔ اس تدبیر کی دانائی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ آگے چلکر وہاں کاشت میں اضافہ ہوا محاصل میں بیشی اور حقیقی جمع بھی توفیر ہوئی سنہ ۱۸۵۶ء سے لیکر سنہ ۱۸۵۷ء تک اور سنہ ۱۸۵۷ء سے لیکر سنہ ۱۸۵۸ء تک کے اعداد ذیل سے بمقابل ان اعداد کے جو اوپر درج ہیں محاصل کی بیشی اور جمع کی اطمینان بخش حالت ظاہر ہوتی ہے:

سنہ عیسوی	مطالبہ	جمع
۱۸۵۶-۱۸۵۷	۱۴۸۵۰۰۰ پونڈ	۱۴۵۲۰۰۰ پونڈ
۱۸۵۷-۱۸۵۸	۱۴۶۵۰۰۰ "	۱۴۵۲۰۰۰ "

پنجاب کے الحاق کے بعد ہی بندوبست اراضی باضابطہ طور پر شروع کردیا گیا تھا مگر وہ ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ سنہ ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہی برخاست کردیگئی۔ لاہور اور امرتسر کے اضلاع میں سنہ ۱۸۶۰ء اور سنہ ۱۸۷۲ء کے درمیان جو بندوبست اختتام کو پہنچا تھا اسکی رو سے پیداوار کا چھٹا حصہ حق سرکار معین ہوا تھا اور قواعد مابعد کی رو سے جو سنہ ۱۸۷۱ء کے قانون مالگزاری کے حسب منشاء منضبط کیے گئے تھے مطالبہ مالگزاری معمولی غیر دخیل کار آسامیوں کے حقیقی لگان کا (جو سالہائے اوسط میں ان کو ملتا تھا) نصف کردیا گیا تھا۔

یہانتک تو ہم نے یکے بعد دیگرے شمالی ہند، بمبئی، مدراس اور پنجاب کے حالات بیان کردئے ہیں۔ اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظم ونسق مالگزاری کے آخری نتائج پر ایک عام نظر ڈالنی مقصود ہو تو سنہ ۱۸۵۷ء میں "انڈیا ہوز" (دفتر وزیر ہند) سے جو کیفیت بابۂ یافت پیش ہوئی ہے اسکو پڑھیے کیونکہ اس سے بہتر مواد کہیں نہیں ملسکتا۔ اس کیفیت پر جان اسٹوارٹ مل کے دستخط ہیں جو اس وقت محکمہ وزیر ہند میں تنقیح مراسلات کی خدمت انجام دے رہا تھا اگرچہ یہ کیفیت اسکے عملے کی تیار کی ہوئی ہے لیکن اس میں عبارت کی فلسفیانہ طرز مواد کی صحت اور ترتیب اسی کے قلم کی معلوم ہوتی ہے۔ ذیل میں اسکے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:۔

ہندوستان کے نظام اراضی پر جان اسٹوارٹ مل کے خیالات

بنگالہ۔ "بنگالے کے صوبہ جات جنوبی میں سالانہ ایک دوامی مقررہ محصول ادا کرنے پر زمیندار اپنی اراضی پر قبضہ رکھنے کے مجاز ہیں اور ۱۸۴۵ء کے قانون اول کی رو سے اگر یہ محصول ادا نہ ہو تو ان کی جاگیریں نیلام کر دی جاسکتی ہیں۔ سرکار کے زیر قبضہ جو کچھ بھی زمین ہے وہ انھیں جاگیروں کی ہے۔ جن کو سرکار نے نیلام میں خرید لیا تھا۔ یہاں کے محصولِ اراضی کی شرح معلوم نہیں مگر یہ باور کیا جاتا ہے کہ یہ محصول اوسطاً لگان کا نصف ہوتا ہے"

شمالی ہند "اول ملک کے تمام آباد خطوں کو محال میں تقسیم کر دیا گیا ہے جن کی حد بندی بھی کر دی گئی ہے۔ ہر محال پر بہ حیثیت مجموعی بیس۱ یا تیس۳ سال کی میعاد کے لئے محصول اراضی لگا دیا جاتا ہے جس میں اراضی کی کل خالص پیداوار کے علاوہ ایک واجبی انداز ے سے منافع میں معقول بچت کی گنجایش چھوڑ دی جاتی ہے اور مالگزاری کی اس رقم کے بر وقت ادا ہونے تک تمام اراضی سرکار میں ایک صورت سے مکفول سمجھی جاتی ہے!

"دوم۔ منافع کی اس بچت کے مستحق کون ہیں کون نہیں اس کی کامل تحقیق کی جاتی ہے مستحقین کا یوں یقین کر لینے کے بعد ان کے اس حق کو قابلِ انتقال اور قابل توریث قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس طرح کے حقداروں کو مالکانِ اراضی سمجھا جاتا ہے اور سرکار نے محال پر جو کچھ سالانہ محصول لگا دیا ہے وہ بھی انھیں سے وصول کیا جاتا ہے۔

"سوم۔ محال کے مالکانِ اراضی مجموعاً اور منفرداً اپنی ذات اور املاک سے سرکار کی مقررہ مالگزاری ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ جب ایک سے زیادہ محال کے مالک ہوں تو کس قاعدے کے تحت ان میں تقسیم منافع اور تلافیٔ نقصان ہو اس کا

تعین کرلیا جاتا ہے ۔ اگر مالکان اراضی بے شمار ہوں تو ان میں سے چند سر برآوردہ اشخاص کے ساتھ قرار داد رقم کرلیا جاتا ہے اور یہ اشخاص اپنی جانب سے اور باقی لوگوں کے نمایندوں کی حیثیت سے محال کا کل انتظام اور مقررہ محصول ادا کرنے کی تمام ذمہ داری اپنے اوپر قبول کرلیتے ہیں ۔

"پہلے پہل اراضی کا دارا ہر محال کی خالص پیداوار کے ۲/۳ دو ثلث تک محدود تھا لیکن پہلے بندوبست کی تیس سالہ میعاد کے ختم پر اس شرح پر نظر ثانی کے بعد مطالبۂ سرکار اوسط خالص اثاثے کے نصف حصے تک محدود کر دینے کا تہیہ کرلیا گیا۔"

مدراس "مدراس میں مالگزاری کے جو نظام نافذ العمل ہیں" وہ زمینداری "موضع مشترکہ کرایہ پر دینا"۔ "رعیت واری" اور "یولنگو" کہلاتے ہیں۔"

"زمینداری حقیقت اراضی زیادہ تر شمالی سرکار میں پھیلی ہوئی ہے اگرچہ دوسرے اضلاع مثلاً مدیورا ۔ نلور ۔ شمالی ارکاٹ وغیرہ میں بھی زمینداروں کی بڑی بڑی جاگیریں موجود ہیں۔"

"موضع کرایہ پر دینے کے نظام میں موضع والوں کی حیثیت بعینہٖ زمینداروں کی ہے اور یہ لوگ سرکار سے موضع پر مشترکہ قبضہ حاصل کرتے ہیں۔ کُل موضع یا تو تمام جماعت کو یا اس کے کچھ حصے کو ایک مدت مقررہ کے لیے کرایہ پر دیدیا جاتا ہے اور یہ لوگ براہ راست سرکار کو مالگزاری ادا کرتے ہیں۔ بلا مداخلت غیرے اپنے معاملات کا آپ سرانجام کرتے ہیں اور کاشت کے لئے آپس ہی میں اراضی تقسیم کرلیتے ہیں۔"

"رعیت واری نظام میں ہر قابض زمین جس کا نام دیہی کھاتے میں درج ہوتا ہے ۔ زمین کا مالک تسلیم کرلیا جاتا ہے اور وہ سرکار کو براہ راست مالگزاری ادا کرتا ہے اور اس بات کا مجاز ہے کہ چاہے وہ اپنی ملکیت پر شکمیداری قائم کرے چاہے وہ اپنا حق ملکیت ۔ عطیہ ۔ فروخت اور کفالت کی شکل میں کسی اور پر منتقل کر دے جب تک وہ مالگزاری کی مقررہ رقم سرکار کو ادا کرتا رہے

اس وقت تک اراضی مقبوضہ سے اس کو بے دخل نہیں کیا جاسکتا اور ہر سال اس کو اس بات کا اختیار رہتا ہے کہ اپنی مقبوضہ اراضی کو وہ کم کردے یا اس میں اضافہ کرلے یا اس سے بالکل ہی دست بردار ہو جائے۔ خرابی ہنگام پر اگر پوری پیداوار یا اس کے کچھ حصے کا نقصان ہو جائے تو اس پر مالگزاری معاف کردی جاتی ہے۔ تشخیص مالگزاری نقدی میں کی جاتی ہے اور سال بسال رقم میں کمی و بیشی نہیں کیجاتی الا ان حالات کے جہاں یا فی سرکاری ذرائع آبپاشی سے خشکی کی اراضی کو تری کی اراضی بنائے یا زمین کو دو فصلہ کرنے کے لئے لیا جاتا ہو جس پر پن کی مزید رقم سرکار کو ادا کرنی ہوتی ہے۔ رعیت بمصارف خود کوئی اصلاح کرے تو اس کے لحاظ سے رقم مالگزاری میں اضافہ نہیں کیا جاتا۔ اس نظام کے تحت ایک سیدھے سادھے مکمل استحقاق کی بنا پر رعیت ہی مالک اراضی متصور ہوتی ہے اور دوامی پٹے کی ذمہ داریوں کے بغیر دوامی پٹے کے تمام فائدے اس کو حاصل ہوتے ہیں یعنے ہر شخص جب چاہے وہ اپنی اراضی سے دست بردار ہو سکتا ہے۔ مگر جب تک اپنے ذمے کی رقم وہ ادا کرتا رہے زمین سے بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔ موسمی مشکلات و حوادث در پیش ہوں تو تقاوی لے سکتا ہے مگر اپنے ہمسایوں کی واجب الادا رقوم کا وہ ذمہ دار نہیں

...... رعیت واری نظام میں سالانہ تشخیص مالگزاری کے متعلق اکثر غلط فہمی ہوتی ہے اور اس باب میں یہ توضیح کردینی مناسب ہے کہ سالانہ تشخیص مالگزاری اس لئے ضروری ہے کہ سال بہ سال رقبۂ کاشت بڑھانے اور گھٹانے کا حق رعیت کو حاصل ہے۔ اور اس تشخیص رقم کا یہ مقصد نہیں کہ از سر نو محصول اراضی لگایا جائے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس کے زیر قبضہ زمین پر سابقہ مجموعی رقم مالگزاری کا کتنا حصہ اب واجب الادا نکلتا ہے وہ مقرر کردیا جائے۔ ایسی حالت میں جبکہ رعیت کی مقبوضہ اراضی میں کمی و بیشی نہیں ہوتی پٹے کی تجدید نہیں کی جاتی اور نہ سالانہ بندوبست سے ان کو کچھ سروکار ہوتا ہے اور نہ بندوبست کے وقت ان کے حاضر رہنے کی ضرورت ہے۔

"اراضی کرایہ پر دینے کا نظام جو لینگو کہلاتا ہے وہ تنجور اور تناولی میں

پایا جاتا ہے مگر وہاں بھی یہ عام نہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ مطالبۂ سرکار غلّے کے رائج الوقت نرخ پر منحصر ہوتا ہے۔ اس نظام کی ترویج کے وقت ہر موضع پر لگان اجناس کی شکل میں معیّن کر دیا گیا تھا اور محصول کی شرح کا ایک معیار بھی مقرر کر دیا گیا تھا جس کے موافق غلّے کے مطالبے کو زر کی شکل میں بدل دیا جاتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی قرار داد ہوئی تھی کہ اگر کسی سال بازار کا بھاؤ مبادلۂ زر کے مقررہ معیار نرخ سے ۱۰ فیصدی زیادہ ہو جائے یا ۱۰ فیصدی گر جائے تو بجائے رعیت کے سرکار ہی یہ نفع یا نقصان اٹھائے گی۔ اس نظام میں خوبی یہ تھی کہ عام قیمتوں کی بیشی کے فائدے میں سرکار بھی رعیت کی شریک ہو جاتی ہے اور عام قیمتوں کی کمی کے نقصان سے رعیت بالکل محفوظ رہتی ہے مگر اس نظام میں یہ نقص تھا کہ سال بھر بازار کا روزمرہ بھاؤ صحیح صحیح معلوم ہونا ضروری تھا جو بہت ہی مشکل ہے"

بمبئی "صوبہ بمبئی کا انتظامِ مالگزاری عام اصطلاح میں رعیت واری کہا جا سکتا ہے اور اس منشا میں کہ عام طور پر سرکاری اراضی[1] پر جو اشخاص قابض ہوتے ہیں وہ کسی درمیانی شخص کے توسط کے بغیر سرکاری عہدہ داروں ہی سے براہ راست اپنی مالگزاری یا لگان کا تعین کر لیتے ہیں۔ مگر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اس صوبے میں ایسی بھی مثالیں اکثر ملیں گی جہاں تمام موضع کی مالگزاری کا تعین سربرآوردہ قابضان اراضی ہی سے جن کے مختلف نام ہوتے تھے انفرادی یا مشترکہ طور پر کر لیا جاتا تھا۔"

"اس صوبے کے اس سرے سے اس سرے تک محصول اراضی پر اب نظرثانی کی جا رہی ہے جس سے ہر کھیت پر اس کے درجے کے موافق واجب الادا رقم مقرر کر دی جاتی ہے اور اس رقم کی مقدار میں سی[30] سالہ میعاد تک کوئی کمی و بیشی نہیں کی جا سکتی۔"

---

[1] ۔ ایسی اراضی کو "سرکاری اراضی" کہنا کچھ حسب حال نہیں ہے۔ بلاشک و شبہہ مدراس کی طرح بمبئی میں بھی قابضان اراضی ہی اراضی کے مالک تھے اور سرکار صرف محصول اراضی کی جو کھیتوں کی خالص پیداوار کا ایک حصہ ہوتا تھا مستحق تھی۔

پنجاب :- "پنجاب میں اراضی کا مالک مطلق اور کاشت کرنے والا عموماً ایک ہی شخص ہوتا ہے گو بعض دفعہ اپنے چند کھیتوں کو وہ اسامیوں ہی کو کیوں نہ دیتا ہو اس پر لگان کا مطلق بار نہیں ہوتا البتہ کاشت کے مصارف اور سرکاری مطالبے کی گنجائش اس کو پیدا کرنی پڑتی ہے۔ باقی پیداوار چاہے وہ اپنے خاندان کی ضرورتوں پر صرف کرے چاہے وہ جمع کرتا رہے۔ اس طبقے کے لوگ اپنی شخصیت کو ممیز رکھنے کے باوجود دیہی جماعتوں میں مل جاتے ہیں۔ موضع کی آبادی کے یہ معنی نہیں کہ وہاں رعیت فلاں تعداد میں بستی تو ہے مگر ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ وہاں ایک ہی اجداد کی نسل رہتی ہے گویا یہ ایک بڑی برادری ہے جس کا چودھری ایک ہی شخص ہوتا ہے اور جس کو مشترکہ کاروبار اور باہمی امداد کی ایک مدت سے عادت پڑی ہوی ہے"

"انگریزی سرکار نے پہلے ہی سے یہ تصفیہ کر دیا تھا کہ زر کی شکل میں یہ محصول وصول کیا جائے اور ایک مدت تک اس کی مقدار معین رہے۔ "مالک اراضی کسان" سرکار سے ایک مدت معینہ کے لئے مالگزاری چکا لیتے ہیں اور اس طرح کے تشخیص لگان چکانے کو اصطلاح میں بندوبست کہتے ہیں۔ مالکان اراضی فرداً فرداً سرکار سے کوئی قرارداد نہیں کرتے بلکہ موضع واری قرارداد کرتے ہیں۔ پھر یہ برادری اپنے چودھری یا نمایندے کے توسط سے فلاں رقم فلاں مدت تک سرکار کو دیتے رہنے کا ذمہ لیتی ہے۔ اس کے بعد لوگ اس رقم کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور ہر شخص کا حصہ مقرر کر دیتے ہیں۔ اگرچہ بہ ظاہر ہر شخص اپنے ہی لئے کاشت کرتا اور صرف اپنی طرف سے رقم دیتا ہے مگر آخر العمل وہ اپنے حصہ داروں کا درحقیقت اسی طرح ذمہ دار ہے جس طرح اس کے حصہ دار اس کے ذمہ دار ہیں اور دونوں کی ذمہ داری مشترکہ ہے۔ اس لیے پنجاب کا نظام نہ تو رعیت واری ہے اور نہ زمینداری بلکہ موضع واری نظام کہلاتا ہے۔ کو ہی اقطاع میں اور بعض دفعہ اور جگہ بھی زمینداری نظام اور ملتان کی نواح میں رعیت واری نظام سے ملتا جلتا ایک اور نظام پایا جاتا ہے لیکن موضع واری نظام ہی عام طور پر اور بالخصوص اہم ترین مقامات میں پھیلا ہوا ہے۔"

خلاصہ ۔ اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ چند لفظوں میں کیا جاتا ہے۔ بنگالے میں اراضی ایسے مالکوں کے زیر قبضہ تھی جو سرکار کو ایک معینہ اور غیر تغیر پذیر محصول اراضی ادا کرتے تھے۔ شمالی ہند میں زمین عام طور پر ایسے مالکوں کے قبضے میں تھی جو محصول اراضی ادا تو کرتے تھے مگر ہر جدید بندوبست کے وقت اس رقم پر نظر ثانی کیجاتی تھی۔ مدراس اور بمبئی میں مالکانِ اراضی کسان ہی تھے جو سرکار کو مالگزاری ادا کرتے تھے اور یہاں ہر جدید بندوبست پر محصول کی رقم پر بھی نظر ثانی ہوتی تھی۔ پنجاب میں بھی مالکانِ اراضی کسان ہی تھے مگر یہ لوگ دیہی جماعتوں کے ارکان ہوتے تھے اور ہر موضع سے اجتماعی طور پر لگان ادا ہوتا تھا جس پر ہر تجدید بندوبست کے ساتھ ہی نظر ثانی کی جاتی تھی۔

ان مختلف انتظامات کے تحت کم سے کم اصول کی حد تک تو محصول اراضی کی شرح بتدریج یکساں بن گئی تھی چنانچہ بنگالے میں محصول اراضی انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں لگان کا نصف تھا۔ شمالی ہند میں ۱۸۵۵ء کے قواعد سہارنپور کی رو سے وہ لگان کا نصف ہی معین کیا گیا تھا مدراس اور بمبئی میں سر چارلس ووڈ نے ۱۸۶۴ء میں محصول اراضی معاشی لگان کا آدھا مقرر کر دیا تھا اور پنجاب میں سرکاری مطالبے میں یوں تخفیف کر دی گئی تھی کہ اسامیئی غیر دخیل کا معمولی طور پر جو لگان ادا کرتے تھے اس کا نصف مالگزاری مقرر کر دی گئی تھی۔

یہ ہے ہندوستان کے محصول اراضی کا اصل اصول یعنے جہاں محصول اراضی دواماً معین نہیں ہے وہاں حقیقی یا معاشی لگان کے نصف حصے کا بطور مالگزاری مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

لیکن کبھی اس اصول پر عمل نہیں کیا گیا جیسا آئندہ باب میں بتایا جائے گا۔ شمالی ہند اور صوبجات متوسط میں جہاں مالگزاری عموماً مالکان اراضی سے وصول کیجاتی ہے حقیقی لگان کے نصف حصے سے بہت زیادہ سرکار وصول کر لیتی ہے۔ بمبئی اور مدراس میں جہاں مالگزاری عموماً کاشتکاروں ہی سے

براہ راست وصول کی جاتی ہے سرکار کل معاشی لگان خود لے لیتی ہے اور کاشتکاروں کے لئے ان کی محنت کی اجرت سے زیادہ نہیں چھوڑتی۔

ساتواں باب

خام پیداوار اور مصنوعات

جب سنہ ۱۸۳۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے منشور کی تجدید ہوئی تو یہ شرط لگا دی گئی کہ آج کی تاریخ سے کمپنی "تمام تجارتی کاروبار موقوف کردے اور ایسے کاروبار سے آئندہ کے لئے احتراز کرے" نیز زمانۂ مستقبل میں اس کی حیثیت ہندوستان کے محض منتظم مملکت اور حکمراں کی سی رہے۔ اس شرط کو عائد ہوئے بہت زمانہ نہ گزرا تھا کہ اس کے مفید نتائج ظاہر ہونے لگے۔ کمپنی خود جب حریف تجارت نہ رہی تو ہندوستان کے مصنوعات اور پیشوں میں بڑی دلچسپی لینے لگی چنانچہ ۱۱ فروری سنہ ۱۸۴۰ء میں پارلیمنٹ کی خدمت میں عرضی پیش کی کہ وہ تمام حاسدانہ اور کینہ آمیز محصولات اب مسدود کر دیئے جائیں جن سے ہندوستان کے اہل حرفہ کی دل شکنی اور صنعت و حرفت کی کساد بازاری ہو رہی تھی۔

اس عرضی پر رپورٹ پیش کرنے کے لئے دار العوام نے اپنی ایک مجلس تحقیقہ مقرر کی۔ لارڈ سیمور اس مجلس کا صدر نشین تھا اور ایک رکن اس کا گلیڈسٹن بھی تھا جو اس وقت ۳۱ برس کا جوان اور ایسا خاص قدامت پسند واقع ہوا تھا کہ اپنے سیاسی عقیدے کے خلاف وہ کسی کی بھی نہیں سنتا تھا۔ ایک اور شخص براکلہرسٹ نامی جو میکلسفیلڈ کا رکن پارلیمنٹ تھا برطانوی صناعوں کی جانب سے اس مجلس کا رکن مقرر ہوا تھا کیونکہ اس زمانے میں میکلسفیلڈ ریشم کی صنعت کا بہت بڑا مرکز

تھا۔ اثنائے تحقیقات میں ہندوستان کی پیداوار اور مصنوعات پر بہت کچھ قابل قدر شہادت قلمبند کی گئی اور چھ سو صفحے کی کتاب کی شکل میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ مگر ہماری اس کتاب کی مختصر گنجائش کی بناء پر اس شہادت کے وہی حصے یہاں بیان کیے جا سکتے ہیں جو اس کتاب کے موضوع سے خاص طور پر متعلق ہیں۔

جے۔ سی۔ ملول

فوجی مصارف اور مطالبات وطن۔ ملول نے کہا تھا کہ ہندوستان کی شاہی فوج کے مصارف جن کو کمپنی ادا کرتی تھی ۱۴۰۰۰۰۰ پونڈ تھے اور کمپنی نے یہ بھی قبول کر لیا تھا کہ ہندوستان میں ۲۰۰۰۰ کی فوج ہمیشہ قائم رکھنے کے جو مزید اخراجات ہوں گے وہ بھی ادا کر دئے جائینگے۔ ہندوستان کے محاصل سے سالانہ جو اوسط رقم انگلستان میں خرچ ہوتی تھی وہ ۳۲۰۰۰۰۰ پونڈ تھی اور اس میں کمپنی کے حصہ داروں کا مقسوم سرکاری قرضے کا سود۔ ملازمین سرکار کے ایام رخصت کی تنخواہ۔ وظائف پیرانہ سالی وغیرہ۔ مجلس نظم اور مجلس نظاء کے مصارف اور ان دونوں کے عملے کا خرچ بھی شامل تھا۔

افیون۔ افیون انگریزی عملداری کے علاوہ بنارس۔ پٹنہ اور مالوے کی دیسی ریاستوں میں بھی بنتی تھی۔ بنارس اور پٹنے کی افیون کا اجارہ کمپنی کو حاصل تھا اور حکومت بنگالہ کو اس اجارے سے بڑی آمدنی تھی کیونکہ ۲۰۰ فی صدی سے زیادہ منافع پر یہ افیون بکتی تھی۔ مالوے کی افیون بیرون ملک برآمد کرنے کے لئے جب انگریزی عملداری میں بھیجی جاتی تھی تو اس کے ہر صندوق پر ۱۲½ پونڈ محصول راہداری ادا کیا جاتا تھا اور اس محصول سے حکومت بمبئی کو معتدبہ آمدنی ہوتی تھی۔ چین میں ان دونوں قسم کی افیون کو ملا کر کینٹن کی منڈی میں فروخت کیا جاتا تھا۔

نمک۔ کمپنی کی عملداری میں جو نمک بنتا تھا اس سے اور دیسی ریاستوں سے جو نمک بنکر انگریزی عملداری میں آتا تھا اس پر سنگین محصول ہونے سے سرکار کو

بہت بڑی آمدنی ہوتی تھی۔ کمپنی کو افیون کی طرح نمک کا اجارہ بھی حاصل تھا۔

شکر۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے ہندوستان کی شکر پر جزائر غرب الہند کی شکر کے برابر محصول یعنے ہر ہنڈرڈ ویٹ (چھپن سیر) پر ۲۴ شلنگ محصول ادا کرنے پر اُس کو انگلستان لانے کی اجازت تھی قانونی اصول یہ تھا کہ اگر اُس مقام میں جہاں سے یہ شکر آتی تھی اس کی درآمد ممنوع قرار دی گئی تھی تو اُس صورت میں یہ شکر انگلستان لائی جاسکتی تھی گورنر جنرل ہند نے بنگالہ میں اس کی درآمد ممنوع قرار دی تھی اس لئے بنگالے کی شکر فی ہنڈرڈ ویٹ (چھپن سیر) ۲۴ شلنگ محصول ادا کرنے پر انگلستان لائی جاسکتی تھی اس کی مقدار سنہ ۱۸۳۵ء میں جو ۱،۱۰،۰۰۰ ہنڈرڈ ویٹ تھی وہ بڑھ کر سنہ ۱۸۳۹ء میں ۵،۱۹،۰۰۰ ہنڈرڈ ویٹ ہو گئی تھی۔ گورنر جنرل ہند نے سنہ ۱۸۳۹ء میں ایک قانون منظور کیا تھا جس کی رو سے مدراس میں شکر کی درآمد ممنوع قرار دی گئی تھی۔ اس کے بعد مدراس کو بھی بنگالہ کی طرح مراعات ملنے والے تھے مگر کچھ دنوں اور بمبئی کو ان مراعات کے حاصل ہونے کی توقع نہ تھی۔

رم شراب۔ انگلستان میں ہندوستانی رم شراب کی درآمد پر ۱۵ شلنگ فی گیلن محصول تھا درانحالیکہ جزائر غرب الہند کی رم پر جو اس سے زیادہ تیز تھی صرف ۹ شلنگ فی گیلن محصول تھا۔

تمباکو۔ انگلستان میں ہندوستانی تمباکو کی درآمد پر فی پونڈ وزنی ۳ شلنگ محصول تھا درانحالیکہ جزائر غرب الہند کے تمباکو پر فی پونڈ (وزنی) ۲ شلنگ ۹ پنس محصول تھا۔ ہندوستان کے لئے یہ تفاوت محصول موجب سختی تھا اس لیے یہ باور کیا جاتا تھا کہ اگر یہ محصول دونوں جگہ کے تمباکو پر مساوی المقدار کر دیا جائے تو اس سے ہندوستانی تمباکو کے استعمال میں بہت کچھ افزونی ہو جائے گی۔

قہوہ۔ سنہ ۱۸۳۵ء میں ہندوستانی قہوے پر وہی محصول یعنے فی پونڈ (وزنی) ہر ۶ پونڈ لگا دیا گیا جو جزائر غرب الہند کے قہوے پر تھا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ انگلستان میں ہندوستانی قہوے کے صرف میں بہت بیشی ہو گئی۔

سوتی ریشمی۔ اور اونی پارچے برطانیہ کے ساختہ سوتی اور ریشمی مال پر جو برطانوی جہازوں پر لد کر ہندوستان آتا تھا ۲½ فی صدی اور اونی پارچوں پر صرف ۲ فی صدی محصول تھا حالانکہ ہندوستان کے سوتی مال پر جو انگلستان میں درآمد ہوتا تھا ۱۰ فی صدی اور ریشمی پارچوں پر ۲۰ فی صدی اور اونی مال پر ۳۰ فی صدی محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔

جتنی جتنی ہندوستان کے سوتی کپڑوں کی درآمد انگلستان میں کم ہوتی گئی حتیٰ کہ وہ رہی ہی نہیں اتنا اتنا خام روئی کی درآمد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس پنج سالہ میعاد میں جو ۱۸۱۳ء میں ختم ہوئی تھی انگلستان میں ہندوستانی خام روئی کی سالانہ درآمد اوسطاً ۹۳۶۸۰۰ پونڈ (وزنی) تھی مگر اس پنج سالہ مدت میں جو ۱۸۳۳ء میں ختم ہوئی تھی سالانہ اوسط درآمد ۴۳۲۹۶۶۰ پونڈ (وزنی) ہوگئی تھی۔

ملول سے جب یہ سوال کیا گیا کہ "کیا دیسی مصنوعات کی جگہ برطانوی مصنوعات نے لے لی ہے؟" تو اس نے جواب دیا تھا کہ "ہاں! بہت زیادہ"۔

"کتنی مدت سے؟"

"میرے خیال میں زیادہ تر ۱۸۱۴ء سے"

"کیا ہندوستانی مصنوعات کے بجائے برطانوی مصنوعات نے ہندوستان میں ایسا گھر کر لیا ہے کہ اب ہندوستان ان چیزوں کے لئے برطانوی صنعت ہی کا محتاج ہے؟"

"میرا تو خیال یہی ہے"

"دیسی صناعوں کی روزی چلی جانے سے کیا اس نقصان عظیم کی تلافی خام پیداوار کی بیشی سے جو مایحتاج زندگی میں سب سے اول ہے کچھ ہوئی ہے؟"

"جب سے ہندوستانی پارچوں کی برآمد موقوف ہوگئی ہے اس وقت سے ہندوستان سے خام روئی کی برآمد میں بیشی ہوتی رہی ہے لیکن میں یہ نہیں کہہ

کہہ سکتا کہ یہ کس قدر ہوی"

"کیا ہندوستانیوں کو مثلاً جو لاہوں کو ان کا روزگار چھلے جانے کے بعد دوسرے مشاغل سے روزی کمانے کی وہی سہولت حاصل ہے جو اُس ملک کے باشندوں کو ہے یا خاص خاص پیشے خاص خاص قوموں ہی سے مخصوص ہیں ؟

"میری دانست میں تو خاص خاص پیشے خاص خاص قوموں ہی سے مخصوص ہیں اس میں تو کچھ شک نہیں کہ برطانوی صنعت گروں کی مداخلت ہی سب سے پہلے ہندوستان کے صناعوں پر مصیبت لانے کا باعث ہوی"

چائے - ۱۸۲۷ء ہی میں مجلس نظماء کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ چائے کا پودا صرف ہندوستان میں ہوتا ہے لیکن اس وقت اس کی کاشت کو ترقی دینے کی کوشش ہی نہیں کی گئی ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنک نے مجلس کی اطلاع میں یہ بات لائی تھی کہ چائے کا پودا آسام میں بھی ہوتا ہے اور ہندوستان کے دیگر مقامات میں بھی اس کا نشو و نما ممکن ہے اس پر مجلس نے تجربتاً چائے کی کاشت کرنے کے لیے ایک عملے کی منظوری دی تھی حال میں آسام کی چائے کے بیجانوے صندوق جن کا مجموعی وزن تقریباً ۲۰۰۰ سیر تھا لندن پہنچے تھے اور یہ چائے بہت اچھی ثابت ہوئی تھی - اس کے بعد کئی لوگوں نے ملکر اپنی ایک کمپنی قائم کی تھی - اور مجلس نظماء سے چائے کی کاشت کی اجازت حاصل کرنے کے لئے درخواست دی تھی جس کو مجلس نظماء نے کارروائی کے لئے حکومت ہند کے پاس بھیجدیا تھا - اس کے بعد ۱۸۴۰ء سے آسام میں خانگی سرمائے سے چائے کی کاشت شروع کردی گئی -

اینڈریو سم

اس شخص کو کمپنی نے ہندوستان میں تقریباً ۶۰۰۰ ایکر اراضی عطا کی تھی - اس لئے اس نے زیادہ تر گنّے کی کاشت اور شکر سازی کے متعلق شہادت دی ہے - کاشتکار اپنے کھیتوں کے گنّوں کا رس نکال کر ابالتے اور اس سے گڑ بناکر کارخانوں کو بیچ دیتے تھے - وہاں مشینوں سے اس کی اس طرح شکر

بنائی جاتی تھی کہ گڑ کو ابال کر اس کا شیرہ بنا لیا جاتا تھا جس کے بعد اس کا پانی اتنا خشک کر دیا جاتا تھا کہ صرف شکر رہ جاتی تھی۔

برطانوی مصنوعات مثلاً ملبوسات۔ اوزار و آلات۔ کانچ کا سامان اور پیتلی ظروف وغیرہ کے رواج سے ہندوستانی اہلِ حرفہ کی روزی چلی گئی تھی اس کے متعلق اس گواہ نے بہت کچھ بیان کیا تھا۔ ہندوستان کے لوگ جب اپنے پیشوں سے محروم ہو گئے تو وہ "زیادہ تر زراعت" کے کاموں میں روزی کمانے لگے۔

سی۔ ای۔ ٹریولین

ایک اور اہم گواہ سر چارلس ٹریولین تھا جس نے لارڈ ولیم بنٹنک کے تحت ہندوستان میں ممتاز خدمات انجام دیے تھے اور اس کے بعد انگلستان میں خزانۂ عامرہ کا مددگار معتمد بن گیا تھا۔[۱]

جس زمانے میں ٹریولین ہندوستان میں تھا اس نے جس طرح ان تمام محصولات راہداری کے مسدود کرنے میں مدد دی تھی جو لوگوں کے لئے موجب زحمت اور اندرونی تجارت کے سنگ راہ تھے اسی طرح مجلسِ منتخبہ کے سامنے اپنی شہادت میں انگلستان میں مال کی درآمد پر ان غیر مساوی اور امتناعی محصولات کے اٹھا دینے کی پُر زور تائید کی جن کی بناء پر ہندوستان کے مصنوعاتِ انگلستان نہیں لائے جاتے تھے۔

برٹش انڈیا کی آبادی۔ عام طور پر بنگالے کی آبادی کا ۲ کروڑ کا تخمینہ کیا جاتا تھا۔ انگریزوں کے عہدِ حکومت میں شمالی ہند کی آبادی کا بھی ۲ کروڑ اندازہ

---

[۱] اس کے بعد ۱۸۵۹ء عیسوی میں وہ مدراس کے گورنر کی حیثیت سے ہندوستان آیا لیکن جدید محصولات پر اعتراض کرنے کی بنا پر ۱۸۶۰ء میں اس کو واپس طلب کر لیا گیا۔ ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۵ء عیسوی تک وہ لارڈ ایلگن اور لارڈ لارنس کے تحت ہندوستان کا وزیر مال رہا۔ اس کی شادی مکالے کی بہن سے ہوئی تھی اور اسی کے لڑکے نے لارڈ مکالے کی سوانح عمری لکھی ہے۔

تھا۔ مدراس کی آبادی کا تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ اور بمبئی کی آبادی کا تیس لاکھ تھا۔ اس حساب سے برطانوی ہند کی جملہ آبادی سات کروڑ ستّر لاکھ ہوتی تھی۔ محنت کی معمولی روزانہ اجرت دو آنے یا تین پنس تھی۔ بنگالے میں مالکان اراضی کاشت کے لئے اپنی زمینیں کسانوں کو دیتے تھے جو مالکان اراضی کے اسامی کہے جاتے تھے۔ "ہندوستان کی زراعت کا اصل اصول یہ ہے کہ جب تک قابض زمین اپنے مقامی رواج کے موافق لگان ادا کرتا رہے اس وقت تک اس کو قبضے سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن ہمیشہ اس قاعدے کی خلاف ورزی ہوتی رہی ہے۔" ہندوستان میں یورپی اشخاص کے قبضے میں اراضی نہ دینے کے متعلق جو امتناعی احکام تھے وہ سب منسوخ کر دیے گئے اور توقع کی جاتی تھی کہ یورپی اشخاص اراضی خریدنے کے بعد ہندوستان میں بود و باش اختیار کرنے لگیں گے" لیکن اس میں ناامیدی ہوئی۔ ہندوستان کی آب و ہوا کچھ ان کے موافق نہیں ہے اور وہیں مدت العمر گزارنا ان کا مطمح نظر بھی نہیں۔"

شکر اور رم شراب — اگر رم شراب پر محصول مساوی نہ کر دیا جائے تو پھر صرف شکر پر محصول کا مساوی کر دینا بے سود تھا۔ ایک ہی چیز کی حد تک مساوات ملحوظ رکھنا بڑی مضحکہ خیز بات تھی کیونکہ مساوات قائم کرنے کی غرض سے ہو تو یہ چاہئے کہ شکر سے جتنی چیزیں بنتی ہیں ان سب پر محصول مساوی کر دیا جائے۔"

رم شراب پر غیر مساوی محصول ہونے سے نہ صرف شکر اور رم بنانے والوں کا نقصان ہوتا تھا بلکہ ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ برا خیال پیدا ہوتا تھا کہ ان کے اغراض کو دوسرے ممالک کے اغراض پر جو ہندوستان سے زیادہ مورد الطاف ہیں قربان کر دیا جاتا ہے۔

گلیڈسٹن۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ دیسیوں میں بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے تو اس سے کیا یہ مطلب نکالنا درست ہے کہ یہ بے اطمینانی کاشتکاروں کے طبقے یا عام آبادی میں پھیلی ہوئی نہیں ہے بلکہ صرف ان لوگوں میں جن کو تاجروں کے طبقے سے تعلق ہے۔

مسٹر ٹریویلین۔ میرا استناد بالخصوص انہیں لوگوں سے ہے جن کا تاجروں کے طبقے سے تعلق ہے اور تعلیم یافتہ بنگالیوں سے بھی جنہیں ہندوستان اور انگلستان کے باہمی تعلقات کا کچھ نہ کچھ حال معلوم ہے اور انہیں لوگوں کو دراصل اس کی شکایت بھی ہے یوں تو دیسیوں کو اور باتوں کی شکایت بھی ہے مگر یہ مزید علیہ ہے۔ اس قسم کی شکایتیں باخبر لوگوں ہی سے عوام الناس میں پھیلتی ہیں مگر باخبر لوگوں کی طرح عوام الناس ان کے اصل وجوہ سے واقف نہیں ہوتے۔

دوسرے امور کے متعلق اس گواہ نے بیان کیا کہ بنگالے کی شکر جس کے لیے گنگا کی وادی میں گنّے بوئے جاتے تھے اندرون ملک ہی زیادہ تر صرف ہوتی تھی مثلاً بنگالے کی ۳ کروڑ آبادی شمالی ہند کی ۳ کروڑ اور اس کے سوا دوسرے مقامات کی ۴ کروڑ آبادی سب یہی شکر استعمال کرتی تھی۔ اس گواہ کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وسط ایشیائی منڈیوں میں اس زمانے تک بنگالہ کی شکر ہی کی کلیتاً مانگ تھی جب تک کہ چقندر سے بنائی ہوئی روسی شکر وہاں نہیں آئی تھی۔

سوتی مال تجارت۔ "ہندوستان کے سوتی مصنوعات کی جگہ انگریزی مصنوعات نے غصب کر لی تھی۔ ریشم کی طرح نرم خاص قسم کی روئی جو پہلے بنگالے میں ہوتی تھی اور جس سے ڈھاکے کی مشہور مہین ململیں بنتی تھیں وہ اب کہیں نظر نہیں آتی۔ شہر ڈھاکہ کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے گھٹ کر اب تیس ۳۰ یا چالیس ہزار رہ گئی ہے اور اس پر بھی ایک طرف ملیریا بخار کے زہریلے اثرات سے اور دوسری طرف شہر میں جنگل پھیل جانے سے روز بروز ویرانی بڑھ رہی ہے۔ ہندوستان میں صرف موٹے موٹے سوتی کپڑے ہی جو تجارتی مقابلے کی تاب لا سکتے ہیں رائج ہیں ورنہ انگریزی سوتی کپڑے تو ملک میں اس سرے سے اس سرے تک انتہائی مفلس و نادار لوگوں کے سوا سبھی کے زیر تصرف ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ڈھاکہ جو کسی زمانے میں ہندوستان کا مینچسٹر اور نہایت خوش حال شہر تھا اب نہایت ہی محدود و مختصر رہ گیا ہے کیونکہ درحقیقت اس شہر کو بہت کچھ مصیبتیں اٹھانی پڑی تھیں"

چائے۔ آسام میں پہلے پہل سرکار نے تجربتاً چائے کی کاشت کی تھی مگر اس کے بعد نئی آسام کمپنی نے اس کاشت کو شروع کر دیا۔ مقامی مزدوروں کا قحط تھا اس

لئے کمپنی دور کے مقامات سے پہاڑی مزدوروں کو بات ٹھہرا کر چائے کے باغات میں کام کرنے کے لئے آسام لاتی تھی۔ اس گواہ کی دانست میں اس قسم کے اقرار نامے سہ سالہ میعاد کے لئے کیے جاتے تھے لیکن اس کو اس بارے میں صحیح علم نہ تھا۔

نیل۔ پہاڑی مزدور ہر سال بنگالے کے مخلبندان نیل کے پاس نیل سازی کا کام کرنے جاتے تھے جیسے "آئرلینڈ کے باشندے فصل کا کام کرنے کے لئے اس ملک (برطانیہ) میں آتے ہیں"۔ یہ مزدور اہل وعیال اپنے ساتھ نہیں لاتے تھے بلکہ نیل کے ہنگام کے ختم پر گھروں کو واپس ہو جاتے تھے۔

بھاپ سے چلنے والے دریائی جہاز۔ بھاپ سے چلنے والے جہاز کشتیاں وغیرہ سب ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کے زیر انتظام وقبضہ تھے بہت چھوٹے چھوٹے بھاپ سے چلنے والے جہاز جو ۲ فٹ سے زیادہ گہرا پانی نہیں کھینچتے تھے کام میں لائے جاتے تھے۔ دریائے ہوگلی میں جہازوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاپ کے ذریعہ سے کھینچتے لیجانے کے لئے ایک شراکت (اسٹیم ٹاگ کمپنی) بھی تھی جو خوب مقسوم پیدا کرتی تھی۔

سڑکیں۔ شاہراہوں کے سوا دوسری سڑکوں کی شاذ ہی مرمت ہوتی تھی۔ لیکن بارش کے موسم کے سوا بیل کی گاڑیوں کے لئے جو خاص مضبوط بنائی جاتی تھیں۔ یہ سڑکیں شاذ ہی ناقابل گزر ہوتی تھیں۔

خام پیداوار۔ مسٹر ٹریولین نے یہ سفارش کی تھی کہ "انگلستان کی منڈیوں میں ہندوستان کی خام پیداوار پر کسی قسم کا غیر مساوی محصول نہیں ہونا چاہئے ہم نے اُن (ہندوستانیوں کے) مصنوعات کو بالکل میٹ دیا ہے۔ اور اب ان کے پاس ان کے ملک کی خام پیداوار کے سوا رہا ہی کیا ہے جس پر ان کے گزر اوقات کا انحصار ہے اس لئے میرے خیال میں یہ انتہائی ناانصافی ہوگی اگر ہم اپنے ملک کی منڈیوں میں ان کی خام پیداوار کو مساوی مراعات دینے سے دریغ کریں"۔

ہنری گوجر

ہنری گوجر ایک تاجر تھا جس نے کئی سال اپنی زندگی کے ہندوستان میں کاٹے تھے اور کلکتے کے نواح میں اس کے کئی کارخانے بھی تھے جس میں سوتی دھاگا بٹتا تھا۔ رم تیار ہوتی تھی۔ قسم قسم کے بیجوں سے روغن کشید ہوتا تھا۔ دھات کا سامان ڈھلتا اور کاغذ بنتا تھا۔ اس لئے اس کی شہادت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

سوتی دھاگا۔ سالانہ ..... پونڈ وزن کا دھاگا کاتا جاتا تھا جو ۲۰ نمبر سے لے کر ۵۰ نمبر تک باریک ہوتا تھا۔ ہندوستان کا سوت ہی احتیاط سے چن لینے کے بعد اس کام میں لایا جاتا تھا اور یورپی اشخاص کی نگرانی میں ہندوستانی مزدور مشینوں پر کام کرتے تھے۔ یہاں (نتلو) کرگھے تھے جو بھاپ سے چلتے تھے لیکن دھاگا بنانے ہی میں بھاپ کی تمام قوت صرف کرنے کی غرض سے کیونکہ دھاگے میں منافع زیادہ ملتا تھا ان کارگاہوں سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ کم نمبر کے موٹے دھاگے انگریزی دھاگے سے زیادہ اور بڑے نمبر کے باریک دھاگے کے برابر بکتے تھے لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کاروبار میں منافع اس کی کثیر لاگت کے تناسب نہ تھا۔ اس گواہ نے کہا تھا کہ "میں تو نہیں سمجھتا کہ یہاں سوت کاتنے کا کوئی اور کارخانہ کبھی قائم ہوگا کیونکہ موجودہ کارخانے کی تعمیر میں اس قدر مصارف ہوئے ہیں کہ اب کسی کی ہمت نہیں پڑھتی"!

کوئیلا۔ یہ گواہ اپنی بردوان کی کان کا کوئیلا استعمال کرتا تھا۔ کلکتے میں کوئیلا ۱۶ شلنگ فی ٹن کے حساب سے بکتا تھا۔ مگر یہ انگریزی کوئیلے کے برابر اچھا نہ تھا۔ پھر بھی سستا ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں عام طور پر بھاپ سے چلنے والے جہازوں میں صرف ہوتا تھا۔ کلکتے میں بردوان کے کوئیلے کی لاگت فی ٹن ۱۲ یا ۱۳ شلنگ تھی اور نیوکاسل کے کوئیلے کی قیمت فی ٹن ۲۵ شلنگ تھی۔

شکر۔ گنے کی کاشت کرنے والے گنوں کا رس ابالکر گڑ بناتے تھے اور شکر بنانے کے لئے کارخانوں کو بیچ دیتے تھے۔ بنارس کی باریک شکر ۱۱ یا ۱۲ روپئے (۲۴ شلنگ) کو ۸۰ پونڈ (وزنی) بکتی تھی۔ محصولات کی شرح یکساں

کرنے سے پہلے اس کی قیمت کم تھی۔ انگلستان کو جو شکر جاتی تھی وہ جہاز پر ایک ٹن بوجھ متصور ہوتی تھی اور فی ٹن ساڑھے دس پونڈ کرایہ اس پر دینا پڑتا تھا۔

رم شراب۔ جزائر غرب الہند کی رم شراب جب انگلستان میں درآمد ہوتی تھی تو اس پر فی گیلن ۹ شلنگ محصول لیا جاتا تھا حالانکہ ہندوستان کی رم پر فی گیلن ۱۵ شلنگ محصول تھا۔ ہندوستان میں رم شراب گڑ سے بھی بنتی تھی اور گڑ کے فضلے سے بھی۔ ۸۰ پونڈ (وزنی) گڑ کے فضلے سے $3\frac{1}{2}$ گیلن رم لندن کے معیار کے برابر تیز بنائی جا سکتی تھی۔ مگر گڑ سے اس سے بھی زیادہ مقدار میں شراب کشید کی جا سکتی تھی۔ کلکتے میں ایک گیلن رم دس آنے (ایک شلنگ تین پنیس) کو ملتی تھی۔

دراصل زیادہ منافع تو اس میں تھا کہ گڑ سے شکر بنانے کے بعد فضلہ جو رہ جاتا تھا اس سے رم شراب کشید کی جاتی مگر اس طرح عموماً نہیں کیا جاتا تھا۔

ریشم۔ انگلستان میں بنگالے کا خام ریشم فی پونڈ (وزنی) تقریباً ۱۶ شلنگ قیمت پر بکتا تھا۔ ہندوستان کے ساختہ کورے ریشمینے فی پونڈ (وزنی) ۱۶ یا ۱۷ شلنگ قیمت پر فروخت ہوتے تھے۔ ہندوستان سے خام ریشم کی برآمد انحطاط پر تھی سنہ ۱۸۲۰ء سے سنہ ۱۸۲۹ء تک ۹۲۰۰۰۰ پونڈ اس کی جملہ قیمت ہوتی تھی لیکن سنہ ۱۸۳۱ء سے سنہ ۱۸۳۲ء تک صرف ۵۴۰۰۰۰ پونڈ کی برآمد شاید اس لئے ہوئی تھی کہ ریشمی پارچے ہندوستان ہی میں زیادہ بننے لگے تھے اور غالباً ہندوستان سے ریشمی پارچوں کی برآمد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔

جی۔ جی۔ ڈی ایچ لارینٹ

اس کے بعد "ایسٹ انڈیا اور چینا اسوسی ایشن" (انجمن چین و ہند) کے صدر نشین مسمی لارینٹ کی شہادت لی گئی۔ یہ انجمن سنہ ۱۸۳۶ء میں ان لوگوں کی امداد کی غرض سے قائم ہوئی تھی۔ جن کی تجارت ہندوستان اور چین سے تھی مختلف ممالک سے انگلستان میں شکر اور رم شراب کی جو درآمد تھی اس پر لارینٹ نے

ایک طول طویل شہادت دی اور ساتھ ہی ساتھ اس نے ہندوستان کے سوتی اور ریشمی مصنوعات کے انحطاط پر پرزور الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سوتی مال تجارت۔ مسٹر لارپنٹ نے مجلس کے سامنے انگلستان میں ہندوستانی مال کی درآمد اور ہندوستان میں انگریزی سوتی مال کی برآمد کے متعلق ذیل کے اعداد پیش کیے تھے:

سوتی مال تجارت جو ہندوستان سے برطانیہ عظمیٰ میں درآمد ہوتا تھا۔

سنہ عیسوی		
۱۸۱۴	۱۲۶۶۶۰۸	تھان
۱۸۲۱	۵۳۴۴۹۵	”
۱۸۲۸	۴۲۲۵۰۴	”
۱۸۳۵	۳۰۶۰۸۶	”

برطانوی سوتی مصنوعات جنکی ہندوستان میں برآمد تھی

سنہ عیسوی		
۱۸۱۴	۹۱۸۲۰۸	گز
۱۸۲۱	۱۹۱۳۸۷۲۶	”
۱۸۲۸	۴۲۸۲۲۰۷۷	”
۱۸۳۵	۵۱۷۷۷۲۷۷	”

مصنوعات ہند کی اس کمی اور برطانوی مصنوعات کی اس بیشی کے باوجود برطانوی سوتی مال $3\frac{1}{2}$ فی صدی محصول بحساب قیمت ادا کرنے پر ہندوستان میں درآمد کیا جاسکتا تھا اور اسکا لیکہ ہندوستان کا سوتی مال انگلستان میں درآمد ہونے پر ۱۰ فی صدی محصول بحساب قیمت وصول کیا جاتا تھا مسٹر شور کے بیان کا اعادہ کرتے ہوئے اس گواہ نے ذیل کی عبارت پڑھ کر سنادی ”برطانوی مصنوعات

کا دیسی مصنوعات کی جگہ رائج کر دینا برطانیہ کی ہوشیاری اور فیروزی کی ایک شاندار مثال کے طور پر اکثر پیش کیا جاتا ہے مگر در اصل انگریزی جبریت کی مثال اس کو کہیں تو زیادہ موزوں ہو گا کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح برطانیہ کی علانیہ پاسداری میں سب سے زیادہ زحمت دہ جنگی اور دیگر محصولات کا نظام قائم کر کے ہندوستان کو مفلس و نادار بنا دیا گیا تھا" مسٹر لارپنٹ اس باب میں بالکلیہ مسٹر شور کا ہم خیال تو نہ تھا لیکن کمپنی کے ایک ممتاز عہدہ دار کے جذبات اس سے ظاہر ہوتے ہیں اور ممکن تھا کہ یہی احساس ہندوستان کے لوگوں کے بھی ہوں۔

ریشمی مال تجارت۔ برطانوی ریشمیں کپڑے وغیرہ ۳½ فی صدی محصول دینے پر کلکتے میں لائے جاسکتے تھے اور ہندوستانی ریشمی پارچے ۲۰ فی صدی محصول درآمد ادا کرنے پر انگلستان میں لائے جاسکتے تھے۔ کورے ریشمی پارچے انگلستان میں زیادہ تر چھاپنے (ٹھپا اٹھانے) کی غرض سے بھیجے جاتے تھے اور اس کے بعد دوسرے ممالک کو بھیجدیے جاتے تھے۔ انگلستان میں کوری ریشمین چیزیں جو انگلستان بھیجی جاتی تھیں ان کے متعلق ذیل کے اعداد پیش کئے گئے تھے۔

سنہ عیسوی	انگلستان کے تصرف کے لئے	غیر ممالک کو برآمد کرنے کے لئے
	تھان	تھان
۱۸۳۸	۱۶۰۰۰	۳۱۰۰۰۰
۱۸۳۹	۳۰۰۰۰	۳۵۲۰۰۰

ہندوستانی چھاپے کے جیبی باند معنوں دو مال کثیر تعداد میں انگلستان میں درآمد کیے جاتے تھے۔ ریشمی مال پر انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ یکساں محصول کر دینے کے متعلق مسٹر لارپنٹ نے زور دار بحث کی تھی مگر برطانوی صناعوں کے نمائندے اور مجلس منتخبہ کے ایک رکن مسمی براکلہرسٹ کی خواہش یہی تھی کہ محصول

یکساں نہ کر دیا جائے کیونکہ انگلستان کے لیئے یہی مفید مطلب تھا۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی پیداوار پر اس کا کیا اثر ہوگا اس کا خیال کیئے بغیر آپ رائے دے رہے ہیں۔

مسٹر لارپنیٹ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک حد تک اس ملک کے ریشمی مصنوعات کے ساتھ برابری کا مقابلہ رہے گا مگر اصولاً مجھ کو یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہمارے متعدد مقبوضات میں ہندوستان کا بھی شمار ہے یا نہیں؟۔ پہلے بھی یہ استدلال پیش کیا گیا تھا کہ جب ہمارے مصنوعات ہندوستان میں ایک خفیف سا محصول ادا کرنے پر آسکتے ہیں تو ہمیں بھی یہ چاہئیے کہ ہندوستان کے مصنوعات کو ویسا ہی قلیل محصول دینے پر انگلستان لانے کی اجازت دیدیں۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ کیا اس ملک کی کوئی نو آبادی ایسی بھی ہے جس کے مصنوعات اس قدر کم لاگت پر انگلستان لائے جاتے ہیں جیسے ہندوستان کے مصنوعات؟

مسٹر لارپنٹ۔ اس ملک کی کوئی نو آبادی ایسی نہیں ہے جسکے کثیر المقدار مصنوعات کے لئے اس درجہ اس بات کی ضرورت ہے۔ ہم نے ہندوستان کے مصنوعات کو تو بالکل نیست و نابود ہی کر دیا اس کے بعد اس گواہ نے مجلس شمار کے اُن خیالات کا اعادہ کیا جو لارڈ ولیم بنٹنک کی ۳۰ مئی ۱۸۲۹ء کی یادداشت میں درج ہیں۔ اور جنکی عبارت یہ ہے کہ "مجلس کی ہمدردی مجلس مالگزاری کی رپورٹ پڑھنے کے بعد جس میں تجارتی انقلاب کے اثرات کی ایک المناک تصویر کھینچی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے موجودہ زمانے میں ہندوستان کے بیشمار طبقے اور جماعتوں کیلئے ایسے کیا کیا تکالیف نہ پیدا ہو گئے ہیں جنکی مثال تاریخ تجارت میں کہیں نہیں ملتی بہت بڑھ گئی ہے")

لیکن مسٹر براکلہرسٹ اس سے قائل تھوڑے ہی ہوتا تھا! انگلستان میں ہندوستانی ریشمی رومالوں کے استعمال پر اسکی روح کرب میں پڑ گئی تھی۔ اسلیئے ٹہر ٹہر کر وہ پھر اسی مضمون پر آتا تھا۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہندوستانی ریشمی رومال اس ملک میں بنے ہوے رومالوں کے بجائے اس تعداد میں استعمال ہو رہے ہیں کہ اب یہاں ناکارہ ریشم سے نقلی رومال بنا کر ان کے بدلے رائج کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں؟

مسٹر لارپنٹ۔ میں نے سنا تو ہے کہ ناکارہ ریشم کے بنے ہوے رومال رائج

کیے جا رہے ہیں اور جیسا میں نے پہلے کہا ہے کہ ان بنانے والوں کی جودت طبع اور حکمت سے ہماری منڈیوں میں غالباً ایسا مال رائج ہو جائے گا جو کم قیمت ہونے کی وجہ سے عام طور پر استعمال ہونے لگے۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ اگر تجارتی مقابلے میں اپنی موجودہ حیثیت قائم رکھنے کے لیے برطانوی صناعوں کو ادنیٰ درجے کی چیزیں بنانے پر مجبور کر کے؟

مسٹر لارپنیٹ۔ جن چیزوں کی طرف آپ کا اشارہ ہے وہ ہمیں کی ساختہ ہیں۔ برطانوی صناعوں ہی نے ان ادنیٰ درجے کی چیزوں کو بنایا ہے۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ شاید یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ہندوستان میں صرف خام پیداوار ہوتی رہے اور یہ ملک اس خام پیداوار کو مکمل کرنے میں اپنا ہنر دکھاتا رہے؟

مسٹر لارپنیٹ۔ ہندوستان کی جو موجودہ حالت ہے اس سے قطعی یہی ہونے والا ہے اور ہماری رائے یہ ہے کہ ان اہم چیزوں ہی کے لئے جن کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے ہندوستان کی زرعی پیداوار کی ہمیں ہر طرح مدد کرنی چاہئیے۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ ہندوستان کے گئے گزرے مصنوعات میں یہی ایک چیز رہ گئی ہے جس کے اس ملک میں رائج ہو سکنے کی توقع بھی ہے تو پھر کم از کم اس کو ایک واجبی موقع دنیا چاہیئے اور یہ نہیں کہ برطانوی صناعوں کی طرفداری میں اس پر ۲ فی صدی محصول لگا دیا جائے جو سراسر ظلم ہے۔

منٹگمری مارٹن

ہندوستان کا اس سے بھی زیادہ زور آور حامی منٹگمری مارٹن تھا۔ اس نے دس سال تک زیادہ تر اپنے خرچ سے شاہنشہی برطانیہ کی نو آبادیات میں سیاحت کی تھی۔ واقعات اور اعداد و شمار جمع کیے تھے اور برطانوی نو آبادیات کی پہلی مکمل تاریخ جو پانچ ضخیم جلدوں میں تھی تالیف کی تھی۔ مارٹن ہندوستان میں بھی

رہا تھا۔ ہندوستان کے مسائل کا برسر موقع بغور مطالعہ کیا تھا۔ اور ڈاکٹر فرانسس بکانن کے مغربی ہند سے متعلق ضخیم اور قابل قدر اعداد و شمار و حالات کو جن کو خود بکانن ترتیب نہ دے سکا تھا مرتب کیا تھا۔

اس نے لکھا کہ "میں نے ہندوستان کی سالہا سال کی تجارت کی طویل تحقیق کی ہے۔ مختلف اسناد وغیرہ کو (جنہیں دیکھنے کی اجازت ایسٹ انڈیا ہوز کی معزز مجلس نظماء نے اپنی معمولی فیاضی کے ساتھ مجھے عطا کی تھی) بالتحقیق پڑھنے کے بعد صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے میں نے حد درجے کی محنت اٹھائی ہے۔ اور اس یقین واثق کا میرے دل پر بہت اثر ہے کہ ہندوستان کی تجارت بالکل ناواجبی طور پر بہت بڑے گھاٹے میں رہی ہے اور نہ صرف انگلستان کی حد تک بلکہ اور تمام ممالک کے ساتھ اور محض اس وجہ سے کہ انگلستان آزاد تجارت کے لئے ایک شور مچائے ہوئے تھا مگر خود ہندوستان کو آزاد تجارت کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا" اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ "سوائے ان اشیاء کے جن کے دیسی صناعوں کی جگہ ہم نے غصب کر لی ہے اور اس طرح ہم اس ملک کو اور زیادہ مفلس و نادار بنا رہے ہیں عام طور پر تجارت انحطاط ہی پر ہے"

سوتی پارچے ۱۸۱۵ء میں ہندوستان سے جو سوتی پارچے انگلستان میں برآمد ہوئے تھے ان کی قیمت ۱۳۰۰۰۰۰ پونڈ تھی مگر ۱۸۳۲ء میں ۱۰۰۰۰۰ پونڈ سے بھی یہ کم تھی ۱۸۱۵ء میں انگلستان سے جو سوتی کپڑے ہندوستان میں درآمد ہوئے تھے ان کی قیمت (۲۶۳۰۰) پونڈ تھی مگر ۱۸۳۲ء میں ۴۰۰۰۰۰ پونڈ سے بھی یہ زیادہ ہو گئی تھی"۔ "ہم نے ایک ربع صدی کے اندر اندر ہندوستان کی عملداری کے لئے ہمارے مصنوعات کا لینا ناگزیر کر دیا تھا۔ ہمارے پشمینوں پر محصول معاف تھا۔ ہمارے سوتی پارچوں پر صرف $2\frac{1}{2}$ فی صدی محصول تھا اور دوسری چیزوں پر بھی اسی تناسب کے ساتھ محصول لیا جاتا تھا۔ درانحالیکہ ہماری اس عملداری کی ساختہ چیزوں پر اسی مدت میں ۱۰ سے لے کر ۲۰-۳۰-۵۰-۱۰۰-۵۰۰ کیا ۱۰۰۰ فی صدی تک ہم نے امتناعی محصول لگا دیا تھا۔ اس لئے ہندوستان کے ساتھ آزاد تجارت قائم کرنے کے لئے جو ایک شور مچایا گیا ہے اس کا منشا

انگلستان کے ساتھ ہندوستان کی جو تجارت ہے اس کو آزاد رکھنے کا نہیں بلکہ ہندوستان کے ساتھ اس ملک کی جو تجارت ہے صرف اس کو آزاد رکھنے کا ہے ......

سورت ڈھاکہ۔ مرشد آباد اور دیگر مقامات میں جہاں کسی وقت دیسی مصنوعات فروغ پر تھے اب ایسی تباہی اور بربادی پھیل گئی ہے کہ اس کا بیان کرنا تکلیف سے خالی نہیں۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ یہ حالت اثنائے تجارت میں جیسا کبھی ہوا کرتا ہے پیدا ہوئی ہے بلکہ میرے خیال میں دراصل زوردار نے کمزور کی مٹی پلید کی ہے"

اس طرح کی شہادت پر برطانوی صناعوں کے نمایندے مسمی براکلہرسٹ اور اس گواہ میں خوب بحثا بحثی ہوی۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کے یا کس ملک کے جولاہوں میں سے ایک گروہ کا بھینٹ چڑھنا ضروری تھا اور وہ تو ہندوستان میں ہو ہی چکا کیا آپ کی خواہش اب یہ ہے کہ اس ملک پر آفت نازل کرکے ہندوستان کی آبادی میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی جائے؟

مسٹر مارٹن۔ میری خواہش ہندوستان کی آبادی میں از سر نو جان ڈالنے کی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کو اس طرح مسلسل نقصان جو پہنچ رہا ہے میں صرف اس کا انسداد چاہتا ہوں۔ اس سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ہندوستانیوں کو اس ملک میں ملکی مصنوعات کے ساتھ تجارتی مقابلہ کرنے کی اجازت دینے سے انگلستان کے جولاہے سرے سے نیست و نابود ہو جائیں گے کیونکہ ہندوستانیوں کے پاس نہ تو بھاپ سے چلنے والے کرگھے ہیں اور نہ ان کو ہنر اور سرمایے سے اسی خوبی کے ساتھ کام لینا آتا ہے جیسا گلاسگو اور مینچسٹر کے صنعت گروں کو آتا ہے۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ اب تک جتنے سوالات کیے گئے ہیں وہ کلیتاً ان مہین پارچوں سے متعلق ہیں جن کو بھاپ سے چلنے والے کارگاہوں پر تو نہیں بنایا جا سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس ملک میں مہین پارچے تیار کریں یا ان کا بنانا بالکل چھوڑ ہی دیں؟

مسٹر مارٹن۔ اگر یہاں مہین پارچے تیار کرنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہندوستان کے ساتھ ناانصافی روا رکھی جائے تو میرا جواب یہ ہے کہ نتیجہ کچھ ہی

کیوں نہ ہو انگلستان کو تو ہر حالت میں انصاف ہی سے کام لینا چاہئیے۔ انگلستان کو ہر گز یہ حق نہیں ہے کہ اپنے فائدے کی خاطر اور اپنی قوم کے محض ایک طبقے کی حمایت میں کسی دوسری قوم کو مٹی میں ملا دے خواہ وہ قوم مفتوحہ ہی کیوں نہ ہو۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ ۱۸۳۳ء میں جب اس ملک کے ہاتھ میں ہندوستان کی زمام حکومت آئی تھی لہ اس وقت ہندوستان میں کپڑا بُننے کی صنعت مٹ چکی تھی اس لیے اب اس کے مٹانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ وہ تو گئی گزری بات ہوئی۔ اب ہمارے سامنے جو شہادت پیش ہوئی ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مصنوعات کے بجائے زیادہ تر زرعی پیداوار ہی ہوتی ہے اور جو لوگ پہلے صنعت میں مشغول تھے وہ اب زراعت میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کو کیا یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہاں کے مصنوعات مسدود ہو جائیں تو پھر کیا یہاں کے لوگوں کو روزی کمانے کے لئے زراعت کی طرف متوجہ ہونے کا کوئی موقع بھی ہے؟

مسٹر مارٹن۔ مجھ کو آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ ہندوستان سرے سے ایک زرعی ملک ہے۔ درحقیقت جیسا وہ صنعت گر ملک ہے ویسے وہ زرعی ملک بھی ہے اور جو کوئی اس ملک کی حیثیت کم کر کے اس کو محض زرعی بنا دینا چاہتا ہے وہ دراصل اس کو معیار تمدن سے گرا دینا چاہتا ہے۔ میرا مفروضہ یہ نہیں ہے کہ ہندوستان انگلستان کا ایک بہت بڑا کھیت بن جائے۔ ہندوستان صنعت گری کا ملک ہے ایک زمانے سے مختلف قسم کے مصنوعات وہاں بنتے

لہ ۱۸۳۳ء عیسوی میں ہندوستان برطانیہ عظمیٰ کے زیر حکمرانی نہیں آیا تھا۔ یوں تو اس سے پچاس سال پہلے برطانوی حکومت نے ہندوستان کا نظم و نسق پٹ کے قانون ہند بابتہ ۱۷۸۴ء عیسوی کی رو سے اپنی نگرانی میں لے لیا تھا اور وہ اس نظم و نسق کی ذمہ دار بھی تھی لیکن ۱۸۳۳ء میں جو قانون نافذ ہوا تھا اس کی رو سے کمپنی کے منشور کی تجدید کی گئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ کمپنی کو آیندہ تجارت کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔

رہے ہیں اور ایسے کہ جہاں برابری کا مقابلہ رہا ہے وہاں کوئی قوم ہندوستان کا مقابلہ نہیں کرسکی۔ میں یہ ڈھاکے کی ململوں اور کشمیری شالوں کے متعلق ہی نہیں کہتا بلکہ ان تمام مختلف چیزوں کے متعلق کہہ رہا ہوں جو بمقابل دنیا کے کسی اور خطے کے ہندوستان میں بہت بہتر طریقے پر بنتی ہیں۔

پشمینے پچیس سال تک برطانیہ کے ساختہ پشمینے ہندوستان میں بلا محصول لائے جاتے تھے۔ لیکن بکرے کے اون کے بنے ہوئے ہندوستانی پشمینوں پر ۳۰ فی صدی محصول بحساب قیمت انگلستان میں لیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۲۳ء سے ۱۸۳۰ء تک ہندوستانی پشمینوں کی درآمد اوسطاً سالانہ ۲۸۰۰۰ پونڈ سے زیادہ نہ تھی۔ اس تجارت کو موقوف کر دینے سے برطانوی صناعوں کو کچھ فائدہ نہ ہوا کیونکہ انگلستان کے لئے شالیں زیادہ تر یورپ سے بن کر آتی تھیں۔

جہاز سازی۔ ہندوستان میں جہاز کم بن رہے تھے ۱۷۹۵ء اور ۱۷۹۶ء کے درمیان کلکتے میں ۱۰۵ ۱۴۱ ٹن وزنی چھ جہاز بنے تھے اور ۵۰۰ سے ۶۰۰ ٹن وزنی ناؤ وغیرہ تیار ہو رہی تھیں ۱۷۹۷ء اور ۱۷۹۸ء کے درمیان متعدد جہاز وغیرہ کلکتے کے کارخانے کے بنے ہوئے دریا پر چلتے تھے لیکن اب (۱۸۴۰ء میں) جہاز سازی وہاں بالکل بند ہو گئی تھی۔ بمبئی میں پارسیوں نے جہاز بنانے کا ایک عظیم الشان کارخانہ قائم کیا تھا جس کا تمام عملہ تین پشت تک پارسیوں ہی کے زیر انتظام رہا تھا۔ "ایشیا" نامی ایک اچھا جہاز نوروزجی جمشید جی نے بنایا تھا اور دوسرے پارسی شرفا انگریزی کارخانوں میں جہاز بنانا سیکھ رہے تھے۔ اگر انگریزوں کے بنائے ہوئے جہازوں پر ہندوستانی خلاصی ہوتے تھے اور وہ ان ممالک کی بندرگاہوں کو جاتے تھے جن سے انگلستان کے ساتھ باہمی معاہدے تھے کہ جانبین کے حقوق و فرائض ہر وقت ملحوظ رکھے جائیں گے تو ان جہازوں کے ساتھ برطانیہ کے جہازوں کا سا برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا اور یہ ہندوستان میں جہاز بنانے میں بڑا مزاحم تھا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ۱۸۳۳ء کے منشور میں تو یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ ہندوستانی بھی برطانوی رعایا تھے نگران کے حق میں یہ سخت ناانصافی اور ظلم تھا کہ تجارتی جہازوں کے معاملات میں ان کو برطانوی رعایا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

مطالباتِ وطن۔ اس گواہ نے کمپنی کے منشور کی سنہ ۱۸۱۳ء کی تجدید سے سنہ ۱۸۳۳ء کی مکرر تجدید تک اس بست ۲۰ سالہ مدت کے مطالباتِ وطن کے یعنے ہندوستان کے محاصل کی جس قدر رقم انگلستان میں صرف ہوئی تھی اس کے اعداد پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد کی پانچ سالہ مدت کے یعنے سنہ ۱۸۳۴ء سے سنہ ۱۸۳۸ء تک مطالباتِ وطن کے اعداد دوسری رپورٹ سے لیے گئے ہیں اور ہندوستان کے محاصل کے اعداد پارلیمنٹی نقشۂ بازیافت سے اخذ کیے گئے ہیں:

سنہ عیسوی	مطالباتِ وطن	محاصل ہند
	پونڈ	پونڈ
۱۸۱۴-۱۵	۲۴۴۶۰۱۶	۱۷۲۹۷۲۸۰
۱۸۱۵-۱۶	۲۰۴۸۰۳۰	۱۷۲۳۷۸۱۹
۱۸۱۶-۱۷	۲۰۴۲۸۰۹	۱۸۰۷۷۵۷۸
۱۸۱۷-۱۸	۲۰۲۳۹۹۶	۱۸۳۷۵۸۲۰
۱۸۱۸-۱۹	۲۳۶۹۹۴۷	۱۹۴۵۹۰۱۷
۱۸۱۹-۲۰	۱۸۶۱۳۸۱	۱۹۲۳۰۴۶۲
۱۸۲۰-۲۱	۲۳۰۶۱۸۷	۲۱۳۵۲۲۴۱
۱۸۲۱-۲۲	۳۲۰۳۶۱۱	۲۱۸۰۳۱۰۸
۱۸۲۲-۲۳	۳۳۲۶۴۰۶	۲۳۱۷۱۷۰۱
۱۸۲۳-۲۴	۲۰۲۷۴۲۰	۲۱۲۸۰۳۸۴
۱۸۲۴-۲۵	۲۱۸۲۱۳۲	۲۰۷۵۰۱۸۳
۱۸۲۵-۲۶	۲۳۶۲۳۶۰	۲۱۱۲۸۳۸۸
۱۸۲۶-۲۷	۲۹۷۵۱۴۱	۲۲۳۸۳۴۹۷
۱۸۲۷-۲۸	۲۶۹۴۲۱۹	۲۲۸۶۳۲۶۳

۱۸۲۸-۲۹	۲۷۱۹۵۷۹	۲۲۷۴۰۶۹۱
۱۸۲۹-۳۰	۲۶۱۳۵۲۷	۲۱۶۹۵۲۰۸
۱۸۳۰-۳۱	۲۳۹۹۵۷۳	۲۲۰۱۹۳۱۰
۱۸۳۱-۳۲	۲۴۷۵۵۶۹	۱۸۳۱۷۲۳۶
۱۸۳۲-۳۳	۲۲۳۳۵۵۹	۱۸۴۷۷۹۲۴
۱۸۳۳-۳۴	۲۰۵۳۱۴۱	۱۸۲۶۷۳۶۸
۱۸۳۴-۳۵	۳۰۶۳۳۲۲	۲۶۸۵۶۶۴۷
۱۸۳۵-۳۶	۲۹۵۹۹۷۵	۲۰۱۴۸۱۲۵
۱۸۳۶-۳۷	۳۰۹۰۵۸۲	۲۰۹۹۹۱۳۰
۱۸۳۷-۳۸	۲۹۷۹۵۱۴	۲۰۸۵۸۸۲۰

اس طرح ہم نے جو نقشہ مرتب کیا ہے اس سے ملکۂ وکٹوریہ کے سال تخت نشینی تک اس بست و چہار سالہ مدت میں مطالباتِ وطن کا ہندوستان کے محاصل کے ساتھ کیا تناسب رہا ہے وہ ظاہر ہوتا ہے۔

ان مطالباتِ وطن کا ایک قلیل حصہ یعنے تقریباً ایک خمس انگلستان سے جو سامان ہندوستان کی فوجی ضرورتوں وغیرہ کی تکمیل کے لئے آتا تھا اس پر صرف ہوتا تھا مابقی کے متعلق منٹگمری مارٹن نے کہا تھا کہ "یہ ہندوستان کے محاصل پر ایک ایسا مطالبہ ہے کہ ہندوستان کو اس کے معاوضے میں کچھ بھی نہیں ملتا ...... یہ حساب کرنا تعجب سے خالی نہیں معلوم ہوتا کہ اگر ہندوستان کے گزشتہ تیس۳۰ سالہ محاصل ہر سال تیس لاکھ ہی فرض کر لیے جائیں تو ۱۲ فی صدی (جو ہندوستان کی شرح سود ہے) سود در سود پر یہ رقم ۷۲۳۹۹۷۹۷۱ پونڈ ہو جاتی ہے۔ اگر ہم پچاس سال کے لئے سالانہ بیس۲۰ لاکھ ہی محاصل فرض کریں تو ہندوستان کے اس سرمایے کے بار آور ہونے پر یہ رقم جملہ ۸۴۰۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ ہو جاتی ہے جو برتر از قیاس ہے۔"

ریشمی مصنوعات۔ ہندوستان کے ریشمی مصنوعات اس غیر مساوی محصول سے

بالکل بری ہونے چاہئیں جو انگلستان میں ان پر عائد ہے کیونکہ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انگلستان کی یا کسی دوسرے ملک کی ریشمی مصنوعات سے ان کا مقابلہ نہیں ہے۔

الکزانڈر راجرز

سن۔ الکزنڈر راجرز ہندوستان میں سن کے بڑے بڑے کارخانوں کا مالک تھا اور ریشے کے لئے سن کی کاشت وہاں رائج کر رہا تھا کیونکہ ہندوستانی محض بیج کے لئے اس کی کاشت اب تک کرتے رہے تھے۔ یہ توقع کی جاتی تھی کہ ہندوستانی سن کے پہلے نمونے ۱۰ ار جون ۱۸۴۰ء تک انگلستان پہنچ جائیں گے "اگر ہم ایک قسم کے سن کی پیداوار میں کامیاب ہوں تو دوسری قسم کے سن کی پیداوار میں بھی کامیاب ہونے میں ہمیں کچھ مشکل نہ ہوگی کیونکہ دونوں کی کاشت کا طریقہ ایک ہی ہے"۔

ریشم۔ یہ گواہ ہندوستانی ریشم کثیر مقدار میں انگلستان بھیجتا تھا۔ برطانوی ریشمی مصنوعات کی ہندوستان میں درآمد پر ۲½ فی صدی محصول لیا جاتا تھا اور ہندوستانی ریشمی مصنوعات کی انگلستان میں درآمد پر (۲۰) فی صدی سے بھی زیادہ محصول وصول کیا جاتا تھا۔ اس تفاوت سے ہندوستانی ریشمی صنعت کے گویا ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ اگر ہندوستانی ریشموں پر محصول کم کر دیا بھی جاتا تو اس سے برطانوی مصنوعات پر کچھ مضر اثر نہیں پڑتا تھا کیونکہ فرانسیسی ریشموں پر محصول کم کر دینے سے کوئی مضر اثر نہیں پڑا تھا۔ ایک طرف تو ہندوستان کے ساختہ ریشم کے تھان جو انگلستان میں رائج ہو سکتے تھے وہ بہت گاڑھے ہوتے تھے مثلاً کورے ریشے جو بہت کم انگلستان میں بنائے جاتے تھے اور دوسری طرف انگلستان کو یہ فائدہ تھا کہ اس سے دیسیوں کو ان تھانوں کے معاوضے میں ہمارا مال خریدنے کے لئے دو چند بلکہ سہ چند رقم مل جاتی تھی۔

شکر۔ اس گواہ نے اپنے نیل کے کارخانے کے قریب شکر سازی کا ایک کارخانہ

۲۷،۰۰۰ پونڈ کے مصارف سے جیسور ضلع میں سرکول کے مقام پر تعمیر کیا تھا۔ اس امید پر کہ شکر اور رم شراب پر مساوی محصول کر دیا جائے گا کیونکہ یہ دونوں گنّے ہی سے بنتے تھے راجرز کو اچھے منافع کی توقع تھی۔ مگر اس کو صرف ۱۱½ فی صدی منافع ملا جو اطمینان بخش نہ تھا کیونکہ اگر ہندوستان میں بلا کسی خطرے کے صرف سود پر روپیہ قرض دیا جائے تو ۱۰ فی صدی اور سود در سود دیر تو اس سے بھی زیادہ بیٹھے بیٹھے مل جاتا ہے اگر رم شراب پر محصول مساوی کر دیا جاتا تو اس کے منافع میں اضافہ ہو سکتا تھا اور اگر نہ کیا جاتا تو وہ شکر سازی کے کاروبار سے دست بردار ہونے پر آمادہ تھا۔

ج۔ ام۔ ہیتھ

لوہا۔ اس گواہ کا جس انجمن سے تعلق تھا اس انجمن نے سنہ ۱۸۳۳ء میں ۱۲۰ میل مدراس کے جنوب میں "پورٹونوو" کے مقام پر کام شروع کر دیا تھا۔ لوہار کی بھٹیاں بنائی تھیں اور نرم لوہا بنانے کے لئے ایک لوہاری کارخانہ قائم کیا تھا غرض اس طرح اپنے کارخانے کو بہت بڑا کر دیا تھا۔ انگریزی لوہے سے فولاد نہیں بن سکتا تھا فولاد بنانے کے لئے لوہے کی ایک سلاخ بھی درکار ہوتی تھی تو انگلستان کو سویڈن اور روس سے یہ لوہا منگوانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ البتہ ہندوستان سے بھی یہ دھات مل سکتی تھی کیونکہ ہندوستانی لوہے سے بھی فولاد بن سکتا تھا۔ اس گواہ نے ریزۂ آہن کی شکل میں ہندوستان کا لوہا سلاخیں بنانے کے لئے انگلستان میں درآمد کیا تھا لیکن انگلستان میں آہن خام کی درآمد پر امتناعی محصول تھا۔ "ایک ٹن آہن خام پر ۵ شلنگ محصول ہے اور دو ٹن آہن خام سے ایک ٹن لوہے کی سلاخیں بنتی ہیں۔ ایک ٹن لوہے کی سلاخوں پر ۲½ شلنگ محصول لیا جاتا ہے ہے درآنحالیکہ ایک ٹن لوہے کی سلاخیں بنانے کے لئے جس قدر آہن خام درکار ہے اس پر ۱۰ شلنگ محصول وصول کیا جاتا ہے۔ انگریزی لوہے کی ہندوستان میں درآمد پر کچھ محصول نہ تھا"

ہاریس ہیمن ولسن

کتب۔ سنسکرت کے اس بڑے فاضل وفائق مستشرق نے جو ۲۴ برس سال ہندوستان میں گزارے تھے اور مراجعت وطن پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے کتاب خانے کا محافظ اور جامعۂ اکسفرڈ میں سنسکرت کا پروفیسر مقرر ہوا تھا اس نے اپنی شہادت میں بیان کیا ہے کہ جو کتابیں ہندوستان میں طبع ہوتی ہیں ان پر فی ہنڈرڈویٹ (چھپن سیر) دو پونڈ دس شلنگ محصول لیا جاتا ہے چنانچہ اس محصول کو معاف کر دینے کی اس نے استدعا بھی کی تھی۔

جوزف ٹکر

ریشمی مصنوعات۔ جوزف ٹکر ریشم پر ٹھپّا ٹھانے والی اور ریشمی رومال بیچنے والی سا جھے کی ایک لندن کی دکان کا شریک تھا جو برطانوی صنعت کی حفاظت کے لئے ہندوستان کی ریشمی مصنوعات پر ۲۰ فی صدی محصول قائم رکھنے کا خواہشمند تھا۔ اس نے کہا تھا کہ برطانیہ کے لوگ اب تک صرف برطانوی مصنوعات ہی استعمال کرتے تھے لیکن فرانسیسی ہندوستان کی چیزوں کو برطانوی مصنوعات پر ترجیح دیتے تھے اس لئے فرانس میں برطانوی ریشمی مصنوعات کی درآمد کم ہو رہی تھی۔ اس نے پارلیمنٹی نقشہ بازیافت سے ذیل کے اعداد پیش کیے تھے:

ممالک متحدہ برطانیہ سے فرانس میں درآمد		
سنہ عیسوی	برطانوی ریشمی مال تجارت	ہندوستانی باندھنوں اور دوسری قسم رومال
	پونڈ	پونڈ
۱۸۳۲	۵۰۶۰۰	۹۲۵۰۰
۱۸۳۳	۳۶۳۰۰	۶۰۴۰۰

۱۸۳۴	۳۲۷۰۰	۷۷۷۰۰
۱۸۳۵	۱۶۸۰۰	۱۱۴۴۰۰
۱۸۳۶	۱۵۶۰۰	۱۰۷۶۰۰
۱۸۳۷	۱۰۰۰۰	۱۷۴۵۰۰
۱۸۳۸	۹۴۰۰	۲۰۲۲۰۰
۱۸۳۹	۵۵۰۰	۱۶۸۵۰۰

اس گواہ نے مزید توضیح یہ کی تھی کہ ”جس زمانے میں پہلے پہل برطانوی مال تجارت فرانس بھیجا گیا تھا اس وقت ہندوستان کے مال تجارت کا فرانس میں داخل ہونا ممنوع تھا جس کا یہ نتیجہ تھا کہ فرانسیسی خریدار برطانوی مال ہی کو پسند کرتے تھے اور اسی لیے برطانوی مال اس مقدار میں فرانس بھیجا جاتا تھا۔ جیسے ہی یہ امتناع اٹھا دیا گیا ہماری تجارت پر اس کا اثر پڑا اگرچہ اس سے پہلے بھی اثر پڑ رہا تھا مگر وہ بالکل خفیف سا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر امتناع اٹھنا ہی تھا کہ فرانس کے ساتھ برطانیہ کا یہ رشتۂ تجارت سرے سے منقطع ہو گیا۔“

ہندوستان کی ساختہ ایک شئے کو صرف ایک یورپی قوم کے پسند کرنے سے انگریز دکانداروں اور صنعت گروں کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہی رشک و حسد ذیل کے آخری چار گواہوں کے بیان سے جو ریشم کے صناع تھے اور جن کا اظہار مجلس منتخبہ نے لیا تھا ٹپک رہا ہے! ان اشخاص کی شہادت کی طرف ہم اب متوجہ ہوتے ہیں۔

ٹامس کوپ

ریشمی مصنوعات۔ کسی اور گواہ نے اس طرح صاف صاف سیدھے سادے طریقے پر گواہی نہیں دی جیسے ٹامس کوپ نامی میکلز فیلڈ کے ریشم کے پارچہ باف نے

دی تھی۔

مسٹر بر اکلہرسٹ۔ ہندوستان کے ریشمی مال پر ۲۰ فی صدی محصول جو اس وقت ہے اگر وہ صرف ۲½ فی صدی کر دیا جائے تو اس کا اثر آپ کے شعبۂ تجارت پر کیا ہوگا؟

مسٹر کوپ۔ میری رائے میں اس کا اثر یہ ہوگا کہ تجارت کا یہ شعبہ نابود ہو جائے گا۔ اور اگر ایسا ہو گا تو وہ سب جماعتیں جن کا نام میں نے پہلے لیا ہے روزی کمانے اور محنت مزدوری کر کے ایمانداری کے ساتھ پیٹ پالنے کے ذرائع سے بالکل محروم ہو جائیں گی اور ایسے مفلس اور بے پروا بن جائیں گے کہ قوم کے دوسرے سب لوگوں کے لیے جن پر پہلے سے کچھ کم بوجھ نہیں ہے یہ مزید بار گراں ہو جائیں گے۔ اس سے قومی سرمائے کا ایک بہت بڑا حصہ بیکار پڑا رہے گا اور پردیسیوں کے ہاتھوں روزی کمانے کا وہ ذریعہ چلا جائے گا جس کو ہمارے کسب معیشت کے کام آنا چاہیے۔

مسٹر ہاگ۔ کیا آپ کی رائے یہ ہے کہ ریشم کے صنعت گروں کے حق میں انصاف کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہماری منڈی میں تمام بدیسی ریشمی مصنوعات کو آنے نہیں دینا چاہیے؟

مسٹر کوپ۔ میری رائے یہ ہے کہ انگریز صنعت گروں کے حق میں انصاف کرنے کی خاطر ان اشیا کی درآمد پر ایسا محصول لگانا چاہیے جس سے پردیسی اور ہم برابر ہو جائیں۔ اگر ایک ہندوستانی روزانہ ڈیڑھ یا دو پنس پر گزر اوقات کر لیتا ہے تو ایک انگریز روزانہ دو شلنگ سے کم میں گزارہ نہیں کر سکتا اور ہم اس کو بڑا ہی ظلم سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی پارچہ باف اپنا مال یہاں بھیجے اور ایسی ناواجبی شرائط پر ہم سے مقابلہ کرے۔

مسٹر ایلیٹ۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ اس ملک کے مزدور کو جو بہتر غذا کھاتا ہے یہ کہنے کا حق ہے کہ ہم ہندوستان کے مزدور کو اسی حال پر رکھیں گے کہ اس کو کھانے کے لئے چاول سے بڑھ کر کچھ نہ مل سکے؟

مسٹر کوپ۔ مجھ کو ہندوستانی مزدوروں پر ترس ضرور آتا ہے مگر ساتھ

ہی ساتھ بمقابل ہندوستانی مزدوروں کے اہل وعیال کے میرے اپنے اہل وعیال کا مجھ کو زیادہ خیال ہے۔ میرے نزدیک یہ بالکل غلط ہے کہ ہندوستانی مزدور کی خاطر سے اس لیے کہ ہندوستانی مزدور کی حالت اتفاقاً مجھ سے بدتر ہے میں اپنے اہل وعیال کے آرام وآسائش کو قربان کردوں اور میرے خیال میں ایسا قانون نافذ کرنا سراسر ناروا ہے جس سے روزی کمانے کا ایک ذریعہ ہم سے چھین لیا جائے اور ہندوستانی مزدور کو محض اس لئے دیدیا جائے کہ اس کی حالت ہم سے بدتر ہے"

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ہندوستان کے متعلق برطانیہ عظمیٰ کی جو حکمت عملی تھی وہ کوپ کے سے صناعوں ہی کی مقرر کردہ تھی اور برطانوی پارلیمنٹ و حکومت ہند دونوں برطانیہ عظمیٰ کے صناعوں اور رائے دہندوں کے محض فرماں بردار خادم تھے۔

جان براوٹ

ریشمی مصنوعات جان براوٹ میکلزفیلڈ کا ایک اور ریشم کا پارچہ باف تھا اور یہ بھی برطانوی ریشمی صناعوں کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔

مسٹر بر انگلہرسٹ ۔کیا آپ اس کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے ریشمی مصنوعات اور بانڈ معنور ومالوں پر محصول میں تخفیف کرنے سے آپ کے پیشے کو نقصان پہنچے گا۔

مسٹر براوٹ ۔ میں اس کو بہت بڑا نقصان سمجھتا ہوں اور عام طور پر میکلزفیلڈ کے اہل حرفہ کا خیال بھی یہی ہے کیونکہ اس حکمت عملی سے پردیسیوں کا ہماری منڈیوں پر قبضہ ہو جائیگا اور صنعت کا یہ ہمارا شعبہ بالکل مٹ جائیگا۔

جان فرانسس

ریشمی مصنوعات ۔شہر نارچ کا ایک اور ریشم کا پارچہ باف مسمی جان فرانسس

ہندوستانی ریشمینوں کے بالکل خلاف اس لئے تھا کہ وہ نہایت کامیابی کے ساتھ برطانوی مصنوعات کا مقابلہ کر رہے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے محصول کو مساوی کر دینے کی جب درخواست کی تھی تو اس پر اس نے کمپنی کے بہت سخت خلاف کہا تھا۔

مسٹر ایلیٹ ۔ ریشم کی پارچہ بافی چھوڑتے وقت جو آپ کا پیشہ تھا کیا آپ صرف اس پیشہ کی حالت سے بیزار ہو گئے تھے یا اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی تھی ؟

مسٹر فرانسیس ۔ میں صرف اس پیشے کی حالت دیکھ کر اس سے بیزار ہو گیا تھا " انڈیا ہوز یعنے " دفتر وزیر ہند میں جب کورے ریشمینوں کا نیلام ہوتا ہے میں وہاں جاکر ایک تھان آج اس قیمت پر خرید سکتا ہوں جس قیمت پر مجھ کو یہاں آدھ سیر خام ریشم نہیں ملتا ۔

مسٹر اروِنگ ۔ آپ اس کے کیا وجوہ سمجھتے ہیں ؟

مسٹر فرانسیس ۔ محض یہ وجہ ہے کہ ہندوستانی اپنا مال کم لاگت پر سستے داموں یہاں بھیج سکتے ہیں ۔

مسٹر بز اکلہرسٹ ۔ کیا آپ کے خیال میں اس صورت حال کا بہترین علاج یہ نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کو یہاں خام پیداوار بھیجنے کی ترغیب دی جائے تاکہ برطانوی صناع اس کو کام میں لائیں ؟

مسٹر فرانسیس ۔ یقیناً ۔

اس گواہ نے یہ بھی کہا کہ چالیس سال پہلے (تقریباً ۱۸۰۰ء میں) ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان سے کچا ریشم لائی تھی اور انگلستان میں چیزیں بنانے کے لیے کمپنی نے اس کو فروخت کر دیا تھا لیکن اب کمپنی " برطانوی صنعت سے بالکل بے پروا ہو گئی ہے " اور بہتر طریقے پر ریشم اپنے پاس سے نکالنے کے لئے کمپنی نے ہندوستان ہی میں ریشمینے بنانے کی اجازت دیدی ہے ۔

مسٹر براکلہرسٹ نے یہاں تک کوشش کی تھی کہ اس گواہ کے منھ سے اس بات کا اقبال کرادے کہ ہندوستان کے صنعت گر خام پیداوار اور صرف ۱½ پنس روزانہ پیدا کرنے میں خوش تھے اور آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ آپ کے خیال میں بھی وہ کسی قسم کی تکلیف میں تو نہیں ہیں۔ ساری عمر ان کو جیسی عادت پڑی ہے ویسی کو وہ زندگی گزارتے ہیں۔

مسٹر فرانسیس۔ یقیناً یہی بات ہے۔

مسٹر براکلہرسٹ۔ اس سے بہتر ان کو مایحتاج جب میسر نہ ہوں تو جو کچھ ہے اسی میں ان کو آرام ملتا ہوگا؟

مسٹر فرانسیس۔ جی ہاں۔ بھوکوں مرنے میں شاید آرام ملتا ہوگا مگر میں تو یہ خیال نہیں کرسکتا۔

جان پوئی ٹن

مجلس منتخبہ نے جس آخری گواہ کی شہادت لی وہ جان پوئی ٹن نامی اسپٹل فیلڈ کا ایک پارچہ باف تھا۔

ریشمی مصنوعات۔ اسپٹل فیلڈ میں بہت کم باندھنو رومال بنتے تھے اس لئے ہندوستان کا اس مقام سے کچھ مقابلہ نہ تھا۔ اس پر بھی یہ گواہ ہندوستانی مصنوعات پر محصول کم کرنے کا اس لئے مخالف تھا کہ وہ اگر محصول کم کردیا جائے تو ملک میں اس وضع کے رومال اور بھی کم بننے لگیں گے اور جو لوگ اب باندھنو رومال بناتے ہیں وہ جو کچھ اور بنانا شروع کردیں گے اور اس طرح ان چیزوں میں جن کو ہم بنا رہے ہیں یقینی وہ ہم سے مقابلہ کرنے لگیں گے۔

ہمیں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ آیا دارالعوام کی مجلس منتخبہ نے اس شہادت پر

جو قلمبند کی گئی تھی کوئی مختص تجاویز پیش کی تھیں یا نہیں ؟ لیکن ہمارے سامنے دارالامرا کی مجلس منتخبہ نے جو رپورٹ پیش کی تھی وہ موجود ہے کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دارالعوام و دارالامرا دونوں کے پاس معروضہ کیا تھا اور دارالامرا کی مجلس منتخبہ نے ملول لارپنٹ اور ٹریویلین کے علاوہ دوسرے ان گواہوں کی بھی شہادت قلمبند کی تھی جن کی شہادت مجلس دارالعوام کے سامنے پیش ہوئی تھی اور جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

لارڈ ایلنبرو جو بعد کو گورنر جنرل ہند ہوا تھا مجلس دارالامرا کا صدر نشین تھا اور اگرچہ اس کی رپورٹ ہندوستانیوں کے ساتھ بظاہر اتھاہ ہمدردی جتانے کے خیال سے لکھی گئی تھی مگر اس میں بھی ان کی دست گیری و دادرسی کے لئے جس کی تگ و دو میں وہ لگے ہوئے تھے کچھ نہیں لکھا گیا۔ لارڈ صاحب نے ہندوستان کے مخصوص دعاوی کو جو پارلیمنٹ کی حق شناسی اور فیاضی پر مبنی تھے حسب معمول اپنے رنگین طرز تحریر میں صرف بیان فرما دیا:

"ہندوستان جس کی آبادی ممالک متحدہ برطانیہ اور برطانوی شہنشہی کے زیر نگین جتنے اقطاع عالم ہیں ان سب سے زیادہ اور چہار چند زیادہ ہے جس کے محاصل ہی سے حکومت اور فوجی محافظت کے جملہ مصارف ادا ہوتے ہیں جس کی حکومت کے اعلیٰ تر معزز تر اور زرخیز تر عہدوں پر پیدائشی انگریز رعایا ہی مامور ہے اور حکمرانی کرتی ہے اس پر یہ بھی لازم کیا گیا ہے کہ مختصر سے فوجی سامان کے سوا بلا کسی معاوضے کے سالانہ وہ اس ملک کو بیس² اور تیس³ لاکھ پونڈ انگلیسیہ کی رقم ارسال کرتا رہے"۔

اس بلاغت نشان اظہار خیال کے بعد لارڈ ایلنبرو نے جزائر غرب الہند اور ہندوستان کے تمباکو پر محصول یکساں کر دینے کی سفارش کی لیکن رم شراب کے متعلق اس طرح کی تجویز پیش کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ہندوستان کے سوتی مصنوعات تو مٹ ہی چکے تھے۔ ایلنبرو نے سفارش کی کہ ان پر ہندوستان اور انگلستان میں محصول یکساں کر دیا جائے۔ لیکن ہندوستان

کے ریشمی مصنوعات انگلستان کے ریشمی مصنوعات کے ساتھ اب بھی مقابلہ کر رہے تھے اس لیے لارڈ ایلنبرو نے ان پر محصول یکساں کر دینے کی کوئی سفارش نہیں کی اور "ہندوستان کے یہ سب سے آخری مصنوعات" اسطرح مٹ گئے۔

آٹھواں باب

قہوہ ۔ شکر اور روئی

۱۸۴۸ء اقوام یورپ کے لئے بڑے سیاسی انقلاب کا سال تھا ۔ فرانس نے اپنے بادشاہ کو معزول کر کے اس کی جگہ دوسری مرتبہ جمہوریہ قائم کی تھی جرمانیہ چھوٹے چھوٹے والیانِ ریاست کی مطلق العنانی سے تنگ آکر باغیانہ تحریکات کی شکل میں اپنی بے صبری اور اضطرار کا اظہار کر رہی تھی ۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو ایک اہم دستور بھی مل گیا تھا ۔ اطالیہ نے قبل از وقت آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا میزینی کے خیالات کی تقلید میں ایک جمہوریہ روما میں قائم کر دی گئی تھی اور وہاں قومی خود مختاری حاصل کرنے کے لئے پہلی دفعہ ایک کوشش عظیم کی گئی تھی جو نا کامیاب رہی ۔ آسٹریا نے ویانا کی بغاوت بھی دیکھی تھی اور وطن پرست بہادر کسوتھ کے زیر حکم شورش پر آمادہ تھی آئرلینڈ میں تنسیخ "اتحاد" کا مسلسل مناقشہ کھلی بغاوت کا مقدمہ بن گیا تھا غرض ہر جگہ قدیم روش اور پرانی باتیں مفقود ہو رہی تھیں اور ان کے بجائے نئے نئے قومی ادارے اور قومی طاقتیں پیدا ہونے کے آثار نظر آتے تھے ۔

ان سیاسی تحریکات کے ساتھ ساتھ تجارتی اور زرعی مصیبت بھی یورپ میں پھیلی ہوئی تھی ۔ انگلستان میں ایک طرف تو مالکانِ اراضی کا طبقہ غلّے کی

قیمت حسبِ حال برقرار رکھنے پر تلا ہوا تھا۔ اور دوسری طرف صنعت گرد مزدور پیشہ طبقہ سستی روٹی کھانے پر اڑا ہوا تھا۔ اس جھگڑے کا تصفیہ ۱۸۴۶ء میں "قانون غلہ" کی تنسیخ پر ہوا۔ اس طرح برطانوی مصنوعات کو اس سے بڑا زور ہو گیا اور لوگ ایک ایسی شاہنشہی کے بے سر و پا خواب دیکھنے لگے جس میں سب انسانی ضرورتوں کا پورا پورا ساماں موجود ہو۔ کیا یہ ممکن تھا کہ انگلستان پر دیسی اقوام سے بالکل مستغنی بن جائے؟ کیا یہ ممکن تھا کہ انگلستان کے سب مایحتاج خود اسی کی نو آبادیات سے دستیاب ہونے لگیں؟ چینی چائے کے بجائے ہندوستانی چائے بتدریج مقبول ہو رہی تھی۔ کیا ہندوستان کے لیے یہ ممکن تھا کہ حسب ضرورت قہوے کی سربراہی بھی کرے؟ جزائر غرب الہند میں غلاموں کو آزادی ملنے کے بعد شکر کے نخلستانوں کو انحطاط ہو گیا تھا۔ کیا ہندوستان کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ برطانیہ عظمیٰ کے لئے معقول مقدار میں شکر بھیجا کرے؟ امریکہ کی روئی لنکشیر کے کارخانوں کے کام آتی تھی کیا یہ ممکن تھا کہ ضرورت کے موافق ہندوستان میں کپاس پیدا ہونے لگے؟ غرض ان سب امور کی پارلیمنٹ نے تحقیقات شروع کر دی۔

مجلسِ شکر و قہوہ

۱۸۴۸ء میں دارالعوام نے لارڈ جورج بنٹنک کی صدارت میں یہ دریافت کرنے کے لئے ایک مجلس منتخبہ منعقد کی کہ "ملک معظم کے جزائر غرب الہند اور ہندوستان کے مقبوضات اور جزیرۂ ماریشس میں شکر اور قہوے کے نخلستانوں" کی موجودہ حالت کیا ہے اور آیندہ کے توقعات کیا ہو سکتے ہیں۔ اس مجلس نے متعدد گواہوں کی شہادت قلمبند کی اور دو ہزار مطبوعہ صفحات کی آٹھ رپورٹیں پیش کیں۔ پہلا گواہ لارڈ پامرسٹن تھا مگر ہندوستان کی تجارت کے متعلق صاف سیدھا اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ پارلیمنٹ کے ایک رکن مسمی جان ٹنگشا کی شہادت بھی اسی روز پیش ہوی۔ ٹنگشا نے ان سب غیر مفید اشکال کو تفصیل کے ساتھ

بیان کیا جن کے تحت ہندوستان کو دوسرے برطانوی مقبوضات سے مقابلہ کرنے پر سخت نقصان پہنچا تھا۔

"اول ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطالبات وطن کی تکمیل کے لیے ہندوستان کے محاصل سے بلا کسی قسم کے معاوضے کے ہر سال تیس ۳۰ لاکھ پونڈ انگلیسیہ اور اس سے بھی بڑھ کر رقم باہر چلی جاتی ہے۔

"دوم۔ دیوانی اور فوج کے ملازم جن میں سے شاذ ہی دو ایک ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے بود و باش اختیار کرلیتے ہیں روپیہ خوب جمع کرتے ہیں اور ہندوستان کی دولت کا یہ جز ہر سال برطانیہ عظمیٰ ارسال ہوتا ہے جس سے وہاں کے اصل میں اسی قدر اضافہ ہوجاتا ہے۔"

"سوم یہ مشہور امر واقع ہے کہ برطانوی ہند کے محاصل کا جزء اعظم مالگزاری ہی ہے اور پیداوار اراضی پر یہ ایک بار سنگین ہے جو ایک کروڑ پینتیس ۳۵ لاکھ پونڈ انگلیسیہ کے لگ بھگ ہوتا ہے۔

"چہارم۔ انگلستان کے محصول خانوں میں جن طریقوں سے محصولات وصول کیے جاتے ہیں ان کی وجہ سے مال درآمد کرنے والوں کو ہر وقت مشکلات درپیش رہتی ہیں۔

گزشتہ تیس ۳۰ سال میں ہندوستان میں سوتی مصنوعات کے مٹ جانے پر جان بیگشا نے بہت تاسف کا اظہار کیا۔ ۱۸۱۶ - ۱۸۱۷ء میں "ہندوستان نے نہ صرف اپنی بڑی آبادی کے تمام کپڑوں کی سربراہی کی بلکہ ۱۶۵۹۴۲۸ پونڈ مالیت کے تھان اس کے علاوہ برآمد بھی کیے۔" مگر اس کے تیس ۳۰ سال بعد یہ برآمد کچھ بھی باقی نہیں رہی تھی بلکہ الٹے خود ہندوستان چالیس لاکھ پونڈ انگلیسیہ کا سوتی مال اپنے لیے درآمد کرنے لگا تھا۔ "برطانوی مصنوعات اہل ہند چاہیں تو خرید سکتے ہیں کیونکہ یہ ۲½ فی صدی محصول ادا کرنے پر ہندوستان میں درآمد ہوتے تھے مگر ہندوستانی مصنوعات پر یہاں (انگلستان میں) ایسا امتناعی محصول وصول کیا جاتا ہے کہ اہل انگلستان کا اس مال کو استعمال کرنا بالکل بند ہوگیا ہے۔" شکر انگلستان میں نہیں بنتی تھی اس لیے اس کے شرح محصول میں کسی قدر مفید تبدیلی

کی گئی۔ جس کا نمایاں نتیجہ فوری دکھائی دینے لگا۔ ایک ہندوستانی اخبار کی عبارت نقل کرتے ہوئے بیگشا نے یہ کہا کہ "گزشتہ کسی عہد میں تجارت کی کسی شعبے میں بھی ایسی بڑی ترقی ہونے کی مثال نہیں ملتی۔ اس ناگہانی توفیر کے مماثل ہندوستان کے کسی اور ذریعۂ آمدنی کا نشو و نما کبھی دیکھا ہی نہیں گیا۔ گزشتہ سال ہم نے (ہندوستان نے) انگلستان کو اس کے جملہ صرفے کی ایک ربع مقدار کے برابر شکر کی سربراہی کی تھی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان رفتہ رفتہ انگلستان کی پوری مانگ کی تکمیل کر سکے گا۔" یہ کہنا اب بے فائدہ ہے کہ یہ توقع کبھی پوری نہ ہوئی اور انیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصے میں قریب قریب دوسرے سب مصنوعات کے ساتھ شکر سازی پر بھی انحطاط چھا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ممتاز ناظم مسمی کرنل سائیکس نے جس نے ہندوستان کے اعداد و واقعات کا بغور مطالعہ کیا تھا ہندوستان سے ہر سال ۳۲۰۰۰۰۰ پونڈ سے لیکر ۳۷۰۰۰۰۰ پونڈ تک جو معاشی سوتاؤ تھا اسکی تفصیل بیان کرتے ہوئے سچ کہا تھا کہ "وہاں برآمد ہمیشہ درآمد سے متجاوز رہتی ہے جبھی تو ہندوستان اس خراج کی تاب لا سکتا ہے" ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر نشین ہنری سینٹ جان ٹکر نے کہا تھا کہ اس معاشی سوتاؤ کی مقدار روز افزوں ہو رہی ہے "کیونکہ مطالبات وطن میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے"۔ کمپنی کے صدر نشین کا اس پر اظہار افسوس کرنا بیشک خلوص دل کے ساتھ تھا اگر اس سے بھی کچھ تدارک حاصل نہ ہوا کوئی ستم ظریف یہ کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان سے دولت کی گنگا جتنی انگلستان کو بہتی تھی انگلستان بھی اتنی ہی زیادہ ہمدردی اور تاسف کا دریا بہا کر اس کا نعم البدل کر دیتا تھا۔

تھیفیل الگزانڈر جو ہندوستان کے ساتھ تجارت کرتا تھا انگلستان میں ہندوستانی شکر کے بڑی مقدار میں صرف ہونے کا دیر تک ذکر کرتا رہا مگر اس کے آیندہ توقعات کے متعلق نہایت نپی تلی شہادت اس نے دی تھی۔ ہندوستانی شکر کی تجارت میں سنہ ۱۸۴۶ء سے قبل معقول منافع ملتا تھا مگر تھوڑا عرصہ گزرا کہ کچھ نہیں ملنے لگا

اگر یہ تجارت بھی انحطاط میں آگئی تو پھر بڑی مشکل یہ تھی کہ ہندوستان سے اس ملک کو خراج ہر سال کیونکر ایصال ہوگا۔ اس گواہ نے یہ بیان کیا کہ سنہ ۱۸۴۰ء تک تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ عموماً ہندوستان کی درآمد تقریباً ۶۰۰۰۰۰۰ پونڈ اور برآمد تقریباً ۹۵۰۰۰۰۰ پونڈ رہی تھی۔ اور ان دونوں کا تفاوت تقریباً ۳۰۰۰۰۰۰ پونڈ ہوتا ہے اور یہی وہ خراج تھا جس کو کمپنی اس ملک سے وصول کرتی تھی۔[۱]

الگزانڈر اور جورج لارنپٹ (جن کا ذکر ہم نے پچھلے باب میں کیا ہے) ان دونوں نے مجلس منتخبہ کے سامنے یہ بیان کیا تھا کہ جزائر غرب الہند اور مورشیس زیادہ تر شکر بنانے والے ملک تھے اور ہندوستان زیادہ تر شکر صرف کرنے والا ملک تھا اور اپنی سالانہ پیداوار کا ایک قلیل جز غیر ممالک بھی بھیجتا تھا اسی لیے شکر کی برآمد میں ہندوستان مدت دراز کے لیے دوسرے ممالک سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لارنپٹ نے یہ بھی کہا کہ جو سنہ ۱۸۳۶ء میں محصول جو مساوی کر دیا گیا تھا وہ محض اس لئے نفع بخش ثابت ہوا تھا کہ اس اثناء میں جزائر غرب الہند کی شکر مقدار میں بہت کم ہو گئی تھی یعنے جہاں تک مجھ کو خیال پڑتا ہے سنہ ۱۸۱۲ء میں یہ شکر ۲۰۰۰۰۰ ٹن ہوئی تھی مگر سنہ ۱۸۱۸ء اور سنہ ۱۸۴۱ء

---

[۱] ہلی رپورٹ۔ پچاس سال قبل یہ صداقت عیاں ہو چکی تھی کہ مطالبات وطن کی تکمیل میں ہر سال جو معاشی بدررو ہندوستان سے جاری تھی اس سے ہندوستان جتنا مال درآمد کرتا تھا اس سے زیادہ برآمد کرنے پر مجبور تھا۔ اس طرح انگلستان اور ہندوستان کے درمیان جو تجارت قائم تھی وہ خود اختیاری یا فطری نہ تھی بلکہ جبراً تھی۔ نصف صدی کے بعد سے تو حالات بد سے بدتر ہو گئے ہیں۔ ہندوستان کی مصنوعات انحطاط پر ہیں درانحالیکہ مطالبات وطن تیس لاکھ پونڈ سے ایک کروڑ ستر لاکھ پونڈ تک پہنچ گئے ہیں۔ ہندوستان اس ہولناک مطالبے کی تکمیل بیشتر گیہوں اور چاول یعنے اہل ہند کے اشیائے خوردنی کی برآمد سے کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بڑھتا جا رہا ہے اور کثرت سے قحط پڑ رہے ہیں۔

میں صرف ۱۱۰۰۰ ٹن رہ گئی تھی۔ یہی بات تھی جس نے ہندوستان میں ایک حرکت ڈال دی اور نفع حاصل کرنے کا ایک اور موقع ہندوستان کے لئے پیدا کر دیا۔ یہاں شکر کی گرانی ہی ایک ایسی وجہ ہے جس سے ہندوستان کے لئے شکر برآمد کرنا نفع بخش ہوتا ہے۔"

ایک سے زیادہ گواہوں نے یہی بیان کیا تھا کہ پیداوار کے تخمینۂ قیمت کے موافق تشخیص مالگزاری کا اثر اراضی پر یہ تھا کہ شکر کی طرح اور دوسری قابل قدر پیداوار کی کاشت کرنے کی لوگوں کو ترغیب نہیں ہوتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر نشین مسمی ہنری سینٹ جورج ٹکر نے کہا تھا کہ "سر ٹامس منرو کا منصوبہ یہ تھا کہ ملک سے حتی المقدور محاصل وصول کیے جائیں۔ اس نے پیداوار کی مختلف چیزوں پر اپنے خیال کے موافق قیمت لگا کر مالگزاری کی تشخیص کر دی تھی اور ان اشیاء پر جن پر زیادہ منافع ملنے کی امید تھی مالگزاری کی رقم میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اس میں منرو کو کامیابی ہوئی یا ناکامیابی اس کے متعلق میں اس لئے کچھ نہیں کہتا ممکن ہے تخفیفِ پیداوار کے اسباب دوسرے ہی ہوں۔ لیکن یہ تو میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح محصول لگانے کا نتیجہ مدراس کی عملداری میں یہ ہوا کہ وہاں شکر سازی کے لئے گنے کی کاشت میں کمی ہونے لگی اور نئی نئی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔"

سیلون کے ایک نخلبند قہوہ مسمی رابرٹ کرسچین نے اس جزیرہ کے پہلے نخلستان قہوہ کے دلچسپ حالات حسب ذیل بیان کیے تھے۔

"سنہ ۱۸۳۷ء میں ہم نے پہلے پہل یہ کام شروع کیا تھا اس وقت ہماری ترغیب کا باعث یہ تھا کہ ایک طرف تو جزائر غرب الہند کے قہوہ کی مقدار پیداوار میں روز بروز بے حد کمی ہو رہی تھی اور دوسری طرف اس زمانے میں انگریزوں کے نخلستان تامینی محصول کے زیر اثر موج کر رہے تھے اور ان حالات کا نتیجہ یقینی یہی تھا کہ عام طور پر گرانی پھیلی ہوئی تھی"۔ ہم سے پہلے اہل سیلون بھی یورپی اشخاص کے بلا توسط اور بغیر امدادِ سرمایۂ قہوے کی کاشت اور قہوے کی برآمد بھی کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں اس جزیرے سے ۲۵۰۰ ٹن قہوہ جس کی کاشت کلیتاً اہل سیلون ہی نے کی تھی انگلستان بھیجا گیا تھا۔ اس سے (۶) سال بعد سنہ ۱۸۴۲ء کی

فصل ۲۴،۴۲۱ ٹن ہوئی تھی جس میں سے ۲،۱۷ ٹن اہل سیلون کی پیداوار تھی اور ۲۲،۳۰۹ ٹن یورپی نخلبندوں کی۔

مجلسِ منتخبہ نے اپنی آخری رپورٹ میں نیشکر کے نخلستانوں میں غلاموں کو آزادی مل جانے اور آزاد مزدوروں کے نہ ملنے سے جو سخت نقصان اور تکلیف ہوئی تھی اس کو تفصیلی طور پر بیان کیا تھا اور شکر کی طرفداری میں جو برطانوی مقبوضات کی پیداوار تھی۔ اشلنگ "تفریقی محصول" لگانے کی سفارش کی تھی۔

مجلسِ پنبہ

ایک اور اہم مجلس منتخبہ ہندوستانی کپاس کو ترقی دینے کے اسباب دریافت کرنے کے لئے اسی سال مقرر کی گئی تھی۔ قدیم زمانے ہی سے ہندوستان سوتی پارچوں کے لئے جن کی سربراہی ایشیا اور یورپ کی سب منڈیوں کو ہوتی تھی مشہور عالم تھا جب انگلستان نے اپنے بھاپ کی طاقت سے چلنے والے کارگاہوں اور بامعنی محصولات کے زور پر ہندوستان کی صنعت کو دیوچ ڈالا تو اس پر بھی امید کی جاتی تھی کہ ہندوستان اس خام پیداوار کی کاشت جس کی لنکیشر کے کارخانوں کو ضرورت تھی جاری رکھے گا۔ چنانچہ اس خیال سے کہ یہ خام پیداوار اور صنعت دونوں انگلستان ہی کے قبضے میں رہیں اور اس طرح امریکہ یا دوسرے غیر ممالک کی اس کو محتاجی نہ رہے ہندوستان میں کپاس کی کاشت کو ترقی اور توسیع دینے کے لئے ہر ممکنہ کوشش ہو رہی تھی۔ بنا برآں ۱۸۴۸ء میں جس مجلس منتخبہ کے ذمے یہ اہم ترین کام کر دیا گیا تھا اس کا صدر نشین مشاہیر انگلستان میں سے ایک شخص بنا دیا گیا یعنی جان برائیٹ جس نے "قانون غلہ" کی تنسیخ کے لئے شورش بپا کرنے میں کابڈن کے رفیق کار کی حیثیت سے خاص امتیاز حاصل کیا تھا۔ اسی تحقیقات کے اثنا میں جان برائیٹ نے ہندوستان کے معاملات پر ایسی مکمل اندرونی واقفیت حاصل کر لی تھی کہ مدت العمر اس کی تقریروں میں اس واقفیت کی جھلک نمایاں رہی

بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں[19] صدی کے وسط میں جان برائیٹ کی دارالعوام میں وہی حیثیت تھی جو اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری قرون میں ایڈمنڈ برک کی تھی۔ ایک بہت بڑے زبردست مشرقی ملک کے حق میں انصاف کرنے کی ان دونوں نے کوشش کی تھی جس کی یاد چار دانگ عالم میں اس وقت بھی تازہ رہے گی جبکہ برطانوی شاہنشہی کا نام ونشان دنیا میں نہ رہے گا۔ اور ان کی مطبوعہ تقریریں انگریزی نثر کے بہترین نمونوں کی حیثیت سے اس وقت بھی زیر مطالعہ رہیں گی جبکہ غالباً موجودہ انگریزی زبان دنیا میں بولی نہ جائے گی۔

مجلس منتخبہ نے کپاس کی کاشت سے متعلق ابھی بہت زیادہ شہادت قلمبند کی نہ تھی کہ ہندوستان کی اراضی پر تشخیص لگان کے متعلقہ سوال پر بھی نظر ڈالنا اس کے لیئے ناگزیر بن گیا۔

فرانسیس ولیم پریدو نے جو اس وقت تنقیح مراسلات ہند کے صیغے میں ایک مددگار تھا مینچسٹر کے ایوان تجارت کی درخواست سے مالگزاری کے موضوع سے متعلق ذیل کی عبارت پڑھ کر سنائی "کپاس کی بہتر طریقے پر کاشت کرنے میں جو رکاوٹیں ہیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں محصول اراضی ہے یعنے وہ حقیت ہے جو اراضی کی بنائے قبضہ ہے نیز سڑکوں اور ذرائع حمل ونقل کی غیر موجودگی۔ آپ کے سائلوں کا خیال یہ ہے کہ خود معزز مجلس کے یہ عقیدہ دل نشین ہے کہ ان مقامات میں جہاں فی زمانہ کپاس کی کاشت ہوتی ہے محصول اراضی بالکل ناقص ہے چنانچہ متعدد بار اصلاحیں شروع کی گئی تھیں مگر شروع کرنے کے ساتھ ہی موقوف کردی گئیں لیکن جب تک بمقابل دوسری چیزوں کی فصل کے کپاس کی فصل پر سنگین محصول لگانا ترک نہ کردیا جائے اور حقیت اراضی معقول اور رواجی اصول پر نہ قائم کی جائے اس وقت تک اعلیٰ درجے کی روئی پیدا کرنے کی سب کوششیں جن سے اس کی ایسی قیمت آنے لگے کہ اور زیادہ کاشت کرنے کی لوگوں کو ترغیب ہو رائیگاں جائیں گی۔"

برطانوی صناعوں کا وہ زور چلا کہ انگلستان میں روئی کی برآمد پر سب

محصولات معاف ہو گئے چنانچہ ۱۸۳۶ء میں بنگالے کی روئی پر ۱۸۳۸ء میں بمبئی کی روئی پر اور ۱۸۴۴ء میں مدراس کی روئی پر کوئی محصول وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن مجلس نظماء نے کپاس کی ازدیاد کاشت کی لوگوں کو ترغیب دینے کی غرض سے محصول اراضی میں تخفیف کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر جان فوربز رائل نے شہادت دی۔ یہ شخص سہارنپور کے "نباتی باغ" کا نو سال[9] تک محافظ رہا تھا اور ۱۸۳۷ء میں اس نے "ہندی طب کی قدامت" پر ایک قابل قدر رسالہ بھی شائع کیا تھا جس میں قدمائے ہند کے علم کیمیا اور علم جراحی کے معلومات کے متعلق کہ وہ کیا تھے اور کس نوعیت کے تھے توضیح کی تھی۔ اس نے اپنی شہادت میں یہ بیان کیا تھا کہ لورپول میں سورت کی روئی بمقابل امریکہ کی روئی کے ۳۰ فی صدی سستی بکتی تھی اور ہندوستان کی روئی عموماً نہایت کثیف حالت ہی میں جہازوں پر لاد دی جاتی تھی۔ امریکہ کی کپاس ہندوستان میں جہاں سرخ مٹی ہو وہاں بہتر نشو و نما پاتی تھی اور ہندوستان کی روئی سیاہ مٹی میں۔ الاباما اور لوئیزیانہ نامی امریکہ کی ریاستوں میں فی ایکر چار سو پونڈ (وزنی) صاف روئی نکلتی تھی درآنحالیکہ ہندوستان میں سو یا ڈیڑھ سو پونڈ (وزنی) سے زیادہ نہیں نکلتی تھی۔ شمالی ہند میں ۱۸۳۳ء کے جدید بندوبست سے جس میں کاشتکاروں کو طویل المیعاد پٹے دئے گئے تھے کپاس کی کاشت میں بہت کچھ اضافہ ہوا تھا۔ ہندوستان میں بنولے نکالنے کی مشین رائج کرنا مناسب خیال کیا گیا تھا مگر امریکہ کی روئی سستے داموں ملتی تھی اس لئے مینچسٹر کے سوت کاتنے والے ہندوستان کی روئی کام میں لاتے تھے۔ ہندوستان کی روئی دو طریقوں سے انگلستان میں کام میں لائی جاتی تھی۔ ایک تو اس کے کپڑے بنے جاتے تھے دوسرے لحاف کی طرح ملبوسات میں وہ بھری جاتی تھی یعنی موسم سرما میں لوگ کوٹ کے استر میں روئی بھر کر پہنتے تھے۔ سال بسال انگریزی سوتی کپڑوں کی ہندوستان میں درآمد ترقی پر تھی اور ہندوستانی سوتی مصنوعات ایک ایک کر کے مفقود ہو رہے تھے۔

مینچسٹر کے ایوان تجارت کے میر مجلس مسمی ٹامس بیزلی نے ایک نقشہ پیش کیا تھا

جس میں امریکہ اور ہندوستان کی روئی کا انگلستان میں تناسب درآمد بتایا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جملہ برطانوی درآمد کے ساتھ ہندوستان کی روئی کا تناسب کم و بیش ۸ اور ۱۵ فی صدی کے درمیان تھا۔ ملکۂ وکٹوریہ کی تخت نشینی کی تاریخ سے دس سال کے اعداد ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

انگلستان - اسکاٹلنڈ اور آئرلنڈ میں روئی کی درآمد

سنہ عیسوی	ممالک متحدہ امریکہ سے	برطانوی مشرقی مقبوضات سے
	پونڈ (وزنی)	پونڈ (وزنی)
۱۸۳۷	۳۲۰۳۵۱۷۱۶	۵۱۵۸۷۱۴۱
۱۸۳۸	۴۳۱۴۳۷۸۸۸	۴۰۲۲۹۴۹۵
۱۸۳۹	۳۱۱۵۹۶۷۹۸	۴۷۱۷۰۶۴۰
۱۸۴۰	۴۸۷۸۵۶۵۰۴	۷۷۰۱۰۹۱۷
۱۸۴۱	۳۵۸۲۱۴۹۶۴	۹۷۳۶۸۳۱۲
۱۸۴۲	۴۰۵۳۲۵۶۰۰	۹۶۵۵۵۱۸۶
۱۸۴۳	۵۵۸۷۳۵۶۰۰	۶۸۸۲۰۵۷۰
۱۸۴۴	۵۱۷۲۱۸۶۲۲	۸۸۶۳۹۶۰۸
۱۸۴۵	۶۲۶۶۵۰۴۱۲	۵۸۴۳۷۴۲۶
۱۸۴۶	۳۸۲۵۲۶۰۰۰	۳۴۲۷۰۸۰۰

اسی گواہ نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ سوت کاتنے والے کو ایک پونڈ (وزنی) سورت کی روئی سے ۱۲ اونس دھاگا ہاتھ آتا تھا اگر ایک پونڈ (وزنی) امریکہ کی روئی سے ½۱۳ اونس تاگا نکلتا تھا۔ اسی لیے موخر الذکر کی قیمت ½۳ اور ۶ پنس کے

مابین تھی جب کہ ہندوستانی روئی کی قیمت ۳ اور ۵ پنس کے درمیان تھی۔
ٹامس بیزلی نے اپنی شہادت کے آخر میں ہندوستان اور انگلستان کے مابین تجارت کے بارے میں ایک انگریز کا کیا خیال ہو سکتا ہے اس کی چند الفاظ میں یوں توضیح کی تھی کہ "ہندوستان کی عملداری بہت وسیع ہے اور برطانوی مصنوعات کی ایک کثیر مقدار ہندوستان کی آبادی اپنے صرف میں لا سکتی ہے ہماری ہندوستانی تجارت کے متعلق صرف سوال یہی ہے کہ ہم جو بھی اپنے مصنوعات بھیجنے کے لئے تیار رہیں کیا وہ لوگ ان کی قیمت اپنی پیداوار اراضی سے ادا کرنے کے قابل رہیں؟"

رابرٹ کرافرڈ نامی ایک تاجر ساکن بمبئی نے اس صوبے کے چند مقامات میں روئی کی کاشت کس قدر ہوئی تھی اس کے متعلق ۱۸۳۴ء سے ۱۸۴۵ء تک ان بارہ سال کے اعداد پیش کیے تھے۔ بروچ میں روئی کی کاشت ان اراضی کی (جن پر مالگزاری مقرر تھی) جملہ کاشت کی ۳۴ فی صدی۔ سورت میں ۲۲ فی صدی۔ خاندیس میں ۱۰ فی صدی اور شولاپور میں ۲ فی صدی ہوئی تھی۔ گجرات میں مالگزاری کی نوعیت کے متعلق جب اس سے سوال کیا گیا تو اس گواہ نے یہ جواب دیا کہ "جب سرکار اور سرکاری عہدہ دار بالکل بجا طور پر اس بات کو قابل تعریف سمجھتے ہیں کہ حتی الامکان جس قدر محاصل ان کو مل سکتے ہیں اس قدر سب وصول کر لیں تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اراضی سخت سے سخت اور سنگین سے سنگین لگان پر ان کو دی جاتی ہے"
اور اس گواہ نے مسٹر ڈیوس کلکٹر بروچ کی رپورٹ سے ذیل کا اقتباس پڑھ کر سنایا۔
"بدنصیبی سے منڈی کی موجودہ حالت ایسی ہے کہ کاشتکار اپنے سرمایے کی تلافی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ منافع کی توقع کرے۔ لہٰذا اس سے یہ استنباط بالکل بدیہی ہے کہ کاشتکار تباہی سے بچنے کے لئے بالکلیہ معافیات یا پیداوار کی فاضلات پر انحصار کرتا ہے"

اسی گواہ نے "قوانین جہازرانی" کے برے اثرات کو جن کی رو سے جہازوں پر انگریز ملاحوں اور خلاصیوں کے سوا دوسری قوم کے افراد ملازم نہیں رکھے جا سکتے تھے اپنی شہادت میں بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ "مجھ کو معلوم ہے کہ بعض وقت ایسا بھی

ہوتا ہے جب بندرگاہ بمبئی کے کسی جہاز کے لیے یہی باعث سہولت تھا کہ وہ ہندوستانی خلاصیوں کے ساتھ اس ملک کو آئے بشرطیکہ اس کو بھی بحر و بندرگاہ میں وہی حقوق و مراعات حاصل رہیں جو ایک انگریزی جہاز کو حاصل ہیں۔"

ایک اور بہت ہی اہم گواہ میجر جنرل برگز تھا۔ ۱۸۱۲ء میں یہ کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوا تھا اور تینتیس ۳۳ سال تک ہندوستان میں کارگزار رہا تھا۔ سر جان میلکم اور ماونٹ اسٹوارٹ الفنسٹن کے سے اشخاص کے زیر حکم رہ چکا تھا اور میسور کا کمشنر اور ناگپور کا رزیڈنٹ بھی رہا تھا۔ اس نے "مالگزاری ہند" پر ایک نہایت قابل قدر اور مکمل کتاب لکھی تھی اور شمالی ہند کے بندوبست میں لارڈ ولیم بنٹنک کا مشیر بھی رہا تھا۔ تاریخ ہند کا مطالعہ اس نے اصل ماخذ ہی سے کیا تھا۔ اور تاریخ فرشتہ کا ایک ایسا عالمانہ ترجمہ کیا تھا جو آج تک مسلّمہ ہے۔

میجر جنرل برگز نے ہندوستان میں روئی کے صرف کثیر کا ذکر کیا اور کہا کہ "تمام دنیا کے صرف کے لئے روئی کافی مقدار میں پیدا کرنے کی" اس ملک میں صلاحیت ہے اس کے خیال میں انگلستان کو اور زیادہ مقدار میں روئی برآمد ہونے میں دو رکاوٹیں تھیں ایک تو محصول اراضی اور دوسرے حمل و نقل کے لئے سڑکوں کا نہ ہونا۔ مقدم الذکر موضوع پر اس سے سوال کیا گیا تو اس نے یہ جواب دیا کہ "ہندوستان کا محصول اراضی نیز تمام دیگر بلا واسطہ محصولات سب محصول آمدنی کے اصول ہی پر مبنی ہیں آمدنی کا ایک جز جنس کی شکل میں ہو کہ زر کی حسب معمول فرمان روا کا حق سمجھا جاتا ہے" اور ہندوؤں کے عہد حکمرانی میں یہ جز ابتداءً پیداوار کا عشر مقرر کر دیا گیا تھا۔"

شمالی ہند کا بندوبست جس کو لارڈ ولیم بنٹنک نے ۱۸۳۳ء میں شروع کیا تھا ایسا تھا کہ "رعایا کے ادارے اس سے محفوظ ہو گئے تھے اور اگر اس کو دوامی کر دیا جاتا تو اس سے سرکار اور کاشتکار دونوں کو فائدہ پہنچتا"۔ برخلاف اس کے مدراس کے بندوبست میں سر ٹامس منرو کے ۱۸۲۷ء میں تخفیف محصول کے بعد بھی حد سے زیادہ محصول تھا۔ سرکاری مطالبہ نہ تو پورا ادا کیا جا سکتا تھا اور نہ کیا جاتا تھا۔ کلکٹر کی قوت تمیزی پر اس بات کا انحصار تھا کہ وہ جو مناسب سمجھے وصول کرے۔

اور جب "اس طرح کلکٹر کی قوتِ تمیزی پر کس کا انحصار رہے تو اس کے یہ معنے ہوئے کہ ذیلی عہدہ داروں کے ایک انبوہ کثیر کی (جو ملک میں اس سرے سے اس سرے تک پھیلے ہوئے تھے) قوت تمیزی پر دراصل اس کا انحصار تھا" یعنے محصولِ اراضی کبھی پورا ادا نہیں کیا جاتا تھا۔ ہر سال معافیات ہوتے تھے اور کسانوں کی حالت تفلس و ناداری کی سی تنگی تھی"۔

جنرل برگز نے لگان بہ شکل غلہ لینے کی پُرزور سفارش کی یعنے محصول اراضی ہر سال اسی سال کی پیداوار پر مبنی ہو اور اس کی رائے یہ تھی کہ اس قاعدے کے تحت رعیت واری نظام کارآمد رہ سکتا ہے۔ "اور پیداوار کا ۵۰ فی صدی فاضلات پیداوار یا خالص پیداوار سے بشرطیکہ غلے کی شکل میں یہ وصول کیا جائے کچھ زیادہ نہیں ہے" "لیکن یہ محصول چونکہ بہ شکل زر وصول کیا جاتا ہے اس لئے اکثر اس کو جملہ پیداوار کے مساوی سمجھنا چاہیئے"۔

"ہاس ولیمس نے جو بمبئی کا کمشنر مالگزاری رہ چکا تھا انگریزوں کے نظام مالگزاری پر یہ سنگین ترین الزام لگایا تھا کہ صرف ایک شخص یعنے محصول اراضی معین کرنے والے کلکٹر کی مرضی اور رجحان طبع پر ساری قوم کی خوشحالی کا انحصار تھا اور اس نے کہا کہ "ضلع بھر کا خوشحالی صرف اس عہدہ دار کی ذاتی قابلیت پر منحصر تھی جس کے زیر انتظام یہ ضلع ہوتا تھا"۔ اضلاع کے کلکٹر ہمیشہ مکمل اور بامروت انسان نہیں ہوتے تھے چنانچہ زمانۂ حال تک گجرات پر نہایت سنگین محصول لگا دیا گیا تھا اور اراضی کی ترقی بالکل مسدود ہوگئی تھی۔ بروچ میں بہت بڑا بقایا قابل وصول تھا۔ معافیات محض ذاتیات اور عہدہ داروں کی مرضی پر موقوف تھے اور مالگزاری کی رقم مختلف قسم کی بدیانتیوں سے متاثر ہوتی تھی۔ رعایا عموماً نہایت ہی مفلس و بے مایہ ہوگئی تھی۔ ان کا زرعی سرمایہ بہت ہی کم رہ گیا تھا اور روئی کی پیداوار بھی کم ہوگئی تھی۔ "بے حساب محصول لگا دینے کے عام نتائج اور آثار یہ ہی تو ہیں"۔

جورج گبسن گجرات کا کلکٹر رہ چکا تھا اور سنہ ۱۸۲۶ء میں ہندوستان سے چلے جانے کے بعد سنہ ۱۸۴۰ء میں بہ حیثیت جوڈیشل کمشنر اس ملک کو واپس آیا تھا۔ چودہ (۱۴) سال منقضی ہونے کے بعد بھی اس نے لوگوں کی حالت میں کوئی اصلاح نہیں دیکھی

بلکہ اس کو یہی نظر آرہا تھا کہ "دولتمندوں پر زوال آگیا تھا" اور عام طور پر بہت زیادہ محصول لگا دیا گیا تھا۔" ان تمام مقامات میں جہاں میں بہ حیثیت کلکٹر رہ چکا ہوں رعیت کے لیے کچھ نہیں بچتا کہ پس انداز کیا جائے یا رعیت اصلدار بن جائے۔"

اس گواہ سے یہ پوچھا گیا کہ "کیا آپ ان مقاموں سے بھی واقف ہیں جہاں سنگین محصول لگا دینے سے بادی النظر میں کاشت کم ہوگئی ہے"؟ تو اس نے یہ جواب دیا کہ "میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھکو ایک بھی ایسا مقام معلوم ہے۔ جس مقام کو دیکھئے وہ ترقی کرنے کے بجائے جہاں تھا وہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ رعیت کو کچھ منافع بھی نہ ملے تو کاشت کرتے رہنے کے سوا ان کو چارہ ہی کیا ہے؟ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی تو پیری کے لیے کاشت کرنا ان کے لئے ضروری ہے وہ اپنے دیس یا گاؤں سے جس کے وہ باشندے ہیں ایسے وابستہ ہیں کہ ایک پائی کے فائدے کے بغیر وہ سرکاری لگان ادا کرنے ہر وقت تیار رہیں بشرطیکہ ان کو اتنا مقدور بھی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ کہیں بھی ترقی کے آثار نمایاں نہیں۔"

فرانسس کارنک براؤن کے والدین انگریز قوم کے تھے مگر اس کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی تھی اور اس کو بھی اپنے والد کی طرح ہندوستان کی سوتی صنعت و حرفت کا بہت بڑا تجربہ تھا۔ اس نے مجلس منتخبہ کے سامنے ایک ہندوستانی چرخہ پیش کیا اور یہ توضیح کی کہ صنعت گروں کے ہر چرخے۔ ہر گھر اور ہر دروازے پر نہایت ہی تکلیف دہ "محترفہ محصول" تھا اور اس کی وجہ سے ہندوستان میں بنولے نکالنے کی مشینیں رائج نہیں کی جا سکتی تھیں۔

فرانسس براؤن روئی کی کاشت کے ہندوستانی نظام کے متعلق بڑی اعلےٰ رائے رکھتا تھا چنانچہ اس نے یہ کہا تھا کہ ہندوستانیوں کو اس فن کے سکھانے کے لئے امریکہ سے نخلبندوں کو بلانا ایسا ہی تھا جیسے گیہوں کی کاشت انگریز زمینداروں کو سکھانے کے لئے بلجیم سے کاشت کاروں کو طلب کرنا۔ اس نے اپنی اس رائے کی تائید میں امریکہ کے ایک نخلبند مسمی مرسر کی شہادت پیش کی تھی جو روئی کی کاشت کو ترقی دینے کے لئے ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان مسٹر مرسر نے یہ بیان کیا تھا کہ "حکومت بمبئی کی گشتی مورخہ ۲۸ جنوری ۱۸۴۷ء سے ذیل کی عبارت نقل

کی گئی ہے)" سرکار نے تجربہ کی غرض سے روئی کی کاشت کے لئے اراضی اور عملہ کیا مختص کیا دراصل اپنا روپیہ رائگاں کیا امریکہ کا نظام ہندوستان کے مناسب حال نہیں ہے۔ اور خود دیسیوں کو ہندوستان کی آب وہوا اور زمین کی قوت نمو کے متعلق ایسے اچھے معلومات ہیں کہ وہ بمقابل کسی یورپی شخص کے زیادہ کفایت اور عمدگی کے ساتھ یہ کاشت خود کر سکتے ہیں۔"

تشخیص مالگزاری کے متعلق فرانسیس براؤن کی شہادت نہایت زوردار تھی مدراس میں کاشت کار کو "مالگزاری ادا کرنے کے بعد قوت بسری سے زیادہ کچھ نہیں بچتا تھا۔" ایسے لکھوکھا کاشت کار مدراس میں تھے جن کو سدرمق یا قوت بسری سے بڑھ کر کچھ نہیں ملتا تھا مقتضائے فطرت اور اسباب معیشت کی محتاجی سے ان کو مجبوراً کاشت کرنی پڑتی تھی اور جہاں وہ اپنے قدم گاڑتے تھے وہیں کے ہو جاتے تھے۔ اور سرکاری مالگزاری سے انہیں کہیں مفر ہی نہ تھا ان پر محصول اراضی اس قدر زیادہ لگادیا جاتا تھا کہ وہ کبھی پورا نہیں ادا کر سکتے تھے اس گواہ نے یہ بھی کہدیا کہ "مجھ کو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ دیسی لوگ ہمیشہ ایسی مخلوق متصور ہوتے ہیں جو صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطالبات ادا کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہو۔"

جب فرانسیس براؤن پر حکومت ہند کے خلاف ایسی نکتہ چینی کرنے کا الزام لگایا گیا۔ تو اس نے یہ جواب دیا کہ "میرا منشاء ایسٹ انڈیا کمپنی کو محض بدنام کرنا نہیں ہے مگر ملک کی حالت بھی تو دیکھئے اور میرا کہنا یہ ہے کہ ایک انگریز کی آنکھوں سے اور ایک انگریز ہی کے فہم وادراک اور ایمانداری کے ساتھ دیکھئے اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے بارے میں فیصلہ کیجئے ...... میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے ملیبار میں بچشم خود لوگوں کو مرتے دیکھا ہے اور حکومت کی زیر کارروائی ملک کو فلاکت میں گرفتار دیکھا ہے ...... عام طور پر ملک کی حکومت رعایا میں افلاس و ناداری و ذلت خواری ہی پھیلا رہی ہے۔"

امریکہ کے نظام اراضی کا جس کے تحت روئی کی کاشت پھیلائی جارہی تھی ہندوستان کے نظام اراضی کے ساتھ جس کے تحت روئی کی کاشت جس قدر برآمد کرنے کی غرض سے کی جاتی تھی گھٹ رہی تھی مقابلہ کرنے کے بعد اس گواہ نے کہا کہ

"امریکہ میں اراضی ڈالر کو ایک ایکڑ کے حساب سے فروخت کیجاتی ہے اور خریدنے والے کو ساتھ ہی ساتھ اراضی کے متعلق آئندہ کچھ دینے دلانے سے "معافی دوام" مل جاتی ہے اور اس کے بعد اس پر کسی قسم کی زیر باری عائد نہیں ہوتی دراصل روئی کی پیداوار کی وجوہ محرک بھی یہی تو ہیں لیکن ہندوستان کی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے یہاں حق مالکانہ ہے ہی نہیں اسی لئے کسی شخص کو اپنے فائدے کے لئے یہاں کاشت میں روپیہ لگانے اور حتی الامکان محنت و جانفشانی کرنے کی ترغیب نہیں ہوتی۔"

فرانسیس براون اس لئے بھی قابل ستائش ہے کہ یہ پہلا شخص تھا جس نے ہندوستان کے جنگلوں کے اتلاف کی بناء پر قلت بارش کے خطرے سے آگاہ کیا اس وقت اس بات کا کوئی سمجھنے والا نہ تھا اس لئے اس نے بیرن ہمبولٹ کی "آپنی کہانی" سے ذیل کا فقرہ پڑھکر سنایا "پہاڑوں کے دامن میں اور ان کی چوٹیوں پر جو درخت اُگتے ہیں ان کی بیخ کنی سے ہر ملک میں انسان آئندہ نسلوں کے لئے دو طرح کی آفتیں پیدا کرتا ہے ایک تو ہیزم سوختنی کی محتاجی اور دوسرے پانی کی قلت۔

ہندوستان کے قدیم ذرائع آبپاشی کے متعلق فرانسیس براون نے کہا کہ "تمام جنوبی ہند میں گنجم سے لیکر راس کامورن تک ایسے ایسے تالابوں کے نشان جگہ جگہ نظر آتے ہیں جنکے دیکھنے سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔" ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے سوائے تنجور کے جہاں آبپاشی کے مفید ترین نتائج ظہور پذیر ہوئے تھے کہیں بھی ان قابل قدر ذرائع آبپاشی کی نگہداشت نہیں کی میجر آرتھر کاٹن نے کمپنی کی حکومت کو متعدد بار ذرائع آبپاشی کی اہمیت سے آگاہ کیا تھا مگر محض بے سود اور فرانسیس براون کا خیال تھا کہ آبپاشی کے ذریعہ سے ہندوستان کا بہت سا حصہ مصر کی وادیٔ نیل کی طرح سرسبز و شاداب ہو سکتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظما و بلاشک و شبہ فرانسیس براؤن کو آگ لگانے والا نہ سہی تو ایک جوشیلا آدمی تو سمجھتے تھے لیکن نصف صدی سے زیادہ مدت کے بعد اب کوئی بھی اس شہادت کو پڑھ کر انکار نہیں کر سکتا کہ اس تیز نظر انگریز نے جس کی پیدائش اور تربیت ہندوستان ہی میں ہوئی تھی ان بعض بڑی بڑی خرابیوں کو اس وقت تاڑ لیا تھا جب کہ ہندوستان کے منتظمین مملکت ان کو محسوس نہیں کر سکتے تھے یا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ بھی قرین قیاس نہ تھا کہ ہندوستان کے سرکاری عہدہ دار فرانسیس براون کے سے شخص کی شہادت پر اعتراض کرنے کے بغیر خاموش

بیٹھے رہیں گے۔ مسٹر براؤن کی شہادت پیش ہونے کے تین ہی دن بعد راس منگل نے جو حکومت ہند کا معتمد مالگزاری رہ چکا تھا اور اس وقت پارلیمنٹ کا رکن اور سابق ایسٹ انڈیا کمپنی کا ناظم بھی تھا اظہار دینے کیلئے خود کو پیش کیا۔ اس زمانے میں غالباً انگلستان میں کوئی اور شخص ایسا نہ تھا جو کمپنی کے انتظام مالگزاری کی ایسی پیچ کر سکتا جیسی منگل کر سکتا تھا۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس کی شہادت پڑھے اور اس کے یقین کامل کے جذبے اور اظہار خیالات کی صفائی کو محسوس نہ کرے۔ مگر باایں ہمہ راس منگل ہندوستان کی مالگزاری کے صرف نظریہ کی پیچ کر سکا کیونکہ اس کی عملی خرابیوں سے درحقیقت اس سے زیادہ کوئی واقف نہ تھا۔

منگل نے بیان کیا کہ صوبہ بنگالہ میں جہاں دوامی بندوبست تھا زمیندار لوگ جو مالگزاری سرکار کو ادا کرتے تھے وہ اوسطاً ان کی جاگیروں کے لگان کی تقریباً نصف ہوتی تھی ان خطوں میں جہاں دوامی بندوبست نہ تھا سرکاری مطالبہ لگان کا ۷۵ فی فیصدی ہوتا تھا۔ مدراس میں رعیت ہی مالک اراضی بھی تھی اور سرکار کو براہ راست مالگزاری ادا کرتی تھی لیکن رعیت واری نظام میں خرابی یہ تھی کہ دوامی مداخلت اور ہر سال تشخیص لگان ہوتا تھا۔ اس سے رشوت ستانی، استحصال ناجائز اور ظلم کا ایک رستہ پڑ گیا تھا۔

شہادت دینے کے دوسرے روز راس منگل کی جان برائیٹ صدر نشین مجلس منتخبہ اور جورج ٹامسن رکن مجلس کے ساتھ بڑی بحث ہوئی جس کا یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

جورج ٹامسن۔ کیا آپ یہ ثابت کرنے کے لئے تیار ہیں کہ کسی حکومت کا خواہ وہ انگریزوں کی ہو یا کسی اور کی ہندوستان کی اراضی پر اگر سارے ہندوستان پر اسی حکومت کا تسلط مان لیا جائے تو مالکانہ حق رکھنے کا دعویٰ کرنا اخلاقی وجوہ سے بالکل درست ہے؟

راس منگل۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ سوال مالگزاری سے متعلق ہے۔ میں نے کبھی یہ نہ تو فرض کیا ہے اور نہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں حکومت ہی اراضی کی مالک تھی اور نہ میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ ہندوستان میں حکومت ہی اراضی کی مالک ہے۔

جورج ٹامسن۔ کیا دراصل یہ واقعہ نہیں کیونکہ ملک اس سرے سے اس سرے تک اراضی کے فطری لگان کے ۷۵ فی صدی کا مطالبہ حکومت اپنے اوپر فرض سمجھتی ہے۔

راس منگل۔ خارج از حافظ زمانے ہی سے لگان کا ایک حصہ سرکاری اغراض کیلئے حق سرکار سمجھا جاتا ہے۔

جان برائیٹ۔ کلکٹروں کے ذریعہ لگان وصول کرنے کے طریقے کے متعلق کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں

کہ بالفرض اراضی کے ایک مختص ٹکڑے کی پیداوار ۱۰۰ ر ہوتی ہو تو آیا کوئی معینہ تناسب ایسا ہے جس کے لحاظ سے کلکٹر بطور مالگزاری سرکار رقم کی ایک خاص مقدار مقرر کر دینے کا مجاز سمجھا جاتا ہے یا نہیں؟

راس منگل: میں نے اس سے پہلے مجلس کے سامنے اس کی توضیح کر دی ہے کہ چند سال سے پیداوار کے اصول پر بندوبست کرنا نہایت خطرناک ثابت ہو رہا ہے اسی لئے کلکٹروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ ہر موقع پر وہ لگان معلوم کرنے کی کوشش کریں اور بندوبست کے لئے اسی کو اپنا اصول قرار دیں۔

جان برائیٹ۔ اگر تشخیص مالگزاری ہر سال کی جاتی ہے جیسا کمپنی کی زیر حکومت ہندوستان کے بہت بڑے حصے میں ہوتا ہے تو پھر ایسی صورت میں کہ کاشتکار نے خود ترقی و اصلاح کی ہو کیا مالگزاری میں اضافہ اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ کاشت میں اور بھی ترقی و اصلاح ہو یا اس مقصد سے کہ ترقی و اصلاح کرنے کے لئے کاشتکار کی ہمت پست ہو جائے؟

راس منگل۔ بمقتضائے فطرت تو یہی ہے کہ اس سے پست ہمتی پیدا ہوگی میں بھی اس سالانہ تجدید بندوبست کے اسی قدر خلاف ہوں جس قدر معزز صدر نشین صاحب خود ہو سکتے ہیں۔

یہ رد و قدح اس لئے اہم ہے کہ اس سے ان اصول پر روشنی پڑتی ہے جن کو ۱۸۳۳ء ہی میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔

(۱) حکومت نے مالکِ اراضی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ زمیندار رعیت ہی مالکِ اراضی تسلیم کی جاتی تھی۔

(۲) حکومت صرف لگان کے ایک حصے کا بطور مالگزاری مطالبہ کرتی تھی۔

(۳) یہ حصہ معیّن نہ تھا۔ ان جاگیروں میں جہاں دوامی بندوبست ہو چکا تھا مطالبۂ سرکار لگان کا تقریباً ۵۰ فی صدی اور جہاں دوامی بندوبست نہیں ہوا تھا وہاں قریب قریب ۷۵ فی صدی ہوتا تھا۔

باقی باتوں میں راس منگل بھی جان اسٹوارٹ مل کا ہم خیال تھا یعنی ہندوستان کی مالگزاری جزوِ لگان ہونے کی وجہ سے پیداوار اراضی کی لاگت میں شامل نہ تھی اس لئے روئی کی کاشت کی یہ بالکل مانع نہ تھی۔

جان سیلون نے بھی جو مدراس میں ایک محکمے کا وزیر اور مجلس مالگزاری کا میر مجلس رہ چکا تھا ہندوستان کے نظام مالگزاری کی تائید کی مگر ہندوستان سے سالانہ جو معاشی سوتاؤ ہوتا تھا اس کا وہ شاکی تھا۔ "موجودہ نظام مالگزاری کے متعلق اہل ہند کو جو شکایت ہے وہ میرے خیال میں اس لئے نہیں ہے کہ مالگزاری کی رقم اس قدر زیادہ ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس رقم کا مصرف موجب تکلیف ہے۔ ان کے اپنے بادشاہوں

کے عہد حکومت میں ضمنا محاصل ملک سے وصول ہوتا تھا وہ سب کا سب ملک ہی میں صرف ہوتا تھا لیکن ہماری حکومت میں محاصل کا بہت بڑا حصہ بلا کسی معاوضے کے ہر سال ملک سے سوت لیا جاتا ہے۔ اور دولت کا یہ سوتا ساٹھ ستر سال سے جاری ہے اور بجائے گھٹنے کے بڑھتا ہی چلا جارہا ہے .... ہمارا نظام اسفنج کا کام کرتا ہے یعنے لب گنگا اچھی اچھی چیزیں پانی کی طرح چوس لیتا ہے اور اور بائے ٹمز پر پہنچکر پانی ہی کی طرح ان کو نچوڑ دیتا ہے ...... انکو (ہندوستان کے لوگوں کو) محصولات لگانے میں جن کے ادا کرنے کا ان سے مطالبہ ہوتا ہے رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہے ان کو قانون وضع کرنے میں بھی جس کی تعمیل ان پر فرض ہے رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ خود ان کے ملک کے نظم و نسق میں ان حقیقی طور پر شریک نہیں کیا جاتا اور ان سب حقوق سے ان کو اس ہتک آمیز و گستاخ حیلے سے محروم کردیا جاتا ہے کہ ایسے فرائض کی انجام دہی کے لئے ان کے دماغی اور اخلاقی قوٰی درست نہیں ہیں۔

باقی دوسرے گواہوں کی شہادت کم اہم ہے اس لئے یہاں اس کی تشریح غیر ضروری ہے۔ مجلس منتخبہ کے سامنے کس نوعیت کی شہادت پیش ہوئی تھی اس کے معلوم کرنے کے لئے یہاں تک جو کچھ قلمبند ہوا وہ کافی ہے۔ اس شہادت پر جان برائٹ اور اس کے رفقائے کار نے ۷ اجولائی ۱۸۴۸ء میں اپنی رپورٹ پیش کردی۔

اس رپورٹ میں انھوں نے بیان کیا تھا کہ ساٹھ سال تک یعنے ۱۷۸۸ء سے مجلس نظماء نے روئی کی کاشت پھیلانے اور اس کی برآمد میں اضافہ کرنے کے لئے ہندوستان میں مختلف تجربے کیے تھے۔ امریکہ سے مشینیں منگوائی تھیں۔ اور وہیں سے روئی کے کاشتکاروں کو بھی ہندوستان بھیجا تھا اور اسی غرض سے تجربے کے لئے کچھ اراضی بھی مختص کردی تھی۔ اب بھی نظماء کو یہی یقین تھا کہ ہندوستان میں روئی کی کاشت میں جو کچھ بھی رکاوٹیں ہیں وہ دور ہوسکتی ہیں۔

ان تجربات کے نتائج دیکھ کر مجلس منتخبہ کو اس بات کا اطمینان ہوگیا کہ ہندوستان ایک غیر محدود مدت تک بہت اچھے درجے کی روئی کی سربراہی کرسکتا ہے لیکن

اس مجلس کی رائے میں جو ذرائع کہ اختیار کیے گیے تھے اُن سے اس کام کے سرانجام کی توقع نہ تھی۔ امریکہ کی روئی جن کا تار لمبا ہوتا تھا ہندوستانی مصنوعات کے لئے ایسی موزوں نہ تھی جیسی خود ہندوستان کی روئی تھی اور غیر ممالک کے مطالبے کی ہر وقت کی کمی و بیشی ایک نئی قسم کی روئی کی کاشت کے لئے کوئی معقول وجہ نہیں سمجھی جاسکتی تھی بالخصوص جبکہ اس کا انشاد دور و دراز بدیسی منڈیوں کی سربراہی کرنا تھا۔

ہندوستان کے کاشتکاروں کی خستہ حالی پر بھی مجلسِ منتخبہ نے توجہ مبذول کی۔ مدراس اور بمبئی میں کثیر التعداد کاشتکاروں کے پاس "نہ کچھ سرمایہ نہ تھا اور نہ وہ ذرائع اُن کو حاصل تھے جو صرف سرمائے ہی سے حاصل ہوسکتے ہیں اور جن سے حرفت میں نئی نئی اصلاحیں کی جاسکتی ہیں اور اس کو ترقی دی جاسکتی ہے۔ درحقیقت کاشتکاروں کے اس طبقے کی بہت ہی بری حالت ہے۔"

اس سوال پر کہ کاشتکاروں کی خستہ حالی کس حد تک سرکار کے مطالبۂ مالگزاری کا نتیجہ ہے اختلافِ رائے تھا۔ ایک طرف تو یہ اصول پیش کیا گیا تھا کہ جب تک مطالبۂ سرکار معاشی لگان کے ایک جز تک محدود رہتا ہے اس وقت تک کاشتکاروں پر کوئی ایسا خراب اثر نہیں پڑتا جس سے ان کا افلاس بڑھے۔ دوسری طرف یہ شہادت پیش ہوئی تھی کہ انھیں مقامات کا انتظام عملی طور پر خراب تھا جن کی آبادی بہت بڑی تھی اور جو صرف ایک عہدہ دار کی زیر نگرانی تھے۔ اور یہ کہ ناعاقبت اندیشانہ جوشِ کارگزاری یا عدم کارگزاری یا سنگین غلطیوں ہی سے ان مقامات کی خوش حالی پر مضر اثر پڑا تھا اور یہ کہ "دراصل یہ نظام انتظامیہ زرعی آبادی کے لئے اصلاح کی امنگوں کا ناس کرنے والا نہیں تو کم سے کم ہمت پست کرنے والا تو ضرور تھا۔"

"مطالبہ سرکار میں اعتدال پیش نظر رکھنا اور رقم مالگزاری اور حقیت اراضی بالکل معیّن کر دینا" ان ہر دو اصول کو ہندوستان کے بندوبست اراضی کی بنیاد بنانے کی سفارش کی گئی تھی۔

آخر میں مجلسِ منتخبہ نے ہندوستان میں سڑکوں کی ضرورت اور ان کے نہ ہونے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور خود اس محکمے کی (جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ناظم

تھا) شہادت کا حوالہ دیا جس میں اس نے بیان کیا تھا کہ اندرونی ذرائع آمد و رفت کی اصلاح و ترقی کے لئے کس قدر کم کام ہوا تھا اور کس قدر باقی تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے گواہوں نے درآمد و برآمد کے مرکزوں سے اندرون ملک آمد و رفت کے لئے ریلیں بنانے کی بھی سفارش کی تھی۔

نواں باب

چائے ۔ نمک اور افیون

جان برائیٹ نے ۱۸۴۸ء میں رپورٹ پیش کردی ۔ اس کے پانچ سال بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا منشور تجدید کے لیے پیش ہوا اور حسب معمول دارلامرا اور دارالعوام دونوں کی مجالس منتخبہ نے ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۳ء میں کمپنی کے نظم ونسق ہند کی مکمل تحقیقات کی جب ہم کمپنی کے عام نظم ونسق سے بحث کریں گے اس وقت اس تحقیقات کا حوالہ بھی دیں گے ۔ سردست اس تحقیقات کے اثناء میں چائے ۔ نمک اور افیون کی پیداوار کے متعلق جن دلچسپ واقعات کا انکشاف ہوا تھا ان کو اس باب میں ہم بیان کرتے ہیں :۔

چائے

چائے کی کاشت پر اہم ترین شہادت " نباتی باغ " سہارنپور کے محافظ مسمی ڈاکٹر رائل کی تھی جس نے روئی کی مجلس منتخبہ کے سامنے بھی (جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے) شہادت دی تھی ۔ اس نے ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۲ء میں حکومت ہند کے پاس چائے کی کاشت کرنے کی سفارش کی تھی ۔ حکومت ہند نے ۱۸۳۵ء میں اس کاشت کی ابتدا کی

اور سب سے پہلے ۱۸۳۶ء میں چائے کی پتی بنائی گئی۔ اس گواہ کی شہادت کے وقت (۱۸۵۳ء) میں اہمالیہ کے شمالی مغربی حصے میں اور آسام میں بھی اس سرے اس سرے تک چائے کی کاشت بڑے پیمانہ پر ہو رہی تھی۔

اب تک تو ... ۱ پونڈ (وزنی) سے زیادہ چائے کو مائوں میں پیدا نہیں ہوئی تھی مگر کاشت پھیل رہی تھی کیونکہ وہ سب پہاڑی علاقہ جو سکم سے لیکر نیپال اور کومائوں ہوتے ہوئے وادی کنگڑا تک پھیلا ہوا تھا چائے کی کاشت کے لیے بہت موزوں تھا۔ ڈاکٹر جمسن نے جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی یہ کام لے رہی تھی اطلاع دی تھی کہ "جیسا وادی کنگڑا میں چائے کا پودا سرسبز و شاداب ہوتا ہے ویسا کسی اور زمین پر نہیں ہوتا ...... ہندوستانی عموماً چائے استعمال نہیں کرتے"۔

حکومت ہند نے آسام میں چائے کی کاشت کا سب کاروبار ایک کمپنی کے تفویض کر دیا تھا ایک اور کمپنی کو مائوں میں چائے کی تمام کاشت حکومت سے خرید لینے کی تجویز کر رہی تھی۔

نمک

ہندوستان میں کمپنی کے ذرائع آمدنی میں نمک اور افیون کا اجارہ کچھ کم اہم نہ تھا۔ کمپنی کے کارپرداز اور گماشتے بنگالے میں نمک بناتے اور فروخت کے لئے منڈی میں بھیجنے سے پہلے اس کی اصل لاگت پر ۵ شلنگ فی من (۸۲ سیر) محصول لگا دیتے تھے پنجاب کی کانوں سے جو نمک نکلتا تھا اس پر ۲ شلنگ فی من محصول لیا جاتا تھا اور دیسی ریاستوں میں جو نمک بنتا تھا اس پر انگریزی عملداری میں داخل ہونے کے وقت ۲ یا ۵ شلنگ محصول وصول کیا جاتا تھا۔

مدراس میں دریا کے کنارے ایک مقام پر آب شور جمع کر کے تمازت آفتاب سے بخارات بنکر اڑ جانے کے لئے اس کو یونہیں چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس طرح جو نمک بنتا تھا وہ بنگالی نمک سے سستا بھی ہوتا تھا اور فی من ۲ شلنگ کے حساب سے اس کو بیچنے سے کمپنی کو خوب آمدنی بھی ہوتی تھی۔ بمبئی میں فی من ڈیڑھ شلنگ محصول ادا کرنے

پر نمک سازوں کو خاص قسم کے اُتھلے برتنوں میں سے جس میں وہ بنتا تھا نمک نکال لینے کی سرکار اجازت دیتی تھی۔ انگلستان یا دوسرے ممالک سے ہندوستان کو جو نمک آتا تھا اس پر فی من ۵ یا ۶ شلنگ محصول لیا جاتا تھا تاکہ بازار میں اس کی قیمت ہندوستانی نمک کی قیمت سے جس پر محصول تھا کم ہونے پائے۔

نمک سازی سے کمپنی کو جو ۱۷۹۳ء میں ۸۰۰۰۰ پونڈ خالص آمدنی ہوئی تھی وہ بڑھکر ۱۸۴۴ء میں ۱۳۰۰۰۰۰ پونڈ ہوگئی تھی اور اِس باون (۵۲) سال کی مدت میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جس قدر نمک بنایا تھا اس کا تخمینہ بیس کروڑ من سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اور اس نمک سے جس قدر آمدنی ہوئی تھی اس کا اندازہ چھ کروڑ پونڈ انگلیسیہ کیا جاتا ہے۔

مذکورالصدر بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جس قدر نمک کمپنی خود بناتی تھی، اور جس قدر برطانیۂ عظمیٰ سے ہندوستان میں درآمد کرتی تھی، ان دونوں میں ایک توازن قائم رکھنے کی وہ کوشش کر رہی تھی۔ اس حکمت عملی کی بانی دراصل دارالعوام کی مجلس منتخبہ تھی، جس نے ۱۸۳۶ء میں اس طرح عمل کرنے کی تجویز منظور کی تھی اور کمپنی فقط اسی حکم کی تعمیل کر رہی تھی لیکن اس اصول پر عمل کرنے میں کمپنی نے اس حکم سے بطور خود کسی قدر تجاوز بھی کیا تھا جس سے برطانوی نمک سازوں کو ناجائز گر مفید مطلب موقع ہاتھ آگیا تھا کیونکہ کمپنی نے اصل لاگت میں محاصل کی وصولیابی اور تیاری کے مصارف بھی لگادیے تھے اور اس طرح بنگالی نمک کی قیمت فروخت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس سنگین غلطی سے برطانی نمک سازوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور برطانوی نمک کی فروخت دن دونی رات چوگنی ہونے لگی۔ دوگواہوں نے جن کو ہندوستان میں برطانوی نمک کی فروخت سے خاص دلچسپی تھی مجلس منتخبہ کے سامنے ذیل کے اعداد پیش کیے تھے:۔

برطانوی نمک جس کی درآمد کلکتے میں تھی

۱۸۴۵-۱۸۴۶ء	۱۸۴۶-۱۸۴۷ء	۱۸۴۷-۱۸۴۸ء	۱۸۴۸-۱۸۴۹ء	۱۸۴۹-۱۸۵۰ء	۱۸۵۰-۱۸۵۱ء	۱۸۵۱-۱۸۵۲ء

من ۱۴ سیر	من ۱۴ سیر	من ۱۴ سیر	من ۱۴ سیر	من ۱۴ سیر	من ۱۴ سیر	من ۱۴ سیر
۵۰۲۱۶	۳۵۲۸۲۵	۷۵۲۹۹۸	۴۵۹۸۰۳	۶۹۴۴۴۷	۱۰۱۲۶۹۸	۱۸۵۰۷۶۲

برطانوی نمک جس کو ہندوستان ارسال کیا گیا تھا

سنہ ۱۸۴۷ء	سنہ ۱۸۴۸ء	سنہ ۱۸۴۹ء	سنہ ۱۸۵۰ء	سنہ ۱۸۵۱ء
ٹن	ٹن	ٹن	ٹن	ٹن
۲۵۷۵۴	۱۵۵۰۷	۲۷۶۴۰	۳۶۲۴۱	۶۱۷۱۱

برطانوی نمک کی درآمد میں اتنا بڑا اضافہ جو ہوا تو بنگالے کی مجلس مالگزاری پریشان ہوگئی اور اس نے ایک طول طویل مگر نہایت ہی سنجیدہ مراسلہ لکھا جس میں بنگالی نمک کی اصلی لاگت میں مختلف مصارف شامل کر کے جو درحقیقت لاگت کے جزو نہ تھے اس کی قیمت میں اضافہ کرنے کی نا واجبیت بتائی تھی۔

ہندوستان کے گورنر جنرل وقت لارڈ ڈلہوزی نے اپنی یادداشت میں اس اہم معاملے پر جو کچھ لکھا تھا اس سے ذیل کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"میری ناچیز رائے میں مجلس مالگزاری کے نمایندے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ نظام کے تحت نمک درآمد کنندہ کے حق میں کوئی ناانصافی نہیں ہوتی بلکہ دراصل دیسی نمک سازوں ہی کے حق میں بہت بڑی اور روز افزوں ناانصافی ہو رہی ہے"

اس کا سیدھا سادہ نتیجہ یہ ہے کہ اس دیس کے نمک کے ساتھ برطانیہ کے ساختہ نمک کا مقابلہ ایسا کامیاب رہا ہے کہ دیسی نمک اب منڈیوں میں کم آنے لگا برخلاف اس کے اگر دیسی نمک کی قیمت فروخت بھی اسی قدر رہے جس قدر دیسی تاجروں کے ہاتھ میں

تعین قیمت رہنے پر ہوتی تو پھر دیسی نمک بھی برطانوی نمک کا ایک طرح مدمقابل بن سکتا تھا۔"

"میری رائے میں حکومت کو اپنی غلطی کے اعتراف میں اس قدر شرمانا نہیں چاہیئے جس قدر اس ناانصافی کو دور کرنے میں اس خیال سے ذرا بھی پس وپیش کرتے ہیں کہ کہیں اس طرح غلطی کرنے کی وجہ سے کلنگ کا ٹیکا ان کے ماتھے نہ لگ جائے۔"

"یہ ممکن ہے کہ نئی قیمت مقرر کرنے کے بعد بھی دیسی نمک کا بازاروں میں بکنا اس لئے بند ہو جائے کہ بدیسی نمک کو دوسرے اشیائے درآمد پر تجارتی برتری حاصل ہے۔ اگر تجربے سے یہی ثابت ہو جائے تو پھر حکومت کو اس صورتِ حال پر مکرر غور کرنا ہوگا لیکن اس وقت حکومت کا فریضہ کیا ہے وہ تو بالکل عیاں ہے۔"

"اتنا بڑا تغیر معزز مجلس نظماء کی اطلاع کے بغیر قوت سے فعل میں لانا نامناسب ہوگا۔ اس لئے آیندہ ڈاک سے انھیں اطلاع کر دی جائے اور چونکہ یہ معاملہ اشد ضروری ہے اس بنا پر جلد سے جلد جواب دینے کی ان سے استدعا کی جائے۔"

چنانچہ مجلس نظماء کو ہندوستانی نمک کے بارے میں جو ناانصافی ہوئی تھی وہ سب کچھ لکھ دیا گیا اور اس کے تدارک کی منظوری ان سے طلب کی گئی۔

جب ہندوستان کے حکام ہندوستانی نمک کی اصل لاگت کچھ ایسی مقرر کر دینے کی کوشش کر رہے تھے جس سے ہندوستانی نمک واجبی طور پر بدیسی نمک کا مقابلہ کر سکے تو اس وقت برطانوی نمک کے درآمد کرنے والے بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار نہیں بیٹھے تھے۔ برطانوی نمک سازوں نے یہ احسان جتا کر کہ اپنا بہتر نمک اہل ہند کو کھلانے کی انھیں آرزو ہے نمک پر محصول درآمد ہی ہندوستان میں اٹھا دینے کی دارالعوام کے پاس درخواست پیش کی تھی اور یہ بھی توقع ظاہر کی تھی کہ اگر یہ طریقہ اختیار کر لیا جائے تو پھر ہندوستان کے کثیف اور گندہ نمک کا بازاروں میں بکنا بند ہو جائے گا اور ہندوستان کی کل آبادی برطانوی نمک ہی استعمال کرنے لگے گی۔

شہر مینچسٹر کے تاجروں، نمک سازوں اور بیوپاریوں کی رائے یہ تھی کہ "ہندوستان کی کثیر آبادی کے لئے ایک واجبی قیمت پر عمدہ نمک کا ہمیشہ دستیاب ہونا انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔"

ہندوستان میں نمک کی درآمد پر فی ٹن ۲ پونڈ محصول تھا اور یہ اصل لاگت سے ۲۰۰۰ فی صدی زیادہ اور "ہندوستان کے حق میں سراسر ظلم تھا"۔ اسی بنا پر یہ استدعا کی گئی تھی کہ برطانوی نمک بلا محصول ہندوستان میں درآمد کرنے کی اجازت دی جائے یا اس پر محصول لینا ہی منظور ہو تو وہ برائے نام لیا جائے۔

نارتھوچ علاقہ چیسٹر کے باشندوں نے بیان کیا تھا کہ چیسٹر کے ان اضلاع میں جہاں نمک سازی ہوتی تھی سالانہ ۶۰۰۰۰۰ ٹن نمک بنتا تھا اور اس میں ۵۰۰۰ انگریز روزی پر لگے ہوئے تھے اگر ہندوستان میں برطانوی نمک پر بھی وہی محصول لیا جائے جو دوسری چیزوں پر تھا تو ہندوستان کے صرف کیلئے چیسٹر سے بھی ایک خاص مقدار میں ایسا نمک بھیجا جاسکتا تھا "جو غیر مخلوط اور صاف ستھرا ہو۔ کافی مقدار میں ہمیشہ برابر ملتا رہے اور قیمت میں بھی کم ہو"۔

ڈرائیٹیچ کے باشندوں نے شکایت کی کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمک بنانا "قانون ۳ و ۴ عہد ولیم رابع باب ۸۵ کی بدیہی خلاف ورزی اور عدول حکمی تھی کیونکہ اس قانون کی رو سے کمپنی پر سب تجارتی کاروبار بند کر دینا لازمی تھا۔ مزید یہ کہ ہندوستان میں نمک کی درآمد پر ۲ پونڈ محصول عائد ہونے کی وجہ سے ۵۰۰۰ ٹن سے بڑھکر اس کی سالانہ درآمد نہ تھی حالانکہ یہی نمک ہندوستان میں ۸۰۰۰۰ ٹن سے بھی زیادہ مقدار میں صرف ہونا چاہیے اور یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا فریضہ تھا کہ "وہ برطانوی تاجروں کو ایسی تجارت کے فوائد سے محروم کرنے کے بغیر جس پر اُن کو سب پر مقدم ایک فطری حق حاصل تھا" اپنے محاصل وصول کرے۔

ووسٹر کے علاقے میں ووچ (جس کا دوسرا نام ڈرائیٹیچ بھی تھا) واقع تھا جس کے میر بلدیہ شہر کائے میر بلد اور ممتاز شہریوں نے شکایت کی تھی کہ فی ٹن ۲ پونڈ محصول کثیر لگا کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے "برطانوی نمک کا ہندوستان کی منڈیوں میں آنا بند کر دیا تھا"۔

شہر گلوسٹر کے ایوان تجارت نے بھی یہی شکایت کی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمک بنانا "قانون ۳ و ۴ عہد ولیم رابع باب ۸۵ کی بدیہی خلاف ورزی اور عدول حکمی تھی" اور برطانوی تاجروں کو "ایسی تجارت کے فوائد سے جس پر ان کو سب پر

مقدم ایک فطری حق حاصل تھا محروم کر دینے پر" سخت اعتراض کیا تھا۔

سینٹ ہیلینز کے تاجروں صنعت گروں اور بیوپاریوں کی رائے یہ تھی کہ عمدہ نمک کی قیمت اور اسکا وافر مقدار میں ملنا" اہل ہند کی فلاح و بہبود کے لئے بے انتہا اہمیت رکھتا تھا" نیز یہ کہ ہندوستانی نمک خراب بھی تھا اور گراں بھی۔ اور یہ کہ "انگلستان کا ساختہ نمک ہندوستان میں اگر بلا محصول درآمد ہو یا کم سے کم دوسری اشیاء کی طرح اس پر محصول بحساب قیمت لیا جائے مگر باقی سب محصولات ملکی پیداوار معاف ہوں تو پھر اُس ملک کی ضروریں پوری کرنے کے لئے معقول مقدار میں نمک بھیجا جا سکتا ہے"

ونسفرڈ (جو چیسٹر کے علاقے میں واقع ہے) کے باشندوں نے بھی ایک مختصر پیش کیا تھا جس میں نارتھوچ کے لوگوں کی درخواست سے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے لفظاً بہ لفظ اُن کو اتفاق تھا۔

ووسٹر کے ایوان تجارت نے شکایت کی تھی کہ ووسٹر کے لازوال قدرتی چشموں کے پانی سے نمک کا بننا اس لئے کم ہو گیا تھا کہ اس نمک کی درآمد کے لئے ہندوستان کی سب بندرگاہیں بند تھیں۔ "ایک سنجیدہ اور انسانیت پر مبنی حکمت عملی یہ تھی کہ صرف آمدنی کی غرض سے ایک واجبی محصول لینے کے بعد بلا مزاحمت مزید نمک کی درآمد کرنے کے لئے ہماری حوصلہ افزائی کی جائے برخلاف اس کے حکومت ہند نے اپنے خراب نمک کا اجارہ محفوظ رکھنے کی غرض سے ایسے قیود عائد کیے ہیں جن سے معتبر قانونی مشورے کے موافق سائلوں کی نظروں میں قانون ۳ و ۴ عہد ولیم رابع باب ۸۵ کی صریح خلاف ورزی ہوتی ہے"

برسٹل کے ایوان تجارت نے نمک پر محصول عائد ہونے سے ہندوستان میں جو تکلیف لوگوں کو محسوس ہو رہی تھی اس کے متعلق بہت اچھے استدلال کے ساتھ ایک زوردار درخواست پیش کی تھی " ہندوستان میں نمک کی قیمت فی ٹن ۲۱ پونڈ ہے درانحالیکہ انگلستان میں وہی نمک ۳۰ شلنگ فی ٹن بکتا ہے۔ جبکہ خود انگلستان میں محصول نمک کا موقوف کر دینا ضروری خیال کیا جاتا ہے تو چہ جائیکہ ہندوستان میں جہاں ملکہ معظمہ کی لکھوکھا رعایا انگریزوں سے بڑھ کر اس بات کی مستحق ہے

کیونکہ ایک طرف تو ان پر افلاس طاری ہے اور دوسری طرف نمک، روزانہ استعمال کے علاوہ ایسی آب و ہوا میں امراض کی روک تھام کے لیے بھی نہایت ضروری ہے"۔

لورپول کے تاجروں ۔ مالکان جہاز اور بیوپاریوں کی رائے یہ تھی کہ "حکومت کا نہایت اہم اور متبرک فریضہ یہ ہے کہ ہندوستان کی رعایا کے نشو و نما میں وہی احتیاط پیش نظر رکھے جو اس ملک کے لوگوں کے نشو و نما میں پیش نظر ہے اور ہونی چاہیے"۔ اور انھوں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا تھا کہ "برطانوی ہند میں نمک پر محصول اٹھا دینے سے نہ صرف وہاں کی رعایا کے حال پر بڑا اکرام ہوگا کیوں کہ انصاف اور انسانی ہمدردی کے نقطۂ نظر سے وہ اس کی مستحق بھی ہے بلکہ اس سے عام طور پر اس ملک سے تجارتی تعلقات بھی زیادہ اچھے اور مستحکم ہو جائیں گے اور خصوصاً انگلستان کے سوتی مصنوعات وغیرہ کی مانگ بھی وہاں زیادہ ہو جائے گی"۔

مذکورالصدر اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے تاجر اور نمک ساز دونوں اس موقع پر زیادہ تر مفاد ذاتی ہی کے لیے اس تحریک میں شریک ہوئے تھے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اس موقع پر ان کے اغراض محصول ادا کنندگان ہند کے اغراض سے علیحدہ نہیں ہیں۔ ہندوستان کے لئے بڑی مسرت کی بات ہوتی اگر اس عام التدعا کی شنوائی ہوتی اور ہندوستانی اور انگریزی نمک دونوں پر ہندوستان میں محصول اٹھا دیا جاتا مگر یہ بھی یاد رہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کا نتیجہ غالباً انگلستان کے نمک سازوں کی توقعات کے خلاف ہی نکلتا۔

ہندوستان میں نمک پر محصول وصول کرنے کے لیے کیا کارروائی کی جاتی تھی اس کے متعلق دارالعوام کی مجلس منتخبہ کے سامنے بہت کچھ شہادت پیش ہوئی مدراس کے حالات انجمن اہل مدراس کی درخواست سے جس پر ڈی۔ راماسوامی وغیرہ کے دستخط تھے خوب ظاہر ہوتے ہیں۔

"یہ کہ سنہ ۱۸۰۵ء میں نمک کے انتظام اور نگرانی کے لئے سرکار نے ایک محکمہ قائم کیا تھا جس کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ نمک کی قیمت دوچند ہو گئی یعنی اس وقت ۷۰ روپئے (۷ پونڈ) فی گارس مقرر کر دی گئی اور اس حساب سے بعد کے تین[۲] سال کی مدت

میں نمک کا اوسط صرف ۳۱۶۰۰۵ گارس ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۰۹ء میں پھر قیمت ۰۷ روپے سے ۵۰۱ روپے (۰ا پونڈ ۰ا شلنگ) فی گارس کر دی گئی اور یہ حکومت کے اجارۂ نمک لینے کے قبل کی قیمت سے سہ چند زیادہ تھی لیکن قیمت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے چونکہ نمک کا صرف کم ہو گیا تھا اس لئے سنہ ۱۸۲۰ء میں نمک کی قیمت پھر ۰۷ روپے (۷ پونڈ) فی گارس کر دی گئی۔ مگر آٹھ سال تک مسلسل یہی قیمت رہنے کے بعد پھر ۱۰۵ روپئے (۱۰ پونڈ ۱۰ شلنگ) مقرر کر دی گئی اور سنہ ۱۸۴۴ء میں بڑھا کر اس کو ۱۰۰ روپے (۱۰ پونڈ) کر دیا گیا تھا مگر پھر گھٹا کر ۱۲۰ روپے اور حیلہ فروش تو اس پر اپنا منافع لگا کر اور زیادہ قیمت پر نمک بیچتے ہیں تاکہ صارف کی جیب ہی سے یہ سب کچھ ادا ہو۔"

"اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یا تو لوگ نمک کے بغیر ہی گزارتے ہیں یا اس کے بجائے نمک سازی کے مقام کی آب و شور سے تر معمولی مٹی جن میں نمک کے ریزے ملے ہوئے ہوتے ہیں بلا خوف سزا یابی استعمال کرتے ہیں جن سے ان کی صحت پر مضر اثر پڑتا ہے۔ اجارے کے نمک کے سوا کوئی اور نمک چوری چھپے سے لینا ممنوع ہے اور خلاف ورزی حکم پر کلکٹر یا تحصیلدار حسب صوابدید ملزم کو سزائے تازیانہ دینے کا مجاز ہے۔"

اس طرح نمک کی کارروائیوں میں جو سختی کی جاتی تھی اس کا پورا پورا انکشاف کلکتے کی انجمن برطانوی ہند کی درخواست سے بھی جس پر راجہ رادھا کنٹ دیب بہادر وغیرہ کے دستخط ثبت تھے ہوتا ہے۔

"سرکار اپنی مرضی کے موافق نمک کی قیمت فروخت کا تعین کر دیتی ہے اور ہر وقت یہ قیمت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ملک میں نمک سازی کا سب کچھ سامان رہنے کے باوجود انگریز تاجروں کے لئے برطانوی نمک کی درآمد نفع بخش ہوتی ہے نمک کی گرانی کی وجہ سے وہ لوگ تک جو نمک سازی کے مرکز کے پاس ہی رہتے ہیں نمک خرید نہیں سکتے بلکہ نمک جہاں بنتا ہے وہاں کی اوپر اوپر کی مٹی کی پرت لیکر استعمال کرتے ہیں اور جو لوگ ملک کے اندرونی حصے میں بود و باش رکھتے ہیں وہ تو صرف ترکاریاں وغیرہ جلا کر ان کی راکھ کا کھار اس کام میں لاتے ہیں۔ عدل و انصاف اور حکمت عملی کے اصول کے خلاف محکمۂ نمک کے عہدہ داروں

کو عدالتی اختیارات بھی عطا ہوئے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ حکام اختیارات حاصلہ کے استعمال میں اگر بے ضابطگیاں نہ کریں اور لوگوں کو تکلیف نہ دیں تو کیا تعجب ہے۔ ذیلی عہدہ داروں کو بھی اس حیلے سے کہ محصول ادا کیے بغیر مال چھپا کر لانے کا انسداد کیا جائے ہر وقت نمک کے باربرداروں اور شورہ صاف کرنے والوں کو ستانے کا موقع مل جاتا ہے۔ سائلوں کی رائے یہ ہے کہ اس محکمے میں اور ضروری اصلاحوں کے علاوہ یہ اصلاح بھی حکومت کو کرنا مناسب ہے کہ اگر حکومت اس نامقبول ذریعۂ آمدنی سے فوراً دست بردار ہونا نہیں پسند کرتی تو اس کو چاہیئے کہ کم سے کم نمک پر ایک مستقل اور غیر تغیر پذیر شرح محصول مقرر کر دے مثلاً ۱۰۰ من (۴۱۰۰ سیر) پر ۲۰۰ روپے (۲۰ پونڈ) جس سے نہ صرف غربا کو بڑا فائدہ پہنچے گا بلکہ خود قانون سے بھی محصول اندرون ملک وصول کرنے والوں کی ایک طرح کی عدالتی بے ضابطگی ہٹ جائے گی اور نمک کی چوکیوں کے ذیلی عہدہ داروں کا نمک کے بیوپاریوں کو ستانا بند ہو جائے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نمک بھی ضروریاتِ زندگی میں داخل ہے اس لئے جس قدر جلد ممکن ہو اس پر محصول بالکل اٹھا دینا چاہیئے۔"

بمبئی کے کاشتکاروں نے حکومت بمبئی کی خدمت میں محصول نمک کے ظلم و تشدد کے خلاف ۲۶ نومبر ۱۸۵۲ء میں ایک درخواست پیش کی۔ اس کے بعد کے دار العوام کی مجلس منتخبہ نے رستم جی ویکاجی کی شہادت قلمبند کی۔ اس گواہ نے مذکور الصدر درخواست کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا جس میں درخواست گزاروں نے بیان کیا تھا کہ ان کے کھیتوں کی پیداوار سال میں آٹھ ماہ کے لئے ان کو کفاف کرتی تھی۔ باقی چار مہینوں کے لئے ترکاریوں پر ان کی گزر اوقات تھی جس میں وہ نمک مرچ ڈال کر پکا لیتے تھے بشرطیکہ نمک پر محصول نہ ہو اور محصول ہو تو پھر اپنے ذائقہ کی اتنی معمولی چیز کو بھی خریدنے کا ان کو مقدور نہ تھا۔"

متعدد ممتاز و تجربہ کار عہدہ داروں نے جو پُر زور شہادت دی تھی وہ اس شہادت سے جو بنگالے۔ مدراس اور بمبئی کے باشندوں نے دی تھی کسی حال کم نہ تھی۔

رابرٹ برڈ سے جس نے تیس[۳۰] سال تک عدالت اور مالگزاری کے سررشتہ جات

میں خدمت انجام دی تھی جب محصول نمک کے متعلق پوچھا گیا کہ کیا وہ ایسا ہی زحمت دہ ہے جیسا بیان کیا جاتا ہے تو اس نے حسب ذیل جواب دیا۔

"مجھکو معلوم نہیں کہ اس کے متعلق کیا کہا گیا ہے مگر اس میں تو شک نہیں کہ یہ محصول نہایت سنگین ہے اور نمک کی اصلی لاگت پر تقریباً ۳۰۰ یا ۴۰۰ فی صدی ہوتا ہے لیکن صرف سرحد پر یہ وصول کیا جاتا ہے۔ جس زمانے میں لارڈ آکلینڈ ممالک مغربی میں اپنی حسب عادت ان کارروائیوں میں جن میں مصروف تھا مجھ سے تبادلۂ خیالات کرنے آئے تھے تو انھوں نے اس محصول کے متعلق بھی گفتگو کی تھی اور یہ کہا تھا کہ اس سے لوگوں پر بہت کچھ سختی ہوتی ہے بالخصوص نمک کے لئے سرحد پر ڈولیوں اور میانوں کی جن میں مستورات ہوتی تھیں تلاشی لینے سے حکومت پر برا اثر پڑتا ہے اور بدنامی اس کے سوا ہوتی ہے ...... میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر تلاشی لینا موقوف کر دیا جائے تو پھر دوسری ملکوں کے مقابل ممالک مغربی میں بہت سی لوٹ کی بوریاں آنے لگیں گی یعنے ہر زنانی میانے میں نیچے سے اوپر تک نمک بھرا ہوا ہوگا"

فریڈرک ہیلی ڈے نے جو حکومت ہند کے محکمۂ داخلہ کا معتمد اور اس کے چند ہی دنوں کے بعد بنگالے کا لفٹننٹ گورنر مقرر ہوا تھا اس تمام رشوت ستانی اور استحصال ناجائز کی تفصیل بیان کر دی تھی جو ہندوستان میں کمپنی کے نمک کے اجارہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ اگر یہ اجارہ اٹھا لیا جائے اور اہل ہند کو نمک بنانے کی اجازت دیدی جائے تو پھر ہندوستان میں درآمد نمک کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔

"بنگالے میں سرکار جو نمک بناتی ہے اس کی موجودہ قیمت بازار میں خریدنے والوں کے لئے اتنی گراں اس وجہ سے ہے کہ نمک سازی میں کفایت سے کام لینا تو کجا بے انتہا فضول خرچی کی جاتی ہے جو ایک سرکاری نظام نمک سازی میں لازمی ہے اور رشوت ستانی و استحصال ناجائز اور خورد برد ہوتی رہتی ہے۔ جس کا ایسے نظام میں ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں سارا کاروبار رہنے سے وقوع پذیر ہونا بھی لازمی ہے۔ ان حالات میں باخبر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اگر سرکار یہ محصول اٹھا دے اور کوئی دوسرا محصول کہیں کے نمک پر بھی نہ لگائے تو بھی بنگالی نمک ساز

در آمد شدہ نمک کی بہ نسبت اتنے کم داموں اپنا نمک فورا بیچ سکتے ہیں کہ آیندہ بنگالے میں باہر سے نمک کا ایک ریزہ بھی در آمد نہیں ہو سکتا۔"

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ محصول نمک کے خلاف جتنی درخواستیں گزریں اور کھلبلی مچی وہ سب ناکام ثابت ہوئی کیونکہ سرکار کو محاصل نمک سے دست بردار ہونا کسی حال منظور نہ تھا۔

افیون

نمک کے علاوہ صرف ایک ہی چیز میں کمپنی کا اجارہ باقی رہ گیا تھا اور وہ افیون تھی اس سے محاصل پیدا کرنے کے طریقے کی توضیح اف۔ ڈبلیو پریدو نے جو محکمۂ ہند کے صیغہ تنقیح مراسلات میں ایک مددگار تھا مجلس منتخبہ کے سامنے اپنی شہادت میں کی تھی۔

بنگالے میں خشخاش کی کاشت قطعی ممنوع تھی بجز اس صورت کے کہ خشخاش کا عرق صرف سرکار کو بیچنے کا منشا ہو جن کاشتکاروں کو خشخاش بونے کی خواہش ہوتی تھی اُن کو اس شرط پر اجازت دی جاتی تھی کہ وہ ایک مقررہ قیمت پر اس کا عرق صرف سرکار کو فروخت کریں۔ اس کے بعد یہ عرق پٹنہ اور بنارس کے دو اہم کارخانوں کو بھیجدیا جاتا تھا جہاں اس سے افیون بنائی جاتی تھی اور یہ افیون کلکتہ بھیجدی جاتی تھی۔ کلکتے میں یہ نیلام ہوتی تھی اور سرکار کو اس سے منافع ملتا تھا جس کی نوعیت یہ تھی کہ اصل لاگت میں اور افیون چین بھیجنے والے تاجر نیلام میں جو اس کی قیمت دیتے تھے اس میں جو تفاوت ہوتا تھا بس وہی منافع تھا۔

بمبئی میں نہ تو خشخاش کی کاشت تھی اور نہ افیون بنائی جاتی تھی۔ مالوے کی دیسی ریاست میں جو افیون بنتی تھی اس سے کمپنی کو اس مد کے تحت آمدنی ہوتی تھی۔ مالوے کے تاجر افیون بمبئی کی بندرگاہ ہی سے چین بھیجتے تھے اور انگریزی سرکار افیون کے اپنی عملداری سے ہو کر گزرنے پر فی صندوق (۱۴۰ پونڈ وزنی) ۱۲۵ پونڈ محصول وصول کر لیتی تھی۔ ۱۸۴۳ء کے قبل مالوے کی افیون سندھ کی راہ سے

ہندوستان سے باہر بھیجی جاتی تھی لیکن اس سال انگریزوں نے سندھ فتح کر لیا تھا اور اس کے بعد افیون غیر ممالک کو بھیجنے کے لئے انگریزی عملداری میں سے ہو کر گزرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ یہی محصول راہداری تھا جس سے حکومت بمبئی کو افیون کی مد میں آمدنی ہوتی تھی اس طرح سندھ کی فتح میں حکومت بمبئی کا کچھ مالی فائدہ بھی مضمر تھا۔

مدراس میں افیون نہیں بنتی تھی۔

انگلستان میں اس موضوع پر بڑی بڑی بحثیں ہوئی تھیں کہ آیا محصول افیون درحقیقت اہل ہند پر ایک قسم کا محصول سمجھا جا سکتا ہے یا نہیں کیا اس محاصل کے برقرار رکھنے کے لئے چین سے وہاں جا کر لڑائیاں کرنا جیسا کیا گیا تھا جائز تھا یا نہیں اور کیا حکومت ہند کا افیون کا اجارہ موجودہ زمانے میں بھی بحالہ رکھنا درست ہے یا نہیں؟ اس تالیف کا مطمح نظر یہ ہے کہ ناظرین کے روبرو ایسے صحیح واقعات پیش کر دئے جائیں جن پر وہ خود رائے قائم کر سکیں اس لئے ان مباحث میں پڑنا ہمیں پسند نہیں۔ ہمارے خیال میں معاشیات کا کوئی حقیقی ماہر فن ایسا نہ ہو گا جو اس سے انکار کرے کہ ایک ایسا سرکاری اجارہ جس کی وجہ سے ایک نفع بخش حرفت سے لوگ محروم ہو جائیں اور ایک نفع خیز شئے کی کاشت و ساخت اور تجارت موقوف ہو جائے لوگوں پر بالکل حقیقی معنی میں محصول نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے کوئی غیر جانبدار مورخ ایسا نہیں ہے جس نے چین کی حکومت کی مرضی کے خلاف وہاں کی بندرگاہوں میں ہندوستانی افیون داخل کرنے کی غرض سے جو لارڈ پالمرسٹن نے چین سے لڑائیاں کی تھیں ان کی تائید کی ہو۔ اور کوئی مدبر و سنجیدہ شخص ایسا نہیں ہے جس کو افیون کا سرکاری اجارہ بشرطیکہ وہ بغیر کسی قسم کے خطرے کے اٹھا دیا جا سکتا ہے پسند آتا ہو۔

بایں ہمہ چونکہ افیون عام طور پر جزء غذا نہیں ہے اس لئے ہندوستان کے لوگ افیون کے سرکاری اجارے کو اپنے لئے اس قدر مضر نہیں سمجھتے جس قدر نمک کے اجارے کو سمجھتے ہیں۔ اسی لئے عام طور پر مقدم الذکر پر ہندوستان میں وہ غیظ و غضب نہیں ہوتا جو موخر الذکر پر کیا جاتا ہے۔ پھر بھی لوگوں کی رائے یہی ہے

کہ اس اجارے کو بحیثیت اجارہ برخاست کر دینا ہی حکومت کے لئے بہتر ہے اور اس کے بجائے اس شئے کے بنانے اور بیچنے پر جائز آمدنی کی خاطر سنگین سے سنگین محصول لگا دیا جا سکتا ہے جیسا دوسرے منشیات مثلاً شراب وغیرہ کے بنانے اور بیچنے پر اب ہے۔ انجمن برطانوی ہند نے اپنی درخواست میں جو دارالعوام کو دی تھی ہندوستان کے لوگوں کے خیالات کی خوب ترجمانی کی ہے۔

مقتضائے انصاف یہی ہے کہ خشخاش کی کاشت میں سرکاری مداخلت بند کر دی جائے اور افیون کے بنانے اور غیر ممالک کو بھیجنے پر جیسا مالوے کی افیون کے بارے میں ہوتا ہے جو معینہ محصولات ہیں اور ان سے جو آمدنی ہوتی ہے وہی محاصل افیون کا دوسرا نام سمجھا جائے۔ ان اصول کے اختیار کرنے سے خشخاش کے کاشتکاروں کو وہی آزادئ عمل مل جائے گی جو ان حکومتوں میں جن کے اساسی اصول خودسری اور مطلق العنانی نہیں ہیں ہر شخص کو حاصل ہے اور اس انتظام میں جو بھی کچھ نقصان محاصل ہوگا اس کی تلافی یوں ہو جائے گی کہ فی الوقت جو بیش مصارف عملہ افیون کے لئے ضروری ہے اس کے برخاست کر دینے سے آیندہ بچت نکلے گی۔

یہ عاجزانہ التجا بھی یونہیں رائگاں گئی۔ نہ تو ایسٹ انڈیا کمپنی اور نہ حکومت ہند ہی (جو ۱۸۵۸ء میں کمپنی کی قائم مقام ہوئی تھی) اس بات پر آمادہ تھی کہ افیون کے اجارے سے دست برادری اختیار کر لی جائے یا اس کے بجائے صرف افیون کی پیداوار اور برآمد پر محصول لگا دیا جائے۔

دسواں باب

نرخنامۂ محصول۔ درآمد اور برآمد

ہندوستان کے محکمۂ قانون نے سنہ ۱۸۳۲ء اور سنہ ۱۸۵۳ء کے درمیان تجارت اور جہاز رانی کو ایک ضابطہ کے تحت لانے اور محصول کا نرخنامہ مقرر کر دینے کے لئے مختلف قوانین وقتاً فوقتاً نافذ کیے تھے۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں چند اہم اشیاء درآمد پر محصول لیا جاتا تھا جن کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

اشیاء	محصول درآمد
کتب (برطانوی)	بلامحصول
کتب (ممالک غیر)	۳ فی صدی
قہوہ	۷½ 〃 〃
سوتی اور ریشمی پارچے (برطانوی)	۵ 〃 〃
سوتی اور ریشمی پارچے (ممالک غیر)	۱۰ 〃 〃
سوتی دھاگا ڈوریاں اور سوت (برطانوی)	۳½ 〃 〃
سوتی دھاگا (ڈوریاں) اور سوت (ممالک غیر)	۷ 〃 〃

گھوڑے اور بہائم و مویشی	بلا محصول
بحری سامان (برطانوی)	۵ فی صدی
بحری سامان (ممالک غیر)	۱۰ " "
فلزات (برطانوی)	۵ " "
فلزات (ممالک غیر)	۱۰ " "
بیر۔ ایل اور دیگر تخمیری شراب	۵ " "
نمک	(۵ شلنگ فی من (۴۲ سیر) بنگالے میں) (۲ شلنگ فی من مدراس میں)
دارو	(۱۲ شلنگ فی امپیریل گیلن لندن کے معیار کے برابر تیز)
چائے	۱۰ فی صدی
انگوری شراب اور دیگر قسم کی شراب	۲ شلنگ فی امپیریل گیلن
اونی پارچے (برطانوی)	۵ فی فیصدی
اونی پارچے (ممالک غیر)	۱۰ " "
دیگر مصنوعات	۵ " "
اشیائے متفرق	۳ $\frac{1}{2}$ فی صدی

دار العوام کی سنہ ۱۸۵۲ء کی رپورٹ کے ضمیمہ (۴) میں جس سے مذکورۃ الصدر اعداد اخذ کیے گئے ہیں بمبئی، مدراس اور بنگالے کے متعلق سنہ ۳۵-۱۸۳۴ء سے سنہ ۵۰-۱۸۴۹ء تک سولہ سال کی درآمد و برآمد کی قیمت درج ہے۔ ذیل کے دو نقشوں میں ہم نے ایک پونڈ انگلیسیہ ۱۰ روپے کے مساوی قرار دیا ہے۔

درآمد

سنہ عیسوی	مال تجارت و خزانہ طلا و نقرہ وغیرہ			
	در بنگالہ	در مدراس	در بمبئی	جملہ
۳۵-۱۸۳۴	۲۶۴۵۳۵۵	۹۵۶۴۰۵	۲۸۵۲۲۶۹	۶۱۵۴۱۲۹

۱۸۳۵ - ۳۶	۲۸۵۷۵۳۰	۵۸۵۰۸۸	۳۴۸۵۶۹۴	۶۹۲۸۳۱۲
۱۸۳۶ - ۳۷	۳۳۹۵۴۲۳	۶۷۲۹۸۵	۳۵۰۴۷۴۷	۷۵۷۳۱۵۷
۱۸۳۷ - ۳۸	۳۵۱۲۷۸۸	۷۳۲۴۶۶	۳۴۲۷۳۱۷	۷۶۷۲۵۷۲
۱۸۳۸ - ۳۹	۳۸۵۱۱۸۳	۷۷۸۵۳۶	۳۶۲۱۸۷۶	۸۲۵۱۵۹۶
۱۸۳۹ - ۴۰	۴۵۶۸۳۷۸	۷۹۵۷۱۴	۲۴۱۲۴۰۸	۷۷۷۶۵۰۱
۱۸۴۰ - ۴۱	۵۵۰۹۵۶۳	۸۳۷۰۷۹	۳۸۵۵۵۵۱	۱۰۲۰۲۱۹۳
۱۸۴۱ - ۴۲	۵۲۵۲۵۲۷	۷۴۵۸۸۷	۳۶۳۱۴۸۵	۹۶۲۹۹۰۰
۱۸۴۲ - ۴۳	۵۵۶۳۸۹۷	۶۶۰۵۹۳	۴۸۲۲۴۰۳	۱۱۰۴۶۸۹۴
۱۸۴۳ — ۴۴	۶۲۲۶۸۴۸	۷۶۷۵۰۴	۶۶۱۸۱۲۲	۱۳۶۱۲۴۷۵
۱۸۴۴ - ۴۵	۷۵۱۵۳۵۵	۱۲۳۵۴۵۸	۵۷۵۵۷۲۷	۱۴۵۰۶۵۳۷
۱۸۴۵ - ۴۶	۶۲۲۳۶۲۳	۱۰۲۲۲۱۱	۴۳۳۷۶۰۳	۱۱۵۸۳۴۳۸
۱۸۴۶ - ۴۷	۶۶۴۹۶۷۱	۱۰۲۹۰۰۳	۴۱۵۷۹۱۱	۱۱۸۳۶۵۸۶
۱۸۴۷ - ۴۸	۵۴۱۸۵۸۴	۱۱۰۸۸۱۷	۴۰۴۳۶۰۶	۱۰۵۷۱۰۰۸

۱۸۴۸ - ۴۹	۵۷۷۰۶۲۳	۱۰۶۵۲۷۱	۵۷۰۳۴۰۲	۱۲۵۴۹۳۰۷
۱۸۴۹ — ۵۰	۶۴۹۸۰۳۵	۱۰۲۷۴۴۱	۶۱۷۱۲۱۸	۱۳۶۹۶۶۹۶

برآمد

سنہ عیسوی	مال تجارت و خزانۂ طلا و نقرہ وغیرہ			
	از بنگالہ	از مدراس	از بمبئی	جملہ
۱۸۳۴ - ۳۵	۳۱۵۸۵۹۸	۹۹۲۴۸۵	۳۰۳۷۰۷۷	۸۱۸۸۱۶۱
۱۸۳۵ - ۳۶	۵۵۹۳۸۹۶	۱۱۵۲۹۶۸	۴۴۶۷۷۴۰	۱۱۲۱۴۶۰۴
۱۸۳۶ - ۳۷	۶۸۴۹۵۲۷	۱۳۵۱۴۱۶	۵۳۰۳۱۷۳	۱۳۵۰۴۱۱۷
۱۸۳۷ - ۳۸	۶۹۰۵۸۰۹	۱۰۷۲۶۴۰	۳۶۰۴۹۸۶	۱۱۵۸۳۴۳۶
۱۸۳۸ - ۳۹	۶۹۵۴۳۸۱	۱۱۱۱۷۱۹	۴۰۵۶۵۷۳	۱۲۱۲۲۶۷۵
۱۸۳۹ - ۴۰	۷۰۰۰۹۴۳	۱۳۵۵۹۱۴	۲۹۷۶۴۱۱	۱۱۳۳۳۲۶۸
۱۸۴۰ - ۴۱	۸۲۰۶۷۷۱	۱۱۳۳۴۶۶	۴۴۸۱۸۳۲	۱۳۸۲۲۰۷۰
۱۸۴۱ - ۴۲	۸۴۲۵۵۳۹	۱۴۲۳۰۶۴	۴۶۹۱۶۸۹	۱۴۳۴۰۲۹۳

۱۸۴۲ - ۴۳	۷۴۳۶۳۶۹	۱۳۲۷۳۰۸	۵۰۰۳۹۴۲	۱۳۷۶۷۶۲۱
۱۸۴۳ - ۴۴	۱۰۰۷۶۹۰۴	۱۲۳۰۲۵۵	۶۶۹۲۳۹۳	۱۷۹۹۹۵۵۳
۱۸۴۴ - ۴۵	۱۰۲۱۸۷۴۰	۱۷۰۶۵۱۶	۵۷۷۱۷۹۶	۱۷۶۹۷۰۵۲
۱۸۴۵ - ۴۶	۱۰۱۰۲۷۵۵	۱۴۷۶۹۸۱	۶۲۶۴۹۶۵	۱۷۸۴۴۷۰۲
۱۸۴۶ - ۴۷	۹۵۱۹۷۹۶	۱۵۸۴۳۱۶	۴۹۶۵۱۹۲	۱۶۰۶۹۳۰۷
۱۸۴۷ - ۴۸	۸۸۶۶۹۲۸	۱۴۹۱۵۵۸	۴۳۷۹۹۴۷	۱۴۷۳۸۴۳۵
۱۸۴۸ - ۴۹	۹۸۱۹۷۴۲	۱۹۴۶۳۱۱	۶۸۶۲۱۹۰	۱۸۶۲۸۲۴۴
۱۸۴۹ - ۵۰	۱۰۵۰۲۲۴۴	۱۳۴۵۵۲۲	۶۴۳۵۷۷۶	۱۸۲۸۳۵۴۳

ان نقشوں کے اعداد پر غائر نظر ڈالنے سے چند باتیں فوراً ظاہر ہوتی ہیں مثلاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی اور بنگالے میں درآمد برآمد دونوں جلد جلد بڑھ رہی تھیں لیکن مدراس میں ان کا اضافہ کچھ ایسا نمایاں نہیں تھا۔ چنانچہ بمبئی اور بنگالے میں درآمد اشیا پچیس لاکھ سے ساٹھ لاکھ ہو گئی تھی مگر مدراس میں ۶ لاکھ سے صرف دس لاکھ ہوئی تھی۔ بمبئی سے برآمد اشیا تیس لاکھ سے ساڑھے ساٹھ لاکھ ہو گئی تھی اور بنگالے سے ۸۰ لاکھ سے ڈیڑھ کروڑ ہو گئی تھی مگر مدراس سے برآمد اشیاء دس لاکھ سے صرف پندرہ لاکھ ہو گئی تھی۔ یہ نمایاں اضافہ بمبئی اور بنگالے کی عملداری میں کسی قسم کی توسیع حدود کے باعث نہیں ہوا تھا کیونکہ ۱۸۳۴ء اور ۱۸۴۹ء کے درمیان ان صوبوں کے رقبے میں کوئی اہم اضافہ

نہیں ہوا تھا بلکہ محض مدراس کے بدتر نظامِ اراضی کے تحت جس کی تفصیل ہم نے کسی اور باب میں بیان کی ہے مدراس کی جو حالت بن گئی تھی تمامتر اسی وجہ سے تھی۔

مذکورۃ الصدر اعداد کے معائنہ سے ایک اور بات قابلِ ذکر یہ نظر آتی ہے کہ برطانوی ہند کی درآمد برآمد کے تناسب میں تفاوت عظیم تھا اور یہ ۱۸۳۴-۳۵ء میں ۲۰ لاکھ تھا مگر ۱۸۴۹-۵۰ء میں ۴۵ لاکھ سے بھی زیادہ ہوگیا تھا ان اعداد سے نہ صرف برطانیۂ عظمیٰ کے ساتھ برطانوی ہند کی تجارت جو تھی وہ ظاہر ہوتی ہے بلکہ وہ تجارت بھی جو برطانوی ہند کی دنیا کے اور تمام ممالک سے تھی۔ دوسرے ممالک جو کچھ لیتے تھے اس کا واجبی معاوضہ بھی دیتے تھے لیکن برطانیۂ عظمیٰ ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا جس کا کوئی تجارتی معاوضہ نہیں دیتا تھا۔ اس طرح ہندوستان کی درآمد برآمد میں ۲۰ لاکھ سے لیکر ۴۵ لاکھ تک کا تفاوت ہوتا تھا اور یہی تفاوت دولت کا سالانہ سوتاؤ تھا۔

مذکورۃ الصدر نقشوں میں ۱۸۵۰ء تک کی ہندوستان کی تجارت کے اعداد بتائے گئے ہیں مگر اب ہم ناظرین کے سامنے ۱۸۵۱ء سے ۱۸۵۸ء تک کمپنی کے ہشت سالہ عہدِ حکمرانی کے اعداد جو ایک حالیہ نقشے سے اخذ کیے گئے ہیں پیش کرتے ہیں۔ پہلے پانچ سال میں ہندوستان سے برآمد اشیاء میں فاضلات ہی رہی لیکن باقی تین ۳ سال کہ جو غدر کا زمانہ تھا برآمد اشیا سے بھی درآمد زیادہ ہوئی۔

تمام ممالکِ غیر سے ہندوستان کی تجارت

سنہ عیسوی	درآمد مالِ تجارت پونڈ	درآمد طلا و نقرہ پونڈ	جملہ درآمد پونڈ	جملہ برآمد پونڈ	تفاوت برآمد پونڈ
۱۸۵۱	۱۱۵۵۸۶۸۹	۳۸۱۱۹۰۹	۱۵۳۷۰۵۹۸	۱۸۷۰۵۴۳۹	۳۳۳۴۸۳۹
۱۸۵۲	۱۲۲۴۰۴۹۰	۵۰۵۲۰۵۹	۱۷۲۹۲۵۴۹	۲۰۷۹۸۳۴۲	۳۵۰۵۷۹۳
۱۸۵۳	۱۰۰۷۰۸۶۳	۶۸۳۱۳۷۷	۱۶۹۰۲۲۴۰	۲۱۵۱۹۸۶۳	۴۶۱۷۶۲۳
۱۸۵۴	۱۱۱۲۲۶۹۵	۴۸۷۱ ۵۴	۱۵۹۹۴۶۱۳	۲۰۷۷۸۴۳۵	۴۷۸۳۸۲۲

۱۸۵۵	۱۲۷۴۲۶۷۱	۲۰۲۸۲۵۶	۱۴۷۷۰۹۲۶	۲۰۱۹۴۲۵۵	۵۴۲۳۳۲۸ تفاوت درآمد
۱۸۵۶	۱۳۹۴۳۴۹۴	۱۱۳۰۱۲۸۸	۲۵۲۴۴۷۸۲	۲۳۶۳۹۴۳۵	۱۶۰۵۳۴۷
۱۸۵۷	۱۴۱۹۴۵۸۷	۱۴۴۱۳۶۹۷	۲۸۶۰۸۲۴۴	۲۶۵۹۱۸۷۷	۲۰۱۶۴۰۷
۱۸۵۸	۱۵۲۷۷۶۲۹	۱۵۸۱۵۴۳۶	۳۱۰۹۳۰۶۵	۲۸۲۷۸۴۷۴	۲۰۱۴۵۹۱

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ برآمد سے درآمد کا ہندوستان میں زیادہ ہونا محض عارضی تھا ۱۸۶۴ء تک جیسا ہم کسی آئندہ باب میں بتائیں گے ہندوستان کی درآمد سے برآمد پھر بڑھ گئی اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا یہ تفاوت اور بھی زیادہ ہوتا گیا۔

ہندوستان کی نصف سے بھی زیادہ تجارت برطانیہ عظمیٰ سے تھی اس طرح ۱۸۴۱ء سے ۱۸۵۵ء تک جب ہندوستان کی درآمد ایک کروڑ سے لیکر ۲ کروڑ تک ہوئی تھی اس وقت صرف ممالک متحدہ برطانیہ سے درآمد اشیاء ۵۰ لاکھ اور ایک کروڑ کے درمیان ہوئی تھی اور باقی تین سال میں یعنے ۱۸۵۶ء سے ۱۸۵۸ء تک جبکہ درآمد میں ڈھائی کروڑ اور تین کروڑ دس لاکھ کے درمیان اضافہ ہوا تھا تو اس وقت ممالک متحدۂ برطانیہ سے درآمد میں ایک کروڑ اسّی لاکھ کے درمیان اضافہ ہوا تھا ہندوستان کی برآمد میں اور ممالک کے مقابل برطانیۂ عظمیٰ کا حصہ کسی قدر کم تھا۔ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۵۵ء کے درمیان ہندوستان سے جملہ برآمد ایک کروڑ تیس لاکھ اور دو کروڑ دس لاکھ کے درمیان ہوئی تھی جس میں سے برطانیۂ عظمیٰ کو ۵۰ لاکھ اور ۸۰ لاکھ کے درمیان برآمد ہوئی تھی۔ بقیہ تین سال میں ہندوستان کی جملہ برآمد دو کروڑ تیس لاکھ اور دو کروڑ اسّی لاکھ کے درمیان ہوئی تھی اور ممالک متحدہ برطانیہ کو اس میں سے ایک کروڑ ہوئی تھی۔

ہمارے پاس اتنی گنجائش صفحات نہیں ہے جس میں ہم یہ بتا سکیں کہ ان سنین میں کس طرح مختلف اشیائے تجارت کی درآمد و برآمد بڑھتی گھٹتی رہی ہے لیکن چند

اہم اشیائے تجارت کا بیان اس لئے ضروری ہے کہ اس سے اہل ہند کی اس زمانے کی حرفت پر روشنی پڑتی ہے۔ ہندوستان کے اہم ترین اشیائے درآمد میں سوتی دھاگہ اور ڈوریاں۔ سوتی کپڑے۔ ریشمی پارچے۔ اونی پارچے مشینیں اور گرنیوں کے مصنوعات کا شمار تھا اور ان اشیاء کے صرف میں دس سال میں جو کمی وبیشی ہوتی رہی ہے وہ ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوتی ہے۔

تمام ممالکِ غیر سے ہندوستان میں درآمد اشیاء

سنہ عیسوی	سوتی دھاگہ ڈوریاں پونڈ	سوتی مال پونڈ	ریشمی مال پونڈ	اونی مال پونڈ	مشینیں پونڈ	گرنیوں کے مصنوعات پونڈ
۱۸۴۹	۹۰۹۰۱۶	۲۲۲۲۰۸۹	۱۲۳۵۰۵	۱۱۱۸۱۵	۱۰۰۶۴	۲۰۳۹۹۷
۱۸۵۰	۱۱۳۱۵۸۶	۲۳۷۱۶۱۸	۱۱۲۶۰۱	۱۵۹۱۵۴	۸۰۷۹	۱۶۶۱۳۹
۱۸۵۱	۱۰۳۹۳۲۹	۲۶۴۲۳۶۱	۱۱۱۵۵۴	۲۱۸۸۴۸	۲۰۶۶۶	۲۴۵۳۹۳
۱۸۵۲	۱۳۹۱۲۴	۴۷۷۰۷۷۹	۱۲۶۶۰۶۴	۲۰۵۵۰۵	۱۴۳۳۷	۲۴۶۷۰۱
۱۸۵۳	۱۱۳۰۵۰۰	۲۶۶۷۴۳۳	[illegible]	۱۴۲۰۲۷	۲۶۴۵۷	۲۱۷۱۸۷
۱۸۵۴	۱۳۰۶۹۱۳	۴۴۳۲۵۲۵	۱۱۶۹۵۵	۱۴۴۴۷۳	۵۲۷۸۸	۲۸۶۶۷۱
۱۸۵۵	۱۲۷۴۰۹۸	۵۴۰۳۲۴۴	۱۹۷۵۱۰	۱۷۱۰۶۵	۱۲۶۳۰۳	۳۱۲۲۰۴
۱۸۵۶	۱۴۱۴۲۷۴	۴۹۴۸۰۰۵	۱۳۸۷۶۸	۱۳۳۹۹۸	۴۳۵۵۱۲	۷۸۸۸۵۹

۱۸۵۷	۱۱۹۱۹۷۴	۴۹۴۱۲۵۳	۱۰۶۲۳۳	۱۴۲۷۹۷	۲۴۴۴۳۳	۵۵۸۳۲۹
۱۸۵۸	۹۴۳۹۲۰	۴۷۸۲۶۹۸	۱۰۸۰۲۳	۲۶۱۵۸۹	۴۶۵۴۵۳	۳۷۸۹۸۹

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۵ء تک یعنے چھ ۶ سال کی مدت میں سوتی مال کی درآمد دو چند سے بھی زیادہ ہوئی تھی اور غدر کی وجہ سے اس میں اضافہ ہونا بند ہو گیا تھا مگر ۱۸۵۹ء میں آناً فاناً ۸۰ لاکھ کی مالیت اس کی ہو گئی۔ مشینوں اور گرنیوں کی مصنوعات کی درآمد میں بھی نمایاں اضافہ ہوا تھا۔

دس سال کی مدت میں ہندوستان کی برآمد میں جو کمی و بیشی ہوئی وہ ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوتی ہے:۔

ہندوستان سے تمام ممالکِ غیر کو برآمد

سنہ عیسوی	سوت پونڈ	سوتی مال ڈوریاں، دھاگا پونڈ	خام ریشم پونڈ	ریشمی مال پونڈ	کچا اون پونڈ
۱۸۴۹	۱۷۷۵۳۰۹	۶۹۰۵۸۴	۷۱۳۶۳۲	۳۰۲۳۲۲	۵۵۵۹۱
۱۸۵۰	۲۲۰۱۱۷۸	۷۴۲۳۲۰	۶۶۶۰۹۴	۴۴۱۷۴۹	۴۸۹۲۵
۱۸۵۱	۳۴۷۴۴۸۹	۶۷۳۵۴۹	۶۱۹۳۱۹	۳۵۵۲۲۳	۶۸۳۳۵
۱۸۵۲	۳۶۱۹۹۸۹	۸۱۹۰۴۹	۶۸۸۶۴۰	۲۶۰۲۲۵	۱۰۰۶۱۲
۱۸۵۳	۳۶۲۹۴۹۴	۹۳۰۸۷۷	۶۶۷۵۴۵	۳۱۵۳۰۵	۱۷۲۱۱۰
۱۸۵۴	۲۸۰۳۱۵۰	۷۶۹۳۴۵	۶۴۰۴۵۱	۳۲۶۵۷۱	۲۰۵۶۰۱

۱۸۵۵	۲۴۲۸۷۶۴	۸۱۷۱۰۳	۵۰۰۱۰۵	۲۶۳۴۵۳	۲۰۷۲۶۳
۱۸۵۶	۳۳۱۴۹۵۱	۷۷۹۶۴۷	۷۰۷۷۰۶	۳۴۱۰۳۵	۲۷۲۹۴۲
۱۸۵۷	۱۴۳۷۹۴۹	۸۸۲۲۴۱	۷۸۲۱۴۰	۲۸۱۴۵۰	۳۱۴۲۱۶
۱۸۵۸	۴۳۰۱۷۶۸	۸۰۹۱۸۳	۷۶۶۶۷۳	۱۵۸۲۲۴	۳۸۷۱۰۴

ہندوستان سے تمام ممالک غیر کو برآمد

سنہ عیسوی	غلہ واجناس	شکر	افیون	نیل	سن
	پونڈ	پونڈ	پونڈ	پونڈ	پونڈ
۱۸۴۹	۸۵۸۶۹۱	۱۸۱۴۴۰۴	۵۷۷۲۵۲۶	۲۰۹۳۴۷۴	۶۸۷۱۷
۱۸۵۰	۷۵۷۹۱۶	۱۹۲۵۶۰۳	۵۹۷۳۳۹۵	۱۸۳۸۴۷۴	۸۸۹۸۹
۱۸۵۱	۷۵۲۲۹۵	۱۸۲۲۷۸۹	۵۴۵۹۱۳۵	۱۹۸۰۸۹۶	۱۹۶۹۳۶
۱۸۵۲	۸۶۹۰۰۲	۱۸۰۱۶۶۰	۶۵۱۵۲۱۴	۲۰۲۵۳۱۳	۱۸۰۹۷۶
۱۸۵۳	۸۸۹۱۶۰	۱۷۲۹۷۶۲	۷۰۳۴۰۷۵	۱۸۰۹۶۸۵	۱۱۲۶۱۷
۱۸۵۴	۱۴۱۳۶۵۴	۹۴۸۵۸۲	۶۴۳۷۰۹۸	۲۰۶۷۷۶۹	۲۱۴۷۶۸
۱۸۵۵	۱۷۴۲۵۳۰	۱۱۲۵۶۹۹	۶۲۳۱۲۷۸	۱۷۰۱۸۲۵	۲۲۹۲۴۱

۱۸۵۶	۲۸۹۶۲۶۲	۱۲۵۹۱۰۴	۶۲۰۰۸۷۱	۲۴۲۴۳۳۲	۳۲۹۰۷۶
۱۸۵۷	۲۵۸۷۴۵۶	۱۷۸۶۰۷۷	۷۰۵۶۶۳۰	۱۹۳۷۹۰۷	۲۷۴۹۵۷
۱۸۵۸	۳۷۹۰۳۷۴	۱۱۷۵۷۷۱	۹۱۰۶۶۳۵	۱۷۳۴۳۳۹	۳۰۳۲۹۲

ان اشیائے برآمد کی کمی وبیشی معنی خیز ہے کچے سوت کی برآمد اس دہ سالہ مدت میں ۲۰ لاکھ کی جو تھی اس میں چالیس لاکھ سے کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوا تھا۔ ہندوستان میں روئی کی کاشت پھیلانے اور اس کو ترقی دینے کی خواہش انگلستان کے اس لئے دامنگیر تھی کہ اس کے کارخانوں اورکارگاہوں کی ضرورتوں کی تکمیل بجائے امریکہ کے اس طرح خود اس کے مقبوضات ہی سے ہوسکتی تھی، ہم کسی آیندہ باب میں بتائیں گے کہ مدتِ دہ سالہ (۱۸۶۰ تا ۱۸۷۰) کے ابتدائی سالوں میں امریکہ میں خانہ جنگی گویا خدا کی طرف سے ان کوششوں کی تائید ہی کے لئے شروع ہوی اس خانہ جنگی کے زمانے میں امریکہ سے روئی نہ آسکی اس لئے ۱۸۶۴ء میں ہندوستان روئی کی برآمد میں تین کروڑ ساٹھ لاکھ کا اضافہ ہوا اور اس کے بعد کے سال اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوا لیکن ممالک متحدہ امریکہ میں جب صلح وامن قائم ہوا تو پھر یہ بات باقی نہ رہی۔ برطانوی کارخانوں میں ہندوستانی روئی کے بجائے امریکہ کی روئی پھر استعمال ہونے لگی اور ہندوستان کی برآمد جیسے آناً فاناً بڑھ گئی تھی ویسے آناً فاناً گھٹ گئی۔

اس صدی میں ابتدا سے انتہا تک ہندوستان میں کپڑا بننے کی حرفت کے نشوونما یا بھاپ سے چلنے والے کارگاہوں پر اہل ہند کو اپنے لیے پارچہ بننا سکھانے یا اپنے قدیم دستی کارگاہوں میں کوئی اختراع کرنے کا کسی کو کچھ خیال نہ تھا اگر اس وقت ایک حقیقی قومی حکومت ہوتی جس کو قومی فلاح وبہبود کا بھی خیال ہوتا تو وہ ہندوستان کی اس قدیم قومی حرفت کو قائم اور محفوظ رکھنے کے لئے جدید اور ترقی یافتہ طریقے ضرور اختیار کرتی اور ہندوستان کے صابر اور قانع جفاکش اور ہنرمند

کاریگروں اور صنعت گروں کو بھی ایک اچھا سبق ملتا اور ان جدید طریقوں کے اختیار کرنے سے ان کی قدیم حرفت ضرور قائم و محفوظ رہتی۔

مذکورالصدر نقشے میں ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ خام ریشم کی برآمد ہی بحالہ تھی اور کچے اون کی برآمد میں اضافہ ہوا تھا مگر ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۰ء تک ہندوستان کے ریشمی مصنوعات جن پر انگلستان کے پارچہ بافوں کو اس قدر رشک وحسد تھا ایسے انحطاط میں گرفتار ہو گئے تھے جس سے ان کو پھر کبھی نجات ہی نہیں ملی۔ برخلاف اس کے غلہ واجناس کی برآمد میں مسلسل ایسا خطرناک اضافہ ہوتا رہا تھا کہ دس سال میں کچھ کم دس لاکھ سے چالیس لاکھ کو یہ برآمد پہنچ گئی تھی۔ دستکاری اور مصنوعات کے انحطاط کا یہ فطری نتیجہ تھا کہ انگلستان کا خراج سالانہ ادا کرنے کے علاوہ اس کے اشیاء درآمد کے معاوضے میں ہندوستان اپنی رعایا کو محروم کر کے روزافزوں غلہ واجناس مسلسل باہر ارسال کرنے پر مجبور رتھا۔ اس صدی کے آخر تک چاول گیہوں اور دیگر اجناس کی برآمد سالانہ ایک کروڑ بیس لاکھ پونڈ انگلیشیہ کی کثیر رقم کو پہنچ چکی تھی۔

کمپنی کی حکمرانی کے آخر سال میں ہندوستانی شکر کی برآمد سے آثار انحطاط نمایاں ہو رہے تھے اور اس صدی کے ختم پر اس قدر کم شکر برآمد ہونے لگی تھی کہ اس کی مجموعی قیمت ....، ا پونڈ انگلیشیہ سے بھی کم تھی برخلاف اس کے ٹاٹ روئی وغیرہ بنانے کے لئے سن کی برآمد میں بالخصوص جنگ کریمیا کے زمانے سے مسلسل اضافہ ہوتا رہا تھا کیونکہ اس جنگ سے پہلے انگلستان میں روسی سن کی بہت بڑی درآمد تھی جو اس جنگ کی وجہ سے بند ہو گئی تھی اور اس طرح ہندوستانی سن کو انگلستان کی منڈی میں آنے کا ایک موقع مل گیا جو آج تک بحالہ قائم ہے۔ اس صدی کے ختم تک خام سن اور اس کے مصنوعات کی ہندوستان سے برآمد ایک کروڑ پونڈ انگلیشیہ کو پہنچ چکی تھی۔

نیل کی برآمد بھی بہت زیادہ تھی لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس حرفت پر ظلم وتعدی اور بے ضابطگی کا دھبہ لگا۔ بنگالے کے نیل کے یورپی نخلبندوں نے وہ وہ کام کیے تھے کہ لوگوں کو طیش آگیا جس سے آخر کار بنگالے کے اکثر حصوں میں ان خرابیوں کا خود بخود انسداد ہو گیا۔ کاشتکاروں نے ہڑتال کر دی۔ نیل کے کئی کارخانے ڈوب گئے اور نیل کی صنعت پر انحطاط آگیا اس کے متعلق آئندہ کسی با

ہیں تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ فزید برآں اس صدی کے قریب الختم جرمانیہ نے نیل کے مماثل ایک کیمیائی شئے دریافت کر لی تھی جس سے اس قدیم حرفت کا خاتمہ ہی ہو گیا۔

محصول مترفہ

ہندوستان کی حرفت وصنعت کے متعلق یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۶۳ء میں سیاہ بخت صوبہ مدراس" کے سوا ہندوستان میں سب جگہ اہل حرفہ اور اہل پیشہ پر جو تکلیف دہ اور پر زحمت محصول مترفہ تھا وہ اٹھا دیا گیا۔ انجمن اہل مدراس نے دارالعوام کو جو درخواست دی تھی اس میں اس محصول کے متعلق یہ بیان کیا گیا تھا کہ یہ "محصول تمام اہل پیشہ اور اہل حرفہ پر لگا دیا گیا ہے اور جن میں جولاہے۔ بڑھئی کسار۔ بیوپاری خواہ ان کی دوکانیں ہوں (جن پر ایک علحدہ محصول لیا جاتا تھا) خواہ وہ سرراہ بیٹھے اشیاء بیچتے ہوں سب شامل ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے آلات و اوزار پر یا محض بیوپار کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے یہ محصول ادا کرتے تھے۔ غرض یہ محصول تجارت کی معمولی سی معمولی چیز اور مشین درست کرنے والے کے کم قیمت سے کم قیمت آلے پر جس کی لاگت مترفہ محصول کی وجہ سے کیونکہ اس محصول کے ادا کرنے پر اس کے بیچنے یا استعمال کرنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ کشش گونہ زیادہ ہو جاتی ہے"۔ اس انجمن نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ "اس محصول کا اثر بہ نسبت مالداروں اور دولتمندوں کے غربا اور کم مایہ لوگوں پر زیادہ پڑتا ہے۔ مترفہ محصول وصول کرنے والوں کو ایسے اختیارات تمیزی حاصل ہیں کہ ان کی بنا پر محصول وصول کرنے والوں کو ہمیشہ بہت بڑا موقع رہتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے لالچ کے مارے جب چاہیں لوگوں کے گھروں پر تحقیقات کے حیلے سے ظلم و تشدد اور استحصال ناجائز کرنے کی غرض سے چلے جائیں اور ان کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ اخذ بیجا کے لیے جبراً سزائے قید دیں اور لوگوں کو بیڑیاں پہنا دیں"۔ اور یہ سب کچھ اسی محصول کی آمدنی کی خاطر حالانکہ "اس محصول سے

جس قدر آمدنی ہوتی ہے وہ صرف ..... ایک پونڈ سے کچھ زیادہ ہے"

مذکورالصدر بیان میں کچھ مبالغہ نہ تھا جیسے ڈبلیو۔ بی ڈیکنس نامی ایک گواہ نے جو مجسٹریٹ اور عہدہ دار مالگزاری بھی تھا اور مدراس میں خود اس نے محصول وصول کیا تھا اس ظلم و تشدد کے متعلق نہایت پُرزور الفاظ میں شہادت دی تھی۔

سوال۔ کیا یہ محصول انھیں اشخاص پر لگایا گیا ہے جو تجارتی کاروبار میں مشغول ہیں؟

جواب۔ یہ محصول قریب قریب اُن سب اشخاص پر ہے جو کاشت نہیں کرتے ..... اگر کوئی بڑھیا منڈی میں ترکاری خرید کر گلی کے نکڑ پر بیچتی ہے تو اُس سے ترکاری بیچنے والی کی حیثیت سے یہ محصول وصول کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کپڑے بیچتا ہے تو اُس سے بھی محصول لیا جاتا ہے لیکن یوروپی تاجروں سے یہ محصول کوئی وصول نہیں کرتا۔ اس غریب کا جو سال بھر میں دو چار روپے کما لیتا ہے شاید کوئی یورپی تاجر ہمسایہ ہو جو سینکڑوں روپے تو پیدا کرتا ہے مگر ایک پائی بھی محصول نہیں دیتا۔

سنہ ۱۸۵۳ء کی پارلیمنٹی تحقیقات کے بعد اس طرح کا حسد انگیز محصول ہندوستان کے کسی حصے میں بھی قائم نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ وہ اٹھا دیا گیا۔ اور ہندوستان کی زمام حکومت سرکار برطانیہ کے ہاتھ میں آنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد محصول آمدنی سب پر لگا دیا گیا جو زیادہ واجبی اور مبنی بر انصاف اس لئے تھا کہ یہ ہر طبقہ رعایا پر برابر لگا دیا گیا تھا اور آگے چل کر اس سے وہ سب غریب مستثنیٰ کر دیئے گئے تھے جن کی آمدنی بہت ہی قلیل تھی۔

گیارھواں باب

آبپاشی اور ریلیں

اٹھارھویں صدی عیسوی کی لڑائیوں کی بناء پر آبپاشی کی بڑی بڑی نہریں جو شمالی ہند میں مسلمان بادشاہوں کی یادگار تھیں بلا مرمت یونہی پڑی تھیں ۱۸۰۳ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر قبضہ شمالی ہند آیا تو اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد کمپنی کے عاملوں نے ان نہروں پر اپنی توجہ مبذول کرنی شروع کی ۱۸۱۰ء میں لارڈ منٹو کے عہد حکومت میں ایک مجلس پیمایش یہ دریافت کرنے کے لئے مقرر ہوئی تھی کہ جمنا کے مشرقی اور مغربی دونوں جانب قدیم نہروں کی اُس وقت حالت کیا ہے۔ چیف انجینیر اور صدر افسر پیمائش دونوں کی رائے میں بہت کچھ اختلاف تھا۔ انھوں نے اُپنے اپنے علم و تجربے سے پیمائش رپورٹ میں وہ متضاد طومار باندھ دیا تھا" کہ اس کے وزن کے نیچے دب کر نہروں کی درستی و مرمت کا منصوبہ مٹی میں مل گیا۔

لارڈ ہیسٹنگز نے زیادہ عملی طور پر پھر سے یہ سوال اٹھایا اور ۱۸۱۵ء میں شمالی ہند میں دورہ کرنے کے بعد اُس نے اس قدیم نہر کی جو جمنا کے مغربی کنارے پر واقع تھی ترمیم و درستی کے منصوبے کے متعلق بڑی توقع کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ "میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس شکستہ نہر کے معائنہ کے بعد اس اعلےٰ کام کی تکمیل میں ہم کو جو سہولت

حاصل ہے اور جو حکمت عملی اس میں مضمر ہے وہ سب میرے ذہن نشین ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس سے ملک کے وہ وسیع خطے جو اب افتادہ ہیں زیر کاشت آجائیں گے اور اس طرح معزز کمپنی کی مالگزاری میں بھی اضافہ ہو گا۔ اس نہر کی آبپاشی پر جس قدر بھی رقم وصول ہو گی وہ خود ایک خاصی آمدنی ہو گی۔"

چنانچہ لفٹننٹ بلین نے جمنا کی مغربی نہر کی مرمت و درستی شروع کر دی اور نصف صدی کے وقفے سے دہلی تک اس نہر کا پانی پھر آگیا لیکن یہ کام اس سے آگے نہیں بڑھا تھا کہ سنہ ۱۸۲۳ء میں کرنل جان کالون دہلی میں آبپاشی کا صدر مہتمم مقرر ہوا پھر یہ کام سرعت کے ساتھ تکمیل کے قریب پہنچنے لگا۔ سنہ ۱۸۳۷ء کی خشک سالی میں اس نہر کے پانی سے سیراب ہونے کی وجہ سے فصل تلف ہو جانے سے بچ گئی تھی اس کی قیمت خام ۱۵ لاکھ پونڈ تخمینہ کی گئی تھی۔ اصل نہر اس کی سب شاخوں کو چھوڑ کر ۴۴۵ میل لمبی تھی۔

اس کے بعد جمنا کی مشرقی نہر پر توجہ مبذول ہونے لگی۔ اس نہر کو بھی مسلمان شہنشاہوں ہی نے بنایا تھا اور اس کو دوبارہ رواں کرنے والے رابرٹ اسمتھ اور کرنل بیرڈ اسمتھ نامی دو مشہور انجینیر گزرے ہیں ان میں سے اوّل الذکر عہدہ دار مسمی رابرٹ اسمتھ نے اس نہر کے سابقہ اصل نقشے کے موافق سنہ ۱۸۳۰ء میں اس کام کی تکمیل کر دی تھی لیکن ابھی تک بہت کچھ کرنا باقی تھا کیونکہ اس میں اہم نقائص پائے گئے تھے۔ کپتان کاٹلی نے ان غلطیوں کی اصلاح کی۔ اس کے بعد بیرڈ اسمتھ اس کا قائمقام مقرر ہوا جس نے دوسرے محکمے میں بھی نظم و نسق کے وہ اعلیٰ خدمات انجام دیے تھے جن کا ذکر کسی آیندہ باب میں آئے گا۔ کرنل برڈ اسمتھ نے تعمیر نہر میں ضروری اصلاحیں اور اضافے کیے اور تکمیل کار کے بعد خود اس نے اس نہر کے متعلق جو (۱۵۵ میل لمبی تھی "انڈین ریویو" نامی رسالے میں بجا طور پر نہایت فخریہ لکھا تھا کہ یہ "درحقیقت تمام اقطاع میں خوشنما ترین نہر ہے اس کے کنارے پر ایک کشادہ سڑک انگلستان کے ہریاول کی طرح ہموار، اس کی دونوں جانب درختوں کی قطاریں ہر پر سایہ فگن اس کے دیدہ زیب پیچ و خم کا دور تک نظر آنا نہایت سرسبز کھیتوں کا دونوں کنارے لہلہانا خوشنما چوکیاں اور خاص احتیاط کے ساتھ ان سب کی حفاظت و نگرانی غرض ان وجوہ سے اس نہر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے اور مناظر میں سب سے

زیادہ دلفریب اور نظروں کو بھانے والا اس کا منظر ہے۔"

نہر گنگا کی تعمیر کمپنی کی حکمرانی کے آخری زمانے سے متعلق ہے۔ اس کار عظیم کی ابتدا لارڈ آکلینڈ نے کی مگر بدنصیبی سے اس کے قائم مقام لارڈ ایلنبرو نے اس کام کو ملتوی کر دیا لیکن بعد کو لارڈ ہارڈنگ نے اس عظیم الشان منصوبے کی حسن و خوبی کو تسلیم کر کے اظہار پسندیدگی کے ساتھ اس کی منظوری دیدی اور مجلس نظماء نے بھی جمنا کی مشرقی اور مغربی نہروں کے مالی نتائج سے خوش ہو کر اس عظیم الشان تعمیر پر دس لاکھ پونڈ انگلیشیہ سے بڑھکر صرف کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس کام کی تکمیل سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی ختم ہو چکی تھی لیکن کمپنی کے عہد حکومت میں جتنا کام ہوا تھا اس کی حسب ذیل تفصیل کمپنی کی یادداشت میں درج ہے:

"نہر گنگا کا طول اس کی سب شاخوں کو ملا کر $\frac{1}{2}$ ۸۹۸ میل ہو گا اور اس سے ساڑھے چالیس لاکھ ایکڑ رقبے کی خاطر خواہ آبپاشی ہو سکتی ہے۔ شمال مغربی ممالک کے لفٹنٹ گورنر کے لفظوں میں یہ نہر" دراصل آبپاشی کا وہ وسیع نظام ہے جس کی مثال دنیا بھر میں نہیں ملتی اصل نہر کا عرض و طول و عمق اور بعض جگہ پتھر اور گچ کی بندش بالخصوص روڑکی اور ہردوار کے درمیان ایسی حیرت انگیز ہے کہ اس سے قوم کے غرور و افتخار میں اضافہ ہوتا ہے" یکم مئی ۱۸۵۶ء تک اس کام پر ۱۵۶۰۰۰۰ پونڈ صرف ہو گئے تھے اور تکمیل تک جملہ مصارف (بیس ۲۰) لاکھ پونڈ سے کم نہیں ہوتے تھے۔ اس نہر سے ابھی ابھی آبپاشی شروع ہوئی تھی اس کے باوجود کرنل بیرڈ اسمتھ ناظم آبپاشی کے تخمینے میں ان اراضی کی (جن کی تا حال آبپاشی ہوئی تھی) سالانہ پیداوار کی قیمت ۵۰۰۰۰۰ پونڈ اور ۲۰۰۰۰۰۰ پونڈ کے درمیان تھی اور اس نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ اس نہر سے جب پوری آبپاشی ہونے لگے گی تو اس وقت ۷۰ لاکھ پونڈ انگلیشیہ کی کثیر رقم تک پیداوار یا اراضی پہنچ جائے گی۔ ۳۰ راپریل ۱۸۵۶ء سے اب تک یہ نہر اتنی دور پہنچ چکی تھی کہ اصل نہر اور اس کی اس سرے کی شاخوں کو ملا کے $\frac{1}{2}$ ۴۹۴ میل تک اس کا پانی بہتا تھا۔"

۱۸۴۹ء میں لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کا الحاق کر لیا اس زمانے میں وہاں دو قسم کی نہریں تھیں ایک سیلابی نہریں دوسری مستقل اور پختہ نہریں۔

"سیلابی نہروں میں دریاؤں کا پانی کاٹ کر لایا جاتا ہے اور موسم سرما میں

یہ بالکل خشک ہو جاتی ہیں کیونکہ اس زمانے میں دریاؤں میں اتنا اونچا پانی نہیں ہوتا کہ بھر کر ان میں آئے لیکن موسم بہار میں جب پہاڑوں سے برف پگھل کر بہتی ہے تو ان دریاؤں کا پانی اونچا ہو کر ان نہروں میں بھر جاتا ہے اور موسم خزاں کے ختم تک بھی یہ نہریں یونہی بھری رہتی ہیں۔ پنجاب کے جنوب مغربی حصے کی سرسبزی کا انحصار زیادہ تر انھیں نہروں پر ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ زمانے میں یہ نہریں سب دریاؤں سے کاٹی گئی تھیں اور سب دریاؤں کا پانی ان میں آتا تھا۔ جہاں جہاں سے ہو کر یہ نہریں بہتی تھیں اس کے آثار اب بھی موجود ہیں اور نہ صرف گاؤں کے کھنڈروں کے پاس بلکہ شہروں اور سرکاری عمارتوں کے بھی جن کا انحصار زمانہ سابق میں کلیتاً اراضی کی (جن کی ان نہروں سے آبپاشی ہوتی تھی) زرخیزی پر تھا۔ الحاق کے زمانے میں جو نہریں قابل کار تھیں ان میں اور اصلاح کی گئی ان کو طویل و کشادہ بھی کیا گیا اور بہر حال قائم رکھا گیا۔ شکستہ نہروں میں پانی از سر نو رواں کرنے کے منصوبے سوچے گئے اور تخمینۂ مصارف بھی کیا گیا۔ اس کام پر جو خزینہ صرف کیا جا سکتا تھا اس کا زیادہ تر حصہ اس وقت تک مستقل پختہ نہروں کی تعمیر و ترمیم ہی میں لگا دیا گیا۔"

ایسٹ انڈیا کمپنی نے پنجاب میں جو اہم ترین نہر بنائی تھی وہ بڑی نہر "دوآبہ" کہلاتی تھی اور ۴۵۰ میل لمبی تھی۔ اس عظیم الشان نہر کی تعمیر کے لئے ہندوستان جان لارنس اور لارڈ ڈلہوزی کا ممنون احسان ہے۔ جان لارنس بالاصرار حکومت ہند سے ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ ہندوستان میں نہروں اور سڑکوں کی سخت ضرورت ہے اور اس کا وعدہ یہ تھا کہ ان سے مالگزاری میں اتنا اضافہ ہو جائے گا جس سے مصارف کے وہ چند رقم فوری واپس مل جائے گی۔ لاہور کی مجلس نے لکھا تھا کہ "اگر ہم ہزاروں آدمیوں کی پرورش کرنا چاہتے ہیں جو انقلاب حکومت کی وجہ سے لازمی طور پر بے روزگار ہو گئے ہوں گے تو ہم اس سے بہتر کام نہیں کر سکتے کہ نئی نہریں کاٹی جائیں اور قدیم نہروں کی تہ سے مٹی اور ریتی نکال کر ان کو درست کیا جائے۔" لارڈ ڈلہوزی نے جواب دیا کہ میں نے وسیع رقبے کی زمینیں ہر جگہ ایسی دیکھی ہیں جو کسی زمانے میں نہایت سرسبز و زرخیز ہوں گی لیکن اب پانی کی محتاجی کی وجہ سے بنجر سی نظر آتی ہیں۔ اگر ان کو پانی ملے تو یہ نہایت ہی زرخیز ہو جائیں گی۔" مجلس نظماء نے "خوشی خوشی اس کام کی منظوری

صادر کی یعنے "بڑی نہر دوآبہ" بنانے کی لیکن اس تنبیہ کے ساتھ کہ یہ کام "نہایت کفایت کے ساتھ" انجام دیا جائے۔

بیرڈ اسمتھ شمالی ہند کی آبپاشی کا ایک ممتاز ترین اور مستند ماہر فن مانا جاتا تھا جب وہ اپنی رخصت کے زمانے میں یورپ گیا تو لمبارڈی اور پیڈمانٹ کی عظیم الشان نہروں کا معائنہ کرنے کے لیئے اطالیہ بھی گیا اور بعد میں اسی غرض سے جب وہ ممالک متحدہ امریکہ گیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کے سب مصارف لاحقہ ادا کیئے۔ یہ کہنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "بڑی نہر دوآبہ" کا کام زور و شور کے ساتھ چلنے لگا۔ ہوئی سنہ ۱۸۵۶ء تک ۳۲۵ میل سے بھی زیادہ دور تک نہر کھودی گئی اور توقع کی جاتی تھی کہ یہ کام سنہ ۱۸۵۹ء تک تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ اس کے جملہ مصارف دس لاکھ پونڈ انگلیشیہ تخمینہ کیئے گئے تھے اور توقع تھی کہ اس سے ۱۲۰۰۰۰ پونڈ سالانہ آمدنی ہوگی یعنے جملہ مصارف پر ۱۲ فیصدی وصول ہوں۔

صوبۂ بمبئی میں نربدا اور تاپتی کے سوا جن سے صرف چند اضلاع سیراب ہوتے تھے کوئی اور بڑے دریا نہ تھے اور دکن کی سطح زمین ایسی مرتفع تھی کہ وہاں نہروں کے ذریعے آبپاشی کرنے کا موقع نہ تھا۔ باؤلیوں اور تالابوں سے آبپاشی کرنے کی طرف کمپنی کے عاملوں نے معقول توجہ نہیں کی تھی۔ سندھ میں دریائے سندھ کی طغیانی پر کاشت کا انحصار تھا اور وہاں قدیم نہریں جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جن سے اس دریا کا پانی اراضی میں تقسیم ہوتا تھا ان نہروں کی نگہداشت پر کمپنی سالانہ ۳۵۰۰۰ پونڈ صرف کرتی تھی!

مدراس میں قدیم راجاؤں اور پالی گاروں نے متعدد تالاب اور پانی کے خزانے تعمیر کیئے تھے جن کے اب صرف کھنڈر رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر فرانسس بکانن نے سنہ ۱۸۰۰ء میں مدراس سے مغربی ساحل تک اپنی سیاحت کے اثنا میں ان کے متعلق تفصیلی طور پر لکھا ہے۔ ان قدیم ذرایع آبپاشی کی بالالتزام مرمت و درستی جس سے یہ ازسرنو کارآمد بن جائیں اور حفاظت ضروری نیز جہاں جہاں انکی سخت ضرورت محسوس ہوتی تھی وہاں نئے تالابوں کا کھودنا اور خزانہ ہائے آب تعمیر کرنے سے پچاس ساٹھ سال کے بعد ملک کی ہیئت میں تغیر عظیم ہونا لازمی تھا۔ اور اس طرح

جب سرکار برطانیہ کو اس صوبے کی تفویض عمل میں آئی اسوقت تک یہاں کی زراعت اور آبادی قحط و امساک باراں کے اثرات سے بالکل محفوظ ہو گئی تھی لیکن کمپنی نے آبپاشی سے بالکل بے اعتنائی برتی اور جب کبھی کسی کلکٹر نے کسی قدیم خزانہ آب کی مرمت کی بھی تو محض اس غرض سے کہ اپنے ضلع کے سنگین محصول اراضی میں اس سے اور اضافہ ہو جائے۔

صوبۂ مدراس میں چند خطے ایسے بھی ہیں جہاں نہروں سے اعلیٰ پیمانے پر آبپاشی ممکن ہے اور یہ خطے گوداوری کرشنا اور کاویری کے دہانے ہیں۔ انیسویں ۱۹ صدی عیسوی کے ابتدا ہی میں اصحاب غور و فکر اس بات سے واقف تھے کہ ان دریاؤں سے آبپاشی ممکن تھی۔ جسطرح شمالی ہند کی آبپاشی بیرڈ اسمتھ اور اس کے رفقائے کار کی طرف منسوب کی جاتی ہے اسی طرح جنوبی ہند کی عظیم الشان نہروں کی تعمیر سر آرتھر کاٹن کے نام نامی کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور ابدالآباد تک کی جائے گی۔

کولرون دریائے کاویری کی ایک شاخ ہے اور تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ کولرون کے ذرائع آبپاشی کی ابتدا جن کو قدمائے ہند نے تعمیر کیا تھا سنہ عیسوی کی دوسری صدی سے ہوتی ہے جب سنہ ۱۸۰۱ع میں یہ ملک انگریزوں کے زیر انتظام آیا اس وقت ان قدیم ذرایع آبپاشی کی حالت ناگفتہ بہ تھی دریا کی تہ میں مٹی اور ریتی آ آکر جم گئی تھی اور آبپاشی کی زمینوں کا رقبہ روز بروز کم ہو رہا تھا۔ شمالی ہند میں جمنا کی نہریں ایسی کامیاب ثابت ہوئیں کہ جنوبی ہند میں کولرون کے ذرایع آبپاشی کی اصلاح و ترقی کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۳۶ع سے زور و شور کے ساتھ یہ کام مسلسل چلتا رہا کولرون کی بالائی اور زیریں چادروں کی تعمیر پر .... ۸ پونڈ سے کچھ زیادہ ہی صرف کیے گئے اور ضلع تنجور نیز ترچناپلی اور جنوبی ارکاٹ کے کچھ حصے ہیں ذرائع آبپاشی کو توسیع دینے میں ..... ا پونڈ کی مزید رقم خرچ ہوئی تھی۔ کولرون اور کاویری سے جو اراضی سیراب ہوتی تھی اس کا رقبہ .....۶۳ ایکڑ سے .... ۱۶, ۷ ایکڑ ہو گیا تھا۔ اور مالگزاری میں بھی سالانہ .... ۴۴ پونڈ کا اضافہ ہوا تھا۔ اس حساب سے مصارف پر ۲۴ فیصدی سے بھی زیادہ وصول ہوتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کارِ عظیم کی کامیابی اور اس کے نفع بخش نتائج کو اپنے ہی طرف منسوب کر لیا حالانکہ سب کچھ سر آرتھر کاٹن نے کیا تھا کیونکہ سب سے پہلے اسی کو اس کا خیال پیدا ہوا تھا چنانچہ اس نے کولرون کے بالائی پشتے کی تعمیر باوجود کمپنی کی مخالفت کے شروع کی تھی کاٹن کی پیدائش سنہ ۱۸۰۳ء میں ہوئی تھی اور سنہ ۱۸۲۱ء میں وہ مدراس آیا تھا سنہ ۱۸۶۰ء میں خدمت سے سبکدوش ہو کر ہندوستان سے وطن جانے کے قبل ہی اس نے وہ شہرت حاصل کر لی تھی جو ہندوستان کے کسی دوسرے انجینیر کو کبھی حاصل ہی نہیں ہوئی شمالی ہند کے ناظم آبپاشی مسمی بیرڈ اسمتھ نے لکھا تھا کہ "جس وقت سخت مشکلیں درپیش تھیں۔ اس کے ذرائع بالکل محدود تھے۔ اور بہت کچھ مخالفت ہو رہی تھی اس وقت صرف اپنی ذاتی ذمہ داری پر کرنل کاٹن نے بڑی ہمت کی جو کولرون کے بالائی پشتے کی تعمیر شروع کر دی اور اب تنجور کی دوامی خوشحالی زیادہ تر اسی دریا کی آبپاشی پر مبنی ہے۔"

کولرون کے ذرائع آبپاشی کی تعمیر پر آرتھر کاٹن کا بڑا نام ہو گیا اسی لئے گوداوری کے ذرائع آبپاشی کی تعمیر کے وقت (جن پر اس شہرت کا زیادہ تر انحصار ہے) اس کام کی ذمہ داری لینے کا سب سے زیادہ اہل یہی شخص سمجھا گیا اس نے راجمندری سے (جو قدیم زمانے میں ہندو راجاؤں کا پائے تخت رہا تھا) چند میل کے فاصلے پر ایک مقام کا انتخاب کیا اور دریا پر ایک عظیم الشان چادر تعمیر کی جس کو چار حصوں میں منقسم کیا تھا اور جن کی تعمیر میں دو ٹاپوؤں کو جو دریا کے بیچ میں واقع تھے کام میں لایا تھا۔ اس تعمیر کا تخمینہ مصارف ۲۶۴۰۰۰ پونڈ ہوا تھا گر ایسٹ انڈیا کمپنی اس کام کو نفع بخش سمجھی تھی اور توقع کرتی تھی کہ اس سے مالگزاری میں ۲۰۰۰۰ پونڈ یعنے سالانہ ۱۰۰ فی صدی کا اضافہ ہو جائے گا۔[1]

---

[1] یادداشت دربارۂ اصلاحات وغیرہ بابتہ سنہ ۱۸۵۸ء عیسوی۔

آخر کو اس تعمیر وغیرہ کے مصارف بہت زیادہ ہو گئے تھے اور آبپاشی کے ان مفید و نفع رساں کاموں کے لئے سرمایہ فراہم کرنے پر نہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہی رضامند تھی اور نہ نظم و نسق تاج جو کمپنی کے بعد قائم ہوا راضی تھا در ان حالیکہ ریلوں پر بے حساب روپیہ لٹایا جا رہا تھا۔ جب سنہ ۱۸۵۸ء میں

اب صرف دریائے کرشنا رہ گیا تھا۔ ۱۸۵۳ء میں اس دریا پر بھی ایک چادر تعمیر کی گئی۔ ابتداءً اس کا تخمینۂ مصارف ۵۵۰۰۰۰ پونڈ ہوا تھا۔ اور مالگزاری میں ۶۰۰۰۰ پونڈ بیشی یعنی جمعمل رقم مصارف پر ۳۹ فی صدی سالانہ اضافے کی توقع کی جاتی تھی۔

۱۸۵۸ء سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے جن ذرائع آبپاشی کی تعمیر اپنے ذمے لی تھی وہ مذکور الصدر رہی ہیں۔ ان کے مصارف کثیر ہوئے تھے اس لئے کمپنی ایک ایسی واجبی آمدنی کی توقع رکھنے میں تو حق بجانب تھی جو ایک مبنی بر اعتدال شرح مقرر کر دینے سے ہو سکتی تھی۔ لیکن مذکور الصدر اعداد سے واضح ہوتا ہے کہ کمپنی نے اس سے بھی تجاوز کیا تھا بالخصوص سیاہ بخت صوبہ مدراس میں مالگزاری میں جس قدر اضافہ ممکن تھا اس قدر کر دیا تھا جس کی وجہ سے کمبخت کاشتکاروں کی حالت ویسی ہی افلاس زدہ رہی جیسی پہلے تھی۔ اگر کوئی مالک اراضی اپنی اسامیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے تو بمشکل اس کو فیاض اور دانشمندی کہا جائے گا چہ جائیکہ ایک مملکت عظیم کی حکومت ایک کثیر زرعی آبادی کے ساتھ۔ ہر روشن رائے اور صاحب بصیرت حکومت کا مقصد اولین یہی ہونا چاہئے کہ رعایائے ملک کی ترقی دولت ہو، اور ملک میں اجتماع اصل ہوتا ہے۔

ذرائع آبپاشی کی سرگزشت سے ہندوستان کی ریلوں کی سرگزشت بالکل

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ کی مجلس منتخبہ نے سر آرتھر کاٹن کی شہادت قلمبند کی اس وقت کاٹن نے ان امور کا بھی ذکر کیا بتیس ۳۲ سال کی لگاتار کوششوں کے بعد آبپاشی کے لئے صرف سات لاکھ پونڈ منظور ہوئے تھے یعنی سالانہ بیس ۲۰ ہزار پونڈ کے حساب سے اور وہ بھی ایسے کام کے لئے جو ابتدا ہی سے بے انتہا کامیاب ثابت ہوا تھا...... جو مابہ البحث ہے وہ صرف یہی ہے کہ آبپاشی سے ۲۷ فی صدی آمدنی ہو گی یا ۴۰ فی صدی اور بتیس ۳۲ سال کے بعد بھی منجملہ دس لاکھ ایکڑ کی آبپاشی اب ہو رہی ہے .... اسی زمانے میں ناگپور تک ۶۰ میل ریل کی سڑک تعمیر کرنے کے پانچ لاکھ پونڈ مصارف ہوئے تھے اور یہ مسلمہ تھا کہ ۴ فی صدی آمدنی بھی اس سے نہ ہو گی لیکن کسی کو اس پر اعتراض نہ تھا۔"

(جنرل سر آرتھر کاٹن۔ اس کے سوانح حیات اور کارنامے" مولفہ لیڈی ہوپ صفحہ ۳۴۶)

مختلف النوع ہے۔ ذرائع آبپاشی کی ابتدائے تعمیر ہی سے سرکار کو منافع ملتا تھا اور خوب ملتا تھا لیکن ریلوں پر جو مصارف ہوتے تھے ان کا واجبی معاوضہ تک حاصل نہ ہوتا تھا۔ سرکار نے ذرائع آبپاشی کو آمدنی کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا لیکن ریلوں سے سال بسال سرکار کو نقصان ہی نقصان ہو رہا تھا۔ آبپاشی سے فصل ہوتی تھی۔ پیداوار میں اضافہ ہوتا تھا اور امساک باراں کی بنا پر قحط کی کبھی نوبت نہیں آتی تھی ریلوں سے قحط کے زمانے میں قحط زدہ مقامات کو غلہ وغیرہ لیجانے میں مدد ملتی تھی مگر پیداوار میں تو کچھ اضافہ نہیں ہوتا تھا۔

ان حالات کے لحاظ سے ہندوستان کے سے ایک زرعی ملک کی حکومت سے فطرتاً یہی توقع ہو سکتی تھی کہ وہ بمقابل ریلوں کے ذرائع آبپاشی کی زیادہ طرفدار ہوگی، لیکن انگریز خود اپنے ملک میں نہروں کے بہ نسبت ریلوں سے زیادہ واقف تھے اور انھوں نے ہندوستان کی ضرورتوں کے سمجھنے میں یہی غلطی کی۔ برطانوی صناعوں کا بھی یہی خیال تھا کہ بمقابل نہروں کے سے ان کے تجارتی مال کی کھپت جیسے لیئے ہندوستان میں اندرون ملک نکاس نکل آئے گی اور ہندوستان میں ریلوں کی توسیع اور ان کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیئے خواہ اس سے ملک کے محاصل کا نقصان ہی کیوں نہو ایسٹ انڈیا کمپنی اور سرکار برطانیہ دونوں کے نظم و نسق پر پارلیمنٹ مسلسل دباؤ ڈالتی رہی تھی اور رعایائے ہند اس بارے میں بالکل بے دست و پا تھی کیونکہ نہ تو رعایا کو حق انتخاب حاصل تھا اور نہ حکومت عاملانہ میں رعایا کا کوئی نمایندہ شریک تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے ذرائع آبپاشی سے بے اعتنائی برتی اور ملک کی فوری ضرورتوں اور مقدور سے بڑھکر ریلوں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہی پسند کیا۔

ایسٹ انڈین ریلوے کمپنی اور گریٹ انڈین پننشیولا ریلوے کمپنی کے نام سے دو غیر سرکاری انجمنیں ۱۸۴۹ء میں قائم ہوئیں لیکن ان انجمنوں کے بانیوں نے دیکھا کہ بلا امداد سرکار اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے سرمایہ فراہم کرنا ان کے لئے ناممکن تھا اس لئے حکومت کمپنی سے انھوں نے استدعا کی۔ بڑی ردّ و قدح کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظما اس شکل میں امداد دینے پر راضی ہو گئے کہ ریلوں کے

سرمائے پر صرف سود کے وہ ذمہ دار و کفیل ہوں گے اور وہ بھی اس شرط پر کہ اگر ریلوے کمپنی کے صرف شدہ اصل پر خالص آمدنی ۵ فی صدی سے کم ہو تو حکومت ہند ہندوستان کے محاصل سے اس کی تکمیل کر دے گی۔ برخلاف اس کے اگر خالص آمدنی ۵ فی صدی سے زیادہ ہو تو اس اضافے کا نصف ریلوے کمپنی کو اور نصف سرکار کو ملے گا۔ مثلاً ریلوں کی آمد و رفت سے صرف شدہ اصل پر صرف ۴ فی صدی اگر آمدنی ہو تو حکومت ہند شرح سود کی جس کی وہ کفیل ہے گی تکمیل کے لئے اپنی طرف سے ایک فی صدی ادا کرے گی۔ برخلاف اس کے اگر ۷ فی صدی آمدنی ہو تو ریلوے کمپنی کے حصہ دار اس میں سے ۶ فی صدی خود لے لیں گے اور ایک فی صدی سرکار کو دیں گے۔ ریلوے کمپنی کا تمام انتظام خود اسی کے ہاتھ میں رہے گا۔

یہ بھی قرار داد ہوا تھا کہ اگر کمپنی چاہئے تو چھ ماہ قبل باضابطہ اطلاع دینے کے بعد اپنے تمام کاروبار سے دست بردار ہو جائے اور پھر حکومت پر یہ لازم تھا کہ وہ تمام صرف شدہ سرمایہ کمپنی کو واپس دیدے۔ حکومت اس بات کی مجاز تھی کہ پچیس اور پھر پچاس سال کی میعاد کے انقضا پر ریلوے کمپنی کے حصص کی رائج الوقت قیمت دیکر لائن خود خرید لے۔ ننانوے ۹۹ سال کے بعد کمپنی کا کارخانہ اور اراضی خود بخود سرکار پر منتقل ہو جاتی تھی لیکن اس وقت انجن اور ریل کے گاڑیوں کو ایک قیمت مقررہ پر سرکار کو خریدنا پڑتا تھا۔

ایسٹ انڈین ریلوے۔ ۱۸۵۴ء میں آمد و رفت کے لئے صرف ۳۷½ میل تک اس ریل کا افتتاح ہوا تھا اور فروری ۱۸۵۵ء میں کلکتے سے رانی گنج تک ۱۲۱ میل تک گاڑی چلتی تھی۔ لارڈ ڈلہوزی نے اس زمانے میں ہندوستان کے لئے ایک ایسے عام نظام کا منصوبہ سوچا تھا کہ ریلیں گاڑیوں کو بدلے بغیر ایک مقام سے دوسرے مقام تک سیدھی چلی جائیں اس کے بعد دوسرا اقرار نامہ کمپنی اور سرکار کے مابین یہ ہوا تھا کہ کمپنی دہلی تک ریل کی توسیع کرے گی اور اس پر جو کچھ مصارف ہوں گے ان پر ۴½ فی صدی سود کی حکومت کفیل و ذمہ دار رہے گی لیکن آمد و رفت کے لئے اس لائن کے افتتاح سے پہلے غدر ہو گیا اور غدر کے بعد ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی ختم ہو گئی۔

گریٹ انڈین پنینسولا ریلوے۔ بمبئی سے کلیانی یعنی ۳۴ میل تک ۱۸۵۴ء میں پٹریاں بچھانے کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اسی سال نومبر میں اسی ریلوے کمپنی نے مصارف پر ۴½ فیصدی سود کی کفالت پر اس لائن کی توسیع کرنا قبول کر لیا تھا" لیکن جدید حصص اجرا کیے گئے سود بھی ۵ فیصدی کر دیا گیا ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے مزید ۴۵ میل تک ریل کی سڑک تیار ہو چکی تھی ؛

مدراس کی ریلیں۔ اس لائن کا پہلا حصہ جو مدراس سے ارکاٹ تک ۶۵ میل لمبا تھا جولائی ۱۸۵۶ء میں لوگوں کی آمد رفت کے لئے کھول دیا گیا مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختتام نظم و نسق تک اس لائن میں مزید توسیع نہیں ہوئی۔ نومبر ۱۸۵۸ء تک جب شہنشاہی ہند کا نظم و نسق براہ راست سرکار برطانیہ کے قبضے میں آ گیا تو ان مذکور الصدر تین کمپنیوں کی ریلوں کے سوا ہندوستان میں کوئی اور ریل نہیں تھی۔

مذکور الصدر تینوں ریلوں میں نقصان ہی نقصان ہو رہا تھا حکومت ہند نے جس حد تک سود کی کفالت قبول کر لی تھی اور اس کی تکمیل میں ریلوے کمپنیوں کو سال بسال جس قدر رقم اس کو دینی پڑتی تھی اس کی تفصیل ذیل میں درج ہے ؛

کفالت سود کے حساب میں حکومت ہند نے جسقدر رقم ادا کی

سنہ عیسوی	ایسٹ انڈین ریلوے	گریٹ انڈین پنینسولا ریلوے	مدراس ریلوے
	پونڈ	پونڈ	پونڈ
۱۸۴۹	۵۶۰۲	۰	۰
۱۸۵۰	۱۷۴۷۱	۳۰۶۲	
۱۸۵۱	۳۷۱۸۵	۶۳۱۹	
۱۸۵۲	۴۵۲۳۴	۱۶۳۱۰	
۱۸۵۳	۵۲۰۷۱	۲۲۸۲۵	
۱۸۵۴	۸۸۸۸۴	۲۵۰۰۲	۹۷۰۳
۱۸۵۵	۱۹۵۷۳۰	۳۰۲۵۹	۱۸۱۱۵

۱۸۵۶	۲۹۷۳۹۰	۶۰۳۷۰	۴۲۵۱۰
۱۸۵۷	۳۵۴۵۱۱	۱۱۶۶۱۲	۸۱۱۳۹
۱۸۵۸	۴۴۳۹۶۸	۱۷۵۲۸۹	۱۰۹۲۶
جملہ	پونڈ ۱۵۲۸۰۴۶	پونڈ ۴۵۶۰۴۹	پونڈ ۲۶۰۰۳۴

ہندوستان میں سال بسال ریلوں میں جیسی جیسی توسیع ہوتی گئی ویسے ویسے رعایا کا نقصان ہوتا گیا۔ لیکن جب تک حکومت سود کی کفیل رہی اس وقت تک ریلوے کمپنیوں کو آمدنی ہوتی رہی اور ہندوستان کے ہر حصے میں ریلیں چلانے کے لئے نئی نئی کمپنیاں قایم ہوتی گئیں۔ مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہتمام نظم ونسق سے پہلے سندھ ریلوے کمپنی جس کے حلقۂ عمل میں پنجاب بھی داخل تھا بمبئی بڑودہ اینڈ سنٹرل انڈین ریلوے کمپنی۔ ایسٹرن بنگال ریلوے کمپنی گریٹ سوتھ آف انڈیا ریلوے کمپنی۔ کلکتہ اینڈ سوتھ ایسٹرن ریلوے کمپنی غرض یہ سب کمپنیاں قائم ہوچکی تھیں لیکن ان کی لائنوں کا افتتاح نہیں ہوا تھا۔

برطانوی صناعوں اور تاجروں کو یہ تعویق بڑی شاق گزر رہی تھی۔ آخرکار ۱۸۵۸ء میں دارالعوام نے "اس تعویق کے اسباب دریافت کرنے کیلئے" ایک مجلس مقرر کی تحقیقات کے بعد اس مجلس نے رپورٹ پیش کی کہ اس تعویق کے حسب ذیل وجوہ تھے۔ اس کام پر نگرانی سرکار کا التزام۔ انگلستان سے ہندوستان کی بُعدِ مسافت، فتنہ وفساد اور بغاوت وغدر ملک میں نظری موانعات ومشکلات وغیرہ اس مجلس نے یہ بھی بیان کیا کہ

"(۱) تعمیرات عامہ کے ایسے عظیم الشان کاموں کا سرانجام سرکار نے جو خانگی کمپنیوں کے سپرد کردیا بہت بڑی عقلمندی کی۔"

(۲) عامۃ الناس کی ترغیب کے لئے تاکہ وہ اس پیمانے کے جدید کاروبار میں اپنا سرمایہ لگائیں حکومت کا اس سرمایے پر جس کی ضرورت تھی سود کی کفالت قبول کرلینا ایک لازمی امر تھا۔

"(۴) ہندوستان کے محاصل کو صرفِ بیجا سے بچانے اور خود حصہ داروں کے اغراض کی حفاظت کے لئے ریلوے کے کاروبار پر سرکاری نگرانی بھی نہایت ضروری ہے۔"

یہ قرین قیاس ہے کہ اگر اس مجلس میں رعایائے ہند کی طرف سے کوئی نمایندہ شریک رہتا یا کم سے کم کثیر التعداد ہندوستانیوں کی شہادت ہی اس مجلس نے لی ہوتی تو پھر اس مجلس کی رائے بھی بالکل بدل گئی ہوتی اور ممکن تھا کہ یہ نتیجہ نکالا جاتا کہ ہندوستان کے محاصل کو صرف بیجا سے بچانے کے لئے کفالتِ سود کے نظام کے تحت ہندوستان میں ریلیں نہ بنائی جائیں بجز اس کے کہ کوئی سیاسی اشد ضرورت درپیش آئے۔ نیز یہ کہ دوسری سب ریلیں خانگی کمپنیوں ہی پر چھوڑ دی جائیں اور اہم ترین یہ کہ ہندوستان میں نہریں ہی عام طور پر مگر بالخصوص قحط و امساکِ باران کے زمانے میں حمل ونقل کا ایک کم مصارف ذریعہ ہونے کی بنا پر دراصل رعایا کے زیادہ مناسب حال تھیں۔

بارھواں باب

نظم و نسق

۱۸۳۴ء میں کمپنی کے جس منشور کی تجدید ہوئی تھی اس کی میعاد ۱۸۵۴ء میں ختم ہونے والی تھی۔ اس کی مکرر تجدید کا مسئلہ زیر غور تھا اور حسب معمول دارالعوام اور دارالامرا کی مجالس منتخبہ نے کمپنی کے سابقہ نظم و نسق کے متعلق تحقیقات شروع کر دی۔ ان مجالس منتخبہ نے جو شہادت قلمبند کی تھی اس کو سرکاری رپورٹوں کی شکل میں شائع کیا گیا تھا اور انھیں رپورٹوں میں ملکۂ وکٹوریہ کے ابتدائی عہد کی تاریخ ہند کا نہایت قابل قدر مواد موجود ہے۔

دارالامرا کی مجلس منتخبہ کا انعقاد ۱۸۵۲ء میں ہوا تھا اس مجلس نے کاسمو ملول سر جورج کلارک جان اسٹوارٹ مل کے سے اہم گواہوں کے علاوہ دوسرے اور باوقعت اشخاص کی بھی شہادت لینے کے بعد جون ۱۸۵۲ء میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ ۵۳-۱۸۵۲ء میں دارالامرا کی ایک اور مجلس منتخبہ کا اجلاس ہوا جس نے اگست ۱۸۵۳ء میں تین رپورٹیں پیش کیں۔ اس مجلس نے جن گواہوں کی شہادت قلمبند کی تھی ان میں ہندوستان کے ایسے مشاہیر بھی شامل تھے جیسے لارڈ ہارڈنگ لارڈ گوف۔ سر چارلس نے پیر۔ سر ایڈورڈ رائن۔ سر آرسکن پری۔ سر چارلس ٹریویلین۔

فریڈرک ہیلی ڈے ۔ جورج کیمبل ۔ الگزانڈر ڈف ۔ جان مارشمن اور ہارس ہیمن ولسن اسی طرح دارالعوام کی مجلس منتخبہ بھی جو لارڈ جان رسل وزیر مال اور سر چارلس وڈ کابڈن ۔ گلیڈسٹن وغیرہ ارکان پارلیمنٹ پر مشتمل تھی ۱۸۵۲ء میں منعقد ہوئی اور لارڈ الفنسٹن ۔ لارڈ ایلنبرو ۔ لارڈ ہارڈنگ ۔ سر جورج کلارک ۔ کاسمو ملول ۔ ہنری ٹوبی پرنسیپ وغیرہ گواہوں کی شہادت لینے کے بعد جون ۱۸۵۲ء میں اس مجلس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ۔ دارالعوام کی ایک اور مجلس منتخبہ جس کے مذکورالصدر اشخاص کے علاوہ مسٹر لارڈ اسٹینلی اور لارڈ پامرسٹن بھی ارکان تھے ۔ پارلیمنٹ کے ۱۸۵۲-۵۳ء کے اجلاس کے اثنا میں منعقد ہوئی اور اس مجلس نے سر جورج کلارک ۔ سر ایڈورڈ رائن سر ارسکن پری سر چارلس ٹریویلین، فریڈرک ہیلی ڈے ۔ ہے کیمرآن ۔ مارٹنر برڈ، ڈاکٹر رویل جان ۔ سلیون ۔ جان مارشمن وغیرہ گواہوں کی شہادت قلمبند کرنے کے بعد ۱۸۵۳ء میں مئی اور اگست کے درمیان چھ رپورٹیں پیش کیں ۔

اس باب کی مختصر گنجایش میں اس شہادت کا جو چار ہزار صفحوں کی گیارہ رپورٹوں میں پیش ہوئی تھی خلاصہ کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے ۔ البتہ ہم سے یہ ممکن ہے کہ ہم قارئین کے سامنے اس زمانے کے چند اہم ترین مسائل پر اس زمانے کے چند ممتاز و سربرآوردہ اشخاص کے خیالات و آراء پیش کر دیں ۔ ملکۂ وکٹوریہ کے ابتدائی عہد کے نظم و نسق ہند پر ایسے اشخاص کے خیالات و آراء کی مدد سے جنھوں نے خود اس نظم و نسق میں حصہ لیا تھا تبصرہ کرنے میں یہ خاص فائدہ ہے کہ ہمیں صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ نظام کیا تھا بلکہ یہ بھی کہ وہ کس طرح چلتا تھا اور صرف اسی بات سے واقفیت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کیا اصول تھے جو منتظمین مملکت کے رہنمائے کار رہے تھے بلکہ اس سے بھی کہ خود نظم و نسق کی شکل و ہیئت اس وقت کیسی تھی کیونکہ ان لوگوں کے (جنھوں نے شہنشاہی ہند کی کثیر آبادی میں رہ کر نظم و نسق کا کام کرتے کرتے تیس چالیس سال اپنی عمر کے گزار دیے تھے) بیانات پڑھنے کے بعد نظم و نسق کی یہ جیتی جاگتی تصویر ہمارے آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے

دو عملی

۱۸۱۶ء کے قانون ہند مرتبہ پٹ کے نفاذ کے بعد ۱۸۳۴ء کا قانون ہند نافذ

ہوا جس کی رُو سے ہندوستان میں دو عملی قائم ہوگئی۔ چنانچہ نظم ونسق کے اختیارات تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے چوبیس (۲۴) نظماء ہی کے تفویض رہے لیکن نگرانی کے اختیارات مجلس نظم کو جس کے ارکان کا انتخاب خود سرکار برطانیہ کرتی تھی دے دیئے گئے سنہ ۱۸۳۳ء سے کمپنی کی تاجرانہ حیثیت باقی نہیں رہی تھی بلکہ وہ محض منتظم مملکت ہند بن گئی تھی۔ اور یہ بھی شرط لگادی گئی تھی کہ نظمائے کمپنی کے تمام اختیارات پر بجز ان تقررات کے جنکی اس قانون میں تخصیص کردی گئی تھی۔ مجلس نظم کی نگرانی رہے گی۔ ہر بات کی ابتدا مجلس نظماء کے ہاتھوں میں تھی اور ہر بات پر نگرانی مجلس نظم کے ذمے تھی۔ سہولت کار کے خیال سے چوبیس (۲۴) نظماء نے اپنی تین (۳) مختلف مجالس قائم کرلی تھیں جن کے حسب ذیل نام تھے:-

"مجلس مالیات" "سیاسی اور فوجی معاملات کی مجلس" "مالگزاری اور عدالتی معاملات کی مجلس"۔

البتہ ایک اہم امر ایسا تھا جس کے آغاز کرنے کا مجلس نظماء کو کچھ اختیار نہ تھا اور وہ صلح وجنگ تھی جس کو مجلس نظم بلا امتزاج نظمائے کمپنی کمپنی کی "مجلس معاملات راز" کے توسط سے خود کرتی تھی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تمام اُمور جن کی سیاسی اہمیت بہت بڑی تھی اور جن میں صلح وجنگ کا مسئلہ بھی شامل تھا ایک طرح براہ راست وزیر دولت برطانیہ ہی کی زیرہدایت و نگرانی تھے کیونکہ اس بارے میں جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ صرف ہندوستان کے حکام صدر کی اطلاع سے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی "مجلس معاملات راز" کے توسط سے جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظماء کو کچھ دخل نہ تھا ہوتا تھا"۔

کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مجلس نظم کے میر مجلس کی ایما سے جو برطانوی کابینہ کا رکن ہوتا تھا اور مجلس نظماء کے علم کے بغیر ہندوستان لڑائیوں میں اکثر پھنس جاتا تھا۔ اگر اس معاملے میں مجلس نظماء کو بھی کچھ اختیار ہوتا تو پھر جنگ افغان جس کی لارڈ آکلینڈ نے ابتدا کی تھی اور "جس میں ۱۵۰۰۰ جانوں کا اتلاف اور لاکھوں روپیے کے مصارف عائد ہوئے تھے شاید کبھی وقوع ہی میں نہ آتی"۔ سر ٹی۔ ایچ۔ میڈکس نے دارالعوام کی مجلس منتخبہ کے سامنے سنہ ۱۸۵۲ء میں اپنی شہادت میں بیان کیا تھا کہ "جنگ برما کے آغاز کے اسباب اس کی وقتاً فوقتاً کیفیت اور موجودہ حالت کا مجلس نظماء کو کچھ بھی علم نہیں۔

میں نے دو مرتبہ اُس کے کاغذات مانگے تھے لیکن مجھ سے دو دفعہ یہی کہا گیا کہ ان کاغذات کا مجلس نظماء کو بھیجنا نامناسب خیال کیا جاتا ہے۔"

یہاں یہ بتانا ضروری نہیں کہ اس غیر اطمینان بخش انتظام سے یہ ہوتا تھا کہ لارڈ پامرسٹن کے سے شہنشاہی پسند وزرائے برطانیہ محض انگلستان کے شہنشاہی اغراض کی خاطر ہندوستان کو جنگ و مہمات میں پھنسا دے سکتے تھے اور دیتے تھے اور مجلس نظماء کو ان جنگ و جدل کے مصارف جو اس کی رضامندی یا علم کے بغیر ہوتے تھے ادا کرنا پڑتا تھا۔ پہلے ہی سے مجلس نظماء متعدد قصور و خطا کی جواب دہ تھی اب اس نے یہ گناہ اور کیا کہ ہندوستان کے ایک قدیم قانون کا غلط منشا نکال کر دیسی ریاستوں کا الحاق کرنا شروع کر دیا جس سے اسکا جلد خاتمہ ہونے کی صورت پیدا ہو گئی۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے ابتدائی عہد کی بد سے بدتر لڑائیوں کی مثلاً جو افغانستان، سندھ اور برما سے ہوئی تھی از روئے انصاف مجلس نظماء جواب دہ و ذمہ دار نہیں تھی۔

دستورِ حکومت کے اس نقص سے قطع نظر کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلاشبہ یہ دوعملی عملاً کچھ ایسی بری نہ تھی۔ اس سے ایک طرف تو نظمائے کمپنی پر نگرانی رہتی تھی جس کی ضرورت بھی تھی اور دوسری طرف وزرائے دولت برطانیہ کو مطلق العنان اور غیر ذمہ دارانہ اختیارات ملنے سے جو خرابی پیدا ہو سکتی تھی وہ نہیں ہونے پائی تھی۔ لارڈ ہارڈنگ نے جو سب سے زیادہ دانشور و قابلِ گورنر جنرل گزرا ہے سنہ ۱۸۵۲ء میں دارالعوام کی مجلس منتخبہ کے سامنے اپنی شہادت میں کہا تھا کہ "سرکار برطانیہ کو عوام کے سامنے زیادہ نمایاں طور پر ہر وقت پیش کرنے کے بجائے اس دوعملی کا ہونا ہی زیادہ مصلحت اور دانائی پر مبنی ہے" اس کے علاوہ انیسویں (۱۹) صدی عیسوی کے انگریزوں کے سب سے زیادہ پُر مغز دور اندیش فیلسوف حکیم یعنے جان اسٹوارٹ مل نے اس نظام کو پسند کیا تھا۔ مل سنہ ۱۸۵۸ء تک یعنے تیس (۳۰) سال تک چونکہ ہند کے صیغہ تنقیح مراسلات میں مددگار رہ چکا تھا اس لئے جس نظام کے تحت وہ کام کر رہا تھا اس کے متعلق زیادہ وثوق اور واقفیت کے ساتھ وہ بیان کر سکتا تھا۔

جان اسٹوارٹ مل کی شہادت

"یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ایک ملک میں کسی غیر ملک کے لئے ایک ایسا عضوِ حکومت

اختراع کیا جائے جس کو خوبی حکومت سے زیادہ دلچسپی ہو۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی جماعت قائم کی جائے جس کو بری حکومت سے اقل درجہ دلچسپی ہو اور میرا تو خیال یہ ہے کہ ہندوستان معاملات کے تصفیے کے لئے اس ملک میں جو حکمراں جماعتیں اب موجود ہیں ان میں ہر قسم کی بدنیتی اور بدباطنی اس طرح مفقود ہے جس طرح دنیا کی کسی اچھی سے اچھی حکومت میں ہو سکتی ہے۔"

"مجلس نظماء صرف تحریک کنندہ جماعت ہے۔ آخری فیصلہ صادر کرنے والی جماعت نہیں اور حکام بالا کی بلا منظوری بطور خود کچھ نہیں کر سکتی اور محض استدلال کے سوا حکام بالا کو اپنی بات منوانے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ ان حالات میں اس قبیل کی جماعت ہی اپنی کارروائی کے تمام دلایل کی کمال احتیاط کے ساتھ چھان بین کر سکتی ہے۔ ورنہ اسی جماعت کو اختیار تحریک کے ساتھ ساتھ اختیار حکم آخر بھی مل جائے تو پھر یہ بات نہ رہے۔"

محض ایک وزیر ہند کے توسط سے ہندوستان پر حکمرانی کرنے سے "بڑھکر کوئی اور مطلق العنان حکومت اس ملک میں تو ہو نہیں سکتی کیونکہ ایسی حالت میں بحث مباحث اور غور و خوض کرنے کا موقع ہی نہیں بجز اس گفتگو کے جو وزیر ہند اور اس کے زیر دستوں میں شاید ہوتی ہو، لیکن وزیر ہند پر اپنے زیر دستوں کی صلاح اور مشورے کا سننا کچھ لازم نہیں ہے اور اگر لازم بھی ہو تو اس کے زیر دست جو کچھ صلاح و مشورہ دیں گے اس کے وہ ذمہ دار ہرگز نہ ہوں گے۔"

جان اسٹوارٹ مل کو اس رائے کا اظہار کیے پچاس سال گزر گیے اور اب ہمارے پنجاہ سالہ تجربے سے بھی اس فیلسوف اعظم کی دور اندیشی اور دانائی ثابت ہوتی ہے۔ ان پچاس برسوں میں جیسے جیسے عام تجربہ وسیع ہوتا گیا ہندوستان کے نظم و نسق میں بھی کئی طرح سے یقیناً اصلاح ہوتی گئی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وزیر ہند کی غیر ذمہ دارانہ حکومت سے نہایت ہی مضر نتائج مرتب ہوتے رہے۔ مجلس نظماء یا مجلس نظم کی جیسی نگرانی تھی ویسی حقیقی طور پر وزیر ہند کے افعال پر کسی کی نہ تھی۔ کمپنی کے منشور کی ہر تجدید کے وقت کمپنی کے نظم و نسق کے متعلق جیسی تحقیقات ہوتی تھی ویسی میعادی تحقیقات موجودہ نظم و نسق کے متعلق کبھی نہیں ہوئی۔ کمپنی پر جس طرح بدگمانی اور مفید نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ اس طرح

موجودہ حکومت ہند پر اس کے افعال کی روک تھام اور اصلاح کیلئے کوئی بدگمانی اور نکتہ چینی نہیں کی جاتی تھی۔ اسی لیے غیر ذمہ دارانہ نظم و نسق کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلا۔ صرف معاملات مالیہ ہی کو لیجئے کمپنی کے آخری پنجسالہ نظم و نسق میں ہندوستان کے محاصل اوسطاً تین کروڑ پونڈ انگلیشیہ تھے اور اس رقم میں سے صرف ۳۵ لاکھ پونڈ مطالبات وطن کی تکمیل کیلئے انگلستان ارسال ہوتے تھے لیکن ملکۂ وکٹوریہ کے عہد حکومت کے آخری سال (۰۰-۱۹۰۱ء) ہندوستان کے محاصل دوچند ہو گئے تھے۔ یعنے ریلوے اور آبپاشی کے وصولات کو چھوڑکر یہ پانچ کروڑ پچاس لاکھ پونڈ تھے حالانکہ شہنشاہی کی وسعت بعینہٖ پہلی سی تھی اور لوگوں کی دولت اور آمدنی میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہوا تھا اور اس پر مطالبات وطن کی تکمیل کیلئے ایک کروڑ ستر لاکھ سے بھی زیادہ رقم انگلستان ارسال ہوتی تھی یہ کثیر المقدار معاشی سوتا ؤ جو پچاس سال کے اندر اندر بتدریج گونہ بڑھ گیا تھا اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہوتی تو اس کے تحت بالکل ناممکن الوقوع تھا۔

برطانوی تاجروں کے خیالات

برطانوی تجار و صناع کی ہمیشہ خواہش یہی تھی کہ ہندوستان میں اچھا انتظام قائم رہے لیکن ان کو "اچھی حکومت سے زیادہ دلچسپی" نہ تھی اور نہ ہوسکتی تھی اور ظاہر ہے کہ صرف اچھی حکومت ہی سے اچھا انتظام قائم ہو سکتا ہے ان لوگوں کا مقتضائے فطرت ہی یہ تھا کہ فقط اپنے تجارتی اور صنعتی اغراض کو زیادہ تر پیش نظر رکھیں چنانچہ ان کا یہ خیال تھا کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی برخاست کردی جائے اور ہندوستان کو براہ راست وزیر دولت برطانیہ کے زیر نگرانی کر دیا جائے تو پھر اس وزیر پر دباؤ ڈال کر برطانوی تجارت کیلئے اس سے بہت کچھ سہولتیں حاصل کیجاسکتی ہیں اس لئے ہمیں اس پر تعجب نہیں ہوتا کہ مینچسٹر۔ برمنگھم اور لورپول کو لارڈ ہارڈنگ اور جان اسٹوارٹ مل سے اختلاف رائے تھا کیونکہ ان شہروں کی اصلاح یہی تھی کہ ہندوستان پر وزیر دولت برطانیہ کے توسط ہی سے حکومت کی جائے۔

شہر مینچسٹر کی طرف سے ایک عام جلسہ ہوا جس میں یہ تحریک منظور ہوئی کہ ہندوستان

میں بدنظمی کی اصلاح اس وقت تک یقینی طور پر نہیں ہوسکتی جب تک کہ حکومت دکن کی مکمل اصلاح ہو لے۔ اور ہماری رائے یہ ہے کہ مجلس نظماد اور مالکان کمپنی کو حکومت ہند سے کچھ سروکار نہیں ہونا چاہیئے اور آیندہ اس ملک میں حکومت ہند پر نگرانی رکھنے کے لیئے ایک وزیر اور اس کی کونسل سرکار کی طرف سے مامور ہونی چاہیئے جو شہنشاہی پارلیمنٹ کو براہ راست جواب دہ رہے "

لورپول کی ایک "انجمن ایسٹ انڈیا اینڈ چینا اسوسی ایشن" نے ہندوستان کی بندرگاہوں سے پیداوار و مال تجارت کے اندرون ملک لانے اور لیجانے کے لیئے ذرائع آمد و رفت میں" اصلاح کی ضرورت بتائی تھی۔ ہندوستان کے بے انتہا محصول اراضی اور طلائی معیار کے موقوف کردیئے پر سخت اعتراضات کیئے تھے۔ عدالت اور کوتوالی کا اچھا انتظام قائم کرنے کی استدعا کی تھی۔ محکمہ جنگی کی تعویق سے متعلق بہت کچھ کہا تھا اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ یہ صلاح دی تھی کہ ہندوستان پر مجلس نظم کی براہ راست نگرانی اور اقتدار کو ایک نہ ایک فنکل میں زیادہ وسیع کرنے کی سمت ضرورت تھی "

برنگھم کے باشندوں نے ایک عام جلسہ کیا تھا جس میں انھوں نے تحکمانہ مطالبات پیش کیئے تھے اور پارلیمنٹ سے درخواست کی تھی کہ " ہندوستان کی دوعملی مسدود کردی جائے اور خود انگلستان میں ہندوستان کیلیئے ایک نظم و نسق ایسا قائم کیا جائے جس کا تقرر حکومت برطانیہ ہی کے ہاتھ میں ہوا اور جو شہنشاہی پارلیمنٹ کو براہ راست جواب دہ ہو "

برطانوی شہنشاہی کے نظم و نسق کی حکمت عملی کا تعین حکما و مدبرین کے ہاتھوں میں نہیں تھا بلکہ برطانیۂ عظمی کے تاجروں صناعوں اور ساہو و ہندگان کے ہاتھوں میں تھا اور جبکہ برطانیۂ عظمی کے تاجروں اور صناعوں نے ہندوستان کے لیئے تاج برطانیہ کی حکومت ہی پسند کی تھی تو پھر آیندہ چل کر کبھی نہ کبھی اس طرح کی حکومت کا آغاز ہونا ایک لازمی امر تھا :

نیابت کا مطالبہ

اہل ہند کے مطالبۂ نیابت کی بھنک سات سمندروں پار پہلے پہل کانوں میں

پڑنے لگی تھی۔

انجمن اہل مدراس اور صوبۂ مدراس کے اصل باشندوں نے یہ صلاح دی تھی کہ "مدراس کی کونسل میں سرکاری اور غیر سرکاری ارکان کی تعداد مساوی اور ہر جماعت سے چھ یا سات اشخاص کا انتخاب ہونا چاہئے سرکاری ارکان کا تقرر ان کے عہدے کے لحاظ سے خود سرکار کر سکتی ہے مثلاً صدر وکیل سرکار ایک رکن ہو سکتا ہے مگر غیر سرکاری ارکان کی حد تک گورنر ان اٹھارہ یا بیس اشخاص میں سے جن کو مدراس کے محصول دہندگان نے منتخب کیا ہو یا اُن لوگوں میں سے جن کو چھوٹی اور بڑی جیوری کی خدمت بجالانے کا حق حاصل ہے ارکان کا انتخاب کر سکتا ہے یا جیسا معزز دار العوام کی دانست میں مناسب ہو۔ عند الضرورت سرکاری ارکان گورنر کی فیصلہ کن رائے کی بنا پر کسی اہم معاملے میں حکومت کے حسب منشاء تصفیہ کر سکتے ہیں۔ اس مجوزہ منصوبے کے سرانجام میں کوئی رکاوٹیں نہیں ہیں اور تمام معاملات میں معقول طور پر سب کو معلومات حاصل ہو سکتے ہیں"۔

انجمن بمبئی کے ارکان اور صوبۂ بمبئی کے اصل باشندوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ "اب وقت آچکا ہے کہ ہندوستانی اپنے ملک کے انتظامی معاملات میں بمقابل سابق کے زیادہ حصہ لینے لگیں اور جیسا لارڈ ڈالہنرو۔ لارڈ ڈالفنسٹن وغیرہ کی رائے تھی مقامی حکومت کی کونسلوں میں وضع قوانین کے معاملات اور حکمت عملی کی تشکیل میں جن سے ملک کو بھی عام دلچسپی ہے سمجھدار اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو حصہ لینے اور ان معاملات پر بحث کرنے کا موقع دینا چاہئے"۔

انجمن برطانوی ہند اور صوبۂ بنگالہ کے دوسرے اصلی باشندوں نے پارلیمنٹ کے بغور ملاحظہ کرنے کے لئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ کلکتہ میں ایک مجلس وضع قوانین قائم کی جائے جو سات ارکان پر مشتمل رہے ان میں سے تین ارکان تو تین صوبوں کے دیسی باشندوں کی طرف سے وہاں کے قابل اور معزز دیسی اشخاص میں سے منتخب ہونے چاہئیں ایک ایک رکن ہر صوبے کا گورنر اپنے دیوانی تجربہ کار عہدہ داروں میں سے سرکاری اغراض کی دیکھ بھال کیلئے مقرر کر سکتا ہے اور ایک رکن تاجِ برطانیہ کی طرف سے بھی مقرر کیا جا سکتا ہے"۔

جس وقت ہندوستانیوں کی انجمنیں نیابت کے لئے ڈرتے ڈرتے کمال احتیاط

کے ساتھ اس طرح دعوے کر رہی تھیں اسی وقت ۱۸۳۳ء کے قانون کی اُس مشہور دفعہ کے موافق جس پر دارالعوام میں زور شور کے نعرہ ہائے تحسین بلند کیے گئے تھے۔ مگر جس کو ہندوستان میں ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا تھا ان انجمنوں نے اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کی پُرزور تائید بھی کی تھی۔ انگریز گواہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی تھی کہ اہل ہند کے ساتھ سرکار نے صریح وعدہ خلافی کی ہے۔ گورنر جنرل کی کونسل کے رکن قانونی (۱۸۴۳ء تا ۱۸۴۸ء) مسمی ہے کیمرن نے بھی اس پر بہت زور ڈالا تھا۔

لارڈ مونٹ ایگل۔ جس حد تک کسی بات کا اظہار کر دینا ہوتا ہے اس حد تک اُس آخری قانون کی دفعہ ۸۷ کی رو سے عام طور پر دیسیوں کے استحقاق خدمت کے متعلق جو اظہار خیال کر دیا گیا ہے کیا اس سے بھی زیادہ حتمی طور پر اُس خیال کا اظہار کرنا ممکن ہے؟

ہے کیمرن۔ جی نہیں کیونکہ میرے خیال میں یہ نہایت ہی پُرزور اور صاف و صریح طریقے پر کر دیا گیا ہے.....

لارڈ مونٹ ایگل۔ اگر اس قانونی دفعہ کو اسی وسیع معنی میں لیں جو معنی اس کے آپ لیتے ہیں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عملی نتائج ایسے واقع ہوئے ہیں جن سے اس دفعہ کو مرتب کرنے والوں کی توقعات پوری ہوتی ہیں؟

ہے کیمرن۔ جی نہیں بلکہ بالکل اس کے برخلاف عمل ہوا ہے۔ میرے علم میں ایک بھی دیسی شخص ایسا نہیں ہے جس کی حیثیت اس قانونی دفعہ کی بنا پر اس سے بہتر ہو گئی ہو جو اس دفعہ کے نافذ نہونے کی صورت میں آج اس کی رہتی۔

سر چارلس ٹریویلین کی شہادت تو اس سے بھی زیادہ پُرزور تھی اس نے گزشتہ زمانے کے شہنشاہی اقوام مثلاً مقدونیہ اور روما کی قوموں کا حوالہ دیا اور بتایا کہ مفتوح اقوام اور فاتحین میں "ہر بات میں بالکل مساوات" قائم رکھنے سے کیسی وسیع شہنشاہیاں کتنی طویل مدت تک برقرار رہی تھیں اور اپنی یہ رائے بھی ظاہر کی تھی کہ "ہندوستان پر ہمارا شہنشاہی اقتدار مدت مدید تک قائم رکھنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم دیسیوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیکر ذمہ دارانہ خدمتوں پر ان کو مامور کریں اور اس کے لئے ان کو تعلیم دی جائے تاکہ وہ اپنے فرائض زیادہ قابلیت اور صلاحیت کے ساتھ بجا لاسکیں"

پہلا "قانونِ اصلاح" انگلستان میں نافذ ہونے کے صرف ایک سال بعد جب کہ حقیقی "جدت پسندی" بھی عروج ہی پر تھی کہ ۱۸۳۳ء کا قانون جاری کیا گیا۔ اس کے بعد سے انگلستان میں حقیقی "جدت پسندی" کا انحطاط ہونے لگا اور شہنشاہی پسند جماعت جب اقتدار پر پہنچی تو اہل ہند پر وہ پہلا سا التفات باقی نہ رہا تھا۔ فرانسس رابنسن نے بھی جو ہندوستان میں جج اور مجلس مالگزاری کا ایک رکن رہ چکا تھا اس افسوسناک واقعہ کی تصدیق کی تھی۔

چنانچہ اس نے کہا تھا کہ "حکمراں قوم محکوم قوم کو نہایت ہی نفرت کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ اس بات کو لارڈ ولیم بنٹنک سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا اور اسی نے سب سے پہلے اس جذبے کے روک تھام کی اور دیسیوں کے معاشرتی ترقی مدارج کی کوشش کی تھی"۔

فرانسیس رابنسن سے استفسار کیا گیا کہ "کیا آپ اس مجلس کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ جب سے خود لارڈ ولیم بنٹنک گورنر جنرل وقت نے اپنی تجاویز سے اس مضمون کی طرف عام توجہ منعطف کرائی تھی اس وقت سے دیسیوں پر جو التفات کیا جاتا تھا آیا اس میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے یا نہیں"؟

اس کا فرانسیس رابنسن نے یہ جواب دیا کہ "میرے خیال میں اس بارے میں اب خیالات بدل گئے ہیں۔ لارڈ ولیم بنٹنک کے زمانے سے یہ تغیر خیالات نمایاں ہے"۔

لارڈ ولیم بنٹنک کی اصلاحوں کو دو قرن گزر چکے۔ اس نے اعتماد اور ذمہ داری کی نئی نئی خدمتیں ہندوستانیوں کے لئے قائم کرنے کی کوشش کی تھی مثلاً صدر امناء حلقہ ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹروں کی خدمتیں اسی نے قائم کی تھیں۔

لیکن بنٹنک کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد اس میں کوئی ترقی نہیں ہوئی نظم و نسق دیوانی میں ہندوستانیوں کی تعداد ۱۸۲۸ء میں یعنے جس سال لارڈ ولیم بنٹنک ہندوستان آیا تھا کیا تھی اور اس کے ۲۵ سال بعد ۱۸۴۹ء میں کیا ہوئی اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

صدر اسامی حلقہ	سنہ ۱۸۲۸ء	سنہ ۱۸۴۹ء
—	—	۶۴
صدر امین	۱۵۷	۸۱
منصف	۸۶	۴۹۴
ڈپٹی مجسٹریٹ	...	۱۱
ڈپٹی اور مددگار کلکٹر	....	۸۶
مددگار سب کلکٹر	....	۲۷
مہتممان آبکاری	....	۱۵
تحصیلدار	۳۵۶	۲۷۶
سررشتہ دار	۳۶۷	۱۵۵
معاملہ دار	۹	۱۱۰
دفتردار	۲	۱۹
کماوسدار	۵۷	....
عدالتی	....	۵
میرمنشی	....	۱
تعلیمات	۱۴	۴۷۹
متفرق	۱۴۹	۹۹۰
میزان	۱۱۹۷	۲۸۱۳

سنہ ۱۸۴۹ء میں تین ہزار سے بھی کم ہندوستانی انگریزی سرکار کے حلقہ ملازمت میں داخل تھے اور ایک ہزار سے بھی کم ہندوستانی اعزاز۔ اعتماد اور ذمہ داری کی خدمتوں پر مامور تھے۔

عاملانہ نظم ونسق

سنہ ۱۸۳۲ء کے قانون کی رو سے جو اپریل سنہ ۱۸۳۴ء میں نافذ العمل ہوا چند اہم تغیرات

عمل میں آئے ۔ مثلاً بنگالے اور آگرے کے انتظام کے لئے علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کی گئیں بنگالہ اب بھی گورنر جنرل ہند لارڈ بنٹنک کے براہ راست زیر انتظام تھا مگر سر چارلس مٹکاف آگرے کا پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا ۔ گورنر جنرل کی کونسل میں رکن قانونی کی ایک فریدہ جگہ قائم کی گئی اور میکالے پہلا شخص تھا جو اس خدمت پر مامور ہوکر ہندوستان آیا ۔ اب تک تو ہر صوبہ مثلاً صوبۂ بنگالہ صوبۂ مدراس صوبۂ بمبئی اپنا اپنا دستور العمل نافذ کر لیتا تھا لیکن اب گورنر جنرل اس بات کا مجاز کیا گیا کہ اپنی کونسل کی مدد سے وہ قوانین نافذ کرے اور اور یہ قوانین تمام ہندوستان کے لئے واجب التعمیل تھے ۔

اس زمانے میں بنگالے کے لئے کوئی علیحدہ گورنر مقرر نہ تھا ۔ گورنر جنرل ہند ہی گورنر بنگالہ تھا اور معتمدی حکومت ہند و بنگالہ پر ہمہ ہی توپی پرنسپ کے تقرر کا اعلان سرکاری جریدے میں کر دیا گیا ۔

مدراس اور بمبئی بھی اصولاً گورنر جنرل ہند ہی کے براہ راست تحت کر دیئے گیے تھے نگران صوبوں کے نظم و نسق کو دراصل جو عملی خود مختاری حاصل تھی اس میں مداخلت کرنے کی طرف بدنصیبی سے کسی کا رجحان نہ تھا ۔ "گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کلکتے سے حکومت مدراس اور حکومت بمبئی کے اندرونی انتظامات میں شاذ ہی مداخلت کرتا ہے ۔ مثلاً مالیات میں مداخلت اسی وقت کرتا ہے جب رقم صرف کرنے کا سوال ہوتا ہے یا کبھی وضع قوانین سے متعلق معاملات میں بھی مداخلت کرتا ہے لیکن مالگزاری کوتوالی اور عدالت کے معاملات میں تو مداخلت قریب قریب نہیں کرتا ۔"

جب ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا الحاق عمل میں آیا تو اس کو پانچواں صوبہ قرار دیا گیا اور ایک مجلس کے زیر انتظام کر دیا گیا جو لارنس نامی دونوں بھائیوں اور منسل پر مشتمل تھی جیسا پچھلے باب میں بیان ہوا ہے ۔ اس کے تین سال بعد یہ مجلس برخاست کر دی گئی اور جان لارنس ۱۸۵۲ء میں پنجاب کا چیف کمشنر مقرر کیا گیا ۔

ہر صوبے کو اضلاع میں تقسیم کیا گیا تھا اور اضلاع کے عہدہ دار جن کو فوجداری اور مالگزاری کے اختیارات اور علاملانہ فرائض تفویض تھے انھیں مکمل ابتدائی طریقوں پر جن کو وارن ہیسٹنگز اور لارڈ کارنوالس نے گذشتہ صدی عیسوی میں مقرر کیا تھا ملک کا نظم و نسق چلاتے تھے ۔ اہم تر فوجداری مقدمات کی جج سماعت کرتے تھے اور یہی